

قومی زبان

بابائے اردو نمبر

۱۹۶۷ء

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

قومی زبان

بابائے اُردو نمبر

ستمبر ۱۹۶۷ء

جلد: ۳۱ شمارہ: ۳

انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان

بابائے اُردو روڈ۔ کراچی

قیمت فی پرچہ دو روپے

" مولوی عبد الحق کے انتقال سے ہم علم و ادب کے ایک عظیم پرستار سے محروم ہو گئے ہیں۔ مرحوم آخر وقت تک اپنے مقصد کے لیے ایک مضبوط اور غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے۔ ان کی ذات برصغیر پاک و بھارت کے گزشتہ ایک سو سال کے اسلامی کلچر کی مظہر تھی۔ اپنے مقصد سے انھیں جو گہرا لگاؤ تھا میں ہمیشہ اس سے فیض حاصل کرتا رہا ہوں۔"

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب صدر مملکت پاکستان

فہرست

اس شمارے کی ترتیب میں اُردو کالج کے شعبۂ تاریخ وسیاسیات کے استاد جناب شبیر حسین قریشی نے خصوصی تعاون فرمایا ہے جس کے لیے ادارہ اُن کا ممنون ہے

اشاعت تحریر

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ



جناب اختر حسین (ہلالِ پاکستان)
صدر انجمن ترقی اردو

چھٹی برسی

بابائے اردو کی چھٹی برسی کے اس موقعے پر میں ان مقررین کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مرحوم کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور اپنی نظموں سے ہمیں سرفراز کیا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا خاص طور پر ممنون ہوں جو راولپنڈی سے اس جلسے میں شرکت کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں ۔

مرحوم بابائے اردو نے زبان اور ادب کی علمی اور عملی طور پر جو خدمت انجام دی وہ اردو زبان کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے ۔ تقریباً پون صدی تک انھوں نے اس زبان کے لئے جس ذوق و شوق، لگن اور ریاضت سے کام کیا اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی - ان کی لسانی اور ادبی خدمات کے متعلق آج کے اس اجلاس میں اس قدر کہا جا چکا ہے کہ میرے لئے اس ضمن میں کچھ عرض کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا ۔ مناسب یہ ہوگا کہ میں اس پہلو پر کچھ عرض کروں کہ بابائے اردو کے بعد ان کے کاموں کو جاری رکھنے کے لئے انجمن نے کیا کچھ کیا ہے ۔

آپ سب حضرات پر یہ امر بخوبی روشن ہے کہ ہر شخص کے تمام منصوبے اس کی زندگی ہی میں نہیں پورے ہو جاتے، تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے متعدد عظیم الشان کام انجام دیئے پھر بھی وہ اپنے بہت سے منصوبے تشنۂ تکمیل چھوڑ گئے جنھیں بعد کے لوگوں نے پورا کیا ۔

بلاشبہ بابائے اردو نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ۔ لیکن افسوس کہ مرحوم اپنی بعض حسرتیں اپنے ساتھ لے گئے ۔ انھی کاموں میں سے ایک کام اردو کالج کو ایک عظیم الشان ادارہ بنانے کا منصوبہ تھا ۔ مرحوم نے یہ کالج ۱۹۴۹ء میں قائم کیا تھا تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اردو زبان سائنس اور فنون کے تمام مضامین کا ذریعۂ تعلیم بننے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ گزشتہ ۱۸ برس میں اس کالج نے جو کامیابی اور نیک نامی حاصل کی ہے وہ بابائے اردو مرحوم ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اس کالج کو صحیح معنوں میں ایک قومی تعلیمی ادارہ بنائیں تاکہ اس سے صرف کراچی کے نہیں بلکہ پورے پاکستان کے طلبہ اور طالبات مستفید ہو سکیں۔

چنانچہ جب انجمن کی صدارت کے فرائض مجھے سونپے گئے تو میں نے اس منصوبے کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔ اور اردو کالج کو ایک عظیم الشان اقامتی تدریسی ادارہ بنانے کی کوششیں شروع کیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے رفقائے کار کی اعانت سے اس کام کا ایک حصہ مکمل کر لیا ہے۔ اگرچہ اس پورے منصوبے پر اخراجات کا اندازہ تین کروڑ روپے ہے لیکن اس کے ابتدائی مرحلے پر جو ہماری موجودہ ضروریات کے لئے کافی ہوگا تقریباً پچاس لاکھ روپے کی ضرورت ہوگی۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے گزشتہ سال عطیات کے لئے جو اپیل کی تھی وہ رائگاں نہیں گئی لیکن ابھی بڑی مسافت طے کرنا ہے۔ گو کہ صدرِ مملکت، صوبائی گورنروں اور وزراء سے لے کر ایک عام شہری تک نے میری مدد کی ہے لیکن اب تک تقریباً پانچ لاکھ روپے مختلف ذرائع سے جمع ہو سکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات مجھے مایوس نہیں کریں گے اور بقیہ رقم بھی بہت جلد فراہم ہو جائے گی۔ اس موقعے پر میں آپ حضرات کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ نئے اقامتی کالج کی زیرِ تعمیر عمارت جو یونیورسٹی روڈ پر واقع ہے، ملاحظہ فرمائیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ یہ کام کس حد تک انجام پا چکا ہے اور اس کی تکمیل میں ابھی کتنے مرحلے باقی ہیں۔

حضرات! مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ بڑی تحریکیں عوامی سطح پر بڑی بنتی ہیں۔ اگر کوئی تحریک کسی خاص طبقے تک محدود کر دی جائے تو اس کے اثرات کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اردو کالج کی تعمیر میں عوام بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ ہم ان سے اتنا ہی عطیہ طلب کرتے ہیں جو وہ آسانی سے دے سکیں۔ اہلِ ثروت سے میری درخواست ہے کہ وہ اس اہم قومی کام میں جس قدر مدد کر سکتے ہیں کریں۔ اس طرح اردو دوستوں کی ایک بڑی تعداد کے تعاون سے اردو کالج صحیح معنوں میں ایک قومی ادارہ بن جائے گا۔

اردو کالج کی تعمیر کے اہم کام کے ساتھ ساتھ انجمن اپنے علمی و ادبی فرائض سے بھی غافل نہیں ہے۔ اردو کے قدیم ادبی سرمائے کے تحفظ کے لئے انجمن نے گزشتہ چند برسوں میں کئی اہم کتابیں شائع کی ہیں نیز بعض ادبی موضوعات پر جدید محققین کی تحقیق کے نتائج بھی کتابی شکل میں پیش کئے ہیں۔ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ انجمن کو ملک کے تمام اہلِ علم اور محققین کا تعاون حاصل ہے۔

اردو اور علاقائی زبانوں کا جو تعلق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور اس سلسلے میں انجمن کا موقف یہ ہے کہ اردو کو علاقائی زبانوں سے قریب تر لایا جائے، ہم نے اس سلسلے میں ایک منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت علاقائی ادب کے شاہکاروں کو اردو میں منتقل کیا جائے گا۔ گزشتہ سال پشتو شاعری کے ایک انتخاب کا منظوم ترجمہ شائع کیا جا چکا ہے۔ اس سال سلطان باہو کے کلام کا منظوم ترجمہ طبع کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ ہر سال انجمن کی طرف سے اس قسم کی کم از کم ایک کتاب شائع کی جائے گی۔

انجمن کی طرف سے اردو کی جملہ مطبوعات کی جو جامع فہرست تیار کی جا رہی ہے اس کی پہلی جلد جو مذہبیات سے

متعلق ہے شائع ہو چکی ہے۔ اب دوسری جلد جو تاریخی کتب کے بارے میں ہے، مکمل ہو گئی ہے، پریس بھیجی جا رہی ہے۔ تیسری جلد جو ادبیات سے متعلق ہو گی اس پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔

انجمن کے کاموں کی روداد طویل ہے، یہاں مختصر وقت میں تمام تفصیلات پیش کرنا ممکن نہیں۔ میں نے ان کاموں کا محض ایک نامکمل سا خاکہ پیش کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انجمن بابائے اردو کے کاموں کی تکمیل کے لئے پوری توجہ سے کوشاں ہے۔

آخر میں ایک بار پھر میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمود الرحمان

بابائے اُردو

سید کے عزائم کا حامل حالی کی شرافت کا پَرتو
وہ جادۂ فہم و فراست کا اک راہنما اور اک رہرو

تہذیب و تمدن کا شیدا وہ علم و ادب کا متوالا
طوفانِ حوادث میں تنہا گلزارِ زباں کا رکھوالا

کیا رنگِ تکلم تھا اس کا کیا طرزِ خطابت تھی اس کی
تقریر فصاحت تھی اس کی، تحریر بلاغت تھی اس کی

تحقیقِ دفینۂ اُردو میں تا عمر رہا وہ سرگرداں
تبلیغِ ادب کا شائق تھا ترویجِ زباں کا تھا خواہاں

وہ کوششِ پیہم کا خوگر وہ جہدِ مسلسل کا عادی
خواہانِ جہد و عمل کے لئے اک راہنما تھا اک ہادی

احسان دانش

بتِ شکن

وہ جس جگہ گیا وہیں جانِ وطن رہا — اُس کی کرن کرن سے درخشاں چمن رہا
اس کے جنوں کا جذبۂ ایثار دیکھئے — اپنے وطن کو چھوڑ کے جاکر دکن رہا
دنیا نے سبز باغ دکھائے بہت مگر — وہ اپنی راہ پر ہی سدا گامزن رہا
نکلے ہیں آستینوں سے بُت بھی کبھی کبھی — کہتے ہیں برہمن کہ بڑا بُت شکن رہا
پھونکی ہے اس نے جسم میں اُردو کے اپنی روح — اس کا زمانے بھر میں نرالا چلن رہا
مثلِ صبا رہی ہے تگ و دو میں زندگی — پھولوں کی طرح وہ نہ کہیں خیمہ زن رہا
میں[1] بھی چلا ہوں ایک زمانے میں ساتھ ساتھ — شہنائی کی طرح مرا حُسنِ سخن رہا
دل میں لگن ترقیٔ اردو کی تھی مدام — تا صبح وہ چراغ سرِ انجمن رہا
کم ہمتی کی حد میں قدم زن ہوئی نہ زیست — پیری میں بھی شباب کا اک بانکپن رہا
ہر وقت تھا ترقیٔ اُردو پہ غور و خوض — خلوت میں بھی وہ غیرتِ صد انجمن رہا
ماضی کی مشعلوں سے نکھارے نقوشِ حال — وہ پاسبانِ رسم و رواجِ کہن رہا
تقسیمِ باغ سے نہ دبی شورشِ جنوں — فصلِ خزاں میں بھی وہی دیوانہ پن رہا
ہر شعبۂ ادب میں ہوا اس کا احترام — یعنی امامِ قبلۂ اہلِ سخن رہا
تاریخِ گلستاں میں رہے گا وہ سربلند — جب تک رہا محافظِ سرو سمن رہا
اوراقِ برگِ گل پہ چلے گا اُسی کا نام — محفوظ اگر خزاں کی لپیٹ سے چمن رہا

دانش ہزار حُسن تھے اس ایک ذات میں
کانٹا بھی چھو گیا ہے تو گُل پیرہن رہا

ل[1] یہ اُس زمانے کی طرف اشارہ ہے جب مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ راقم الحروف، حکیم اسرار احمد اور خیر بھوروی وغیرہ الہ آباد اور اس کے مضافات میں تبلیغ اردو کے سلسلے میں جگہ جگہ جلسے اور مشاعرے کرتے پھرا کرتے تھے۔

یومِ بابائے اُردو ۱۹۶۷ء

انجمن ترقی اُردو پاکستان

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی چھٹی برسی کے موقع پر اس سال کئی تقریبیں منعقد ہوئیں۔ کراچی میں سب سے بڑا اور اہم جلسہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے اہتمام میں منعقد ہوا۔ یہ جلسہ صاحبانِ علم و ادب اور اہلِ ذوق حضرات و خواتین کا ایک عظیم الشان اور یادگار اجتماع تھا۔



جلسے کا ایک منظر

اگست ۱۹۶۷ء کی سولھویں تاریخ تھی۔ شام کے چار بجے تھے۔ انجمن ترقی اُردو کے کارکن اُردو کالج کے طلبہ اور دوسرے علمی و ادبی اداروں کے رضاکار جلسہ گاہ کے صدر دروازے پر مہمانوں کے استقبال کے لیے حاضر تھے۔

انجمن ترقی اُردو کے احاطے میں خوب صورت شامیانوں کے دامن میں آج ایسے ایسے موتی بھرے ہوئے تھے، جنھیں علوم و فنون کے سمندروں نے اہلِ نگاہ کے سامنے فخر سے پیش کیا ہے۔

جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، جناب ڈاکٹر شوکت سبزواری، جناب حکیم محمد سعید، جناب فضل احمد کریم فضلی، اور جناب سید ہاشم رضا مقررین کی حیثیت سے اوّلین صفوں میں رونق افروز تھے، اور ان کے ساتھ ساتھ مولانا ماہرالقادری، جمیل نقوی، فضل احمد صدیقی اور سید محمد جعفری صاحبان بھی محفل کی زینت تھے جنھیں اس مثالی تقریب میں نظمیں پیش کرنی تھیں۔

جلسے کے صدر اختر حسین صاحب کرسیٔ صدارت پر تشریف فرما ہو چکے تھے۔ اور مائک پر جناب قاری شاکر قاسمی اپنے مسحور کر دینے والے لحن میں کلامِ پاک کی تلاوت فرما رہے تھے۔ مؤدب مجمع پر کیف کا عالم طاری تھا۔

کلامِ پاک کی تلاوت کے بعد جناب اختر حسین نے پہلی تقریر کے لیے اُردو کے مشہور و معروف شاعر اور ممتاز فلم ساز فضل احمد کریم فضلی صاحب

کے نام کا اعلان کیا۔ فضلی صاحب مسکراتے ہوئے ڈائس پر تشریف لائے اور فرمایا "میں کسی تقریر وغیرہ کی تیاری کیے بغیر صرف شرکت کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔ یہاں آیا تو حکم ملا تقریر کرد۔ بہرحال حکم کی تعمیل کے طور پر ...."



فضل احمد کریم فضلی تقریر کر رہے ہیں اور جناب اختر حسین کرسئ صدارت پر رونق افروز ہیں

فضلی صاحب نے "کسی تیاری کے بغیر" نہایت شگفتہ اور معلوماتی تقریر فرمائی اور بابائے اُردو کا ایک دلچسپ واقعہ بھی سنایا کہ "جب مولوی صاحب میرے ہاں قیام فرمانے کے لیے پہلی بار آنے والے تھے تو میں نے دُوسرے انتظامات کے علاوہ اُن کے ٹھہرنے کے کمرے میں ایک جانماز اور چوکی کا بندوبست بھی کروایا۔ مولوی صاحب تشریف لائے، انھیں کمرہ دکھایا گیا۔ جب جانماز اور چوکی پر اُن کی نظر پڑی تو پوچھا "یہ کس کے لیے ہے"؟ عرض کیا "یہ بھی آپ کے لیے ہے"۔۔۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "میاں، میں نہ خدا کو دھوکا دیتا ہوں نہ خدا کے بندوں کو"۔"

فضل احمد کریم فضلی کے بعد جناب سید ہاشم رضا نے تقریر فرمائی۔ ہاشم رضا صاحب پاک و ہند کے نامی گرامی ادب دوست اور اُردو نواز حضرات میں سے ہیں۔ آپ پاکستان میں انجمن ترقی اُردو کی تشکیل نو اور اُردو کالج کے قیام کے وقت کراچی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ بابائے اُردو روڈ پر واقع انجمن ترقی اُردو اور اُردو کالج کی عمارت آپ ہی نے انجمن کے نام الاٹ کی تھی۔

ہاشم رضا صاحب نے غلام ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "پاک و ہند کو آزادی دلوانے کے سلسلے میں اُردو زبان نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ پاکستان کا تصور بھی سب سے پہلے اُردو ہی کے ایک مشہور ترین ادیب اور شاعر مولانا عبدالحلیم شرر

نے پیش کیا تھا۔

سید ہاشم رضا صاحب نے تقریر کے علاوہ بابائے اردو کی شان میں ایک نہایت مرصع نظم بھی مرحمت فرمائی جو اس شمارے میں شائع کی جارہی ہے۔



جناب سید ہاشم رضا



مولانا ماہر القادری

ان کے بعد حضرت ماہر القادری کو زحمت دی گئی۔ آپ نے اردو کے متعلق ایک خوب صورت نظم سنائی۔

اب شیخ الجامعہ اسلام آباد ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی باری آئی۔ آپ خاص طور پر اس جلسے میں شرکت کرنے کے لیے راولپنڈی سے تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بابائے اُردو کی علمی و اَدبی فضیلت اور تحقیق و تنقیدی بصیرت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "بابائے اُردو نے ایک لمبی مدت تک اُردو زبان و اَدب کی جو خدمت انجام دی ہے اسے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے وضع اصطلاحات کے سلسلے میں مولوی صاحب کی کوششوں کا ذکر بطور خاص کیا اور مثالیں دے کر بتایا کہ مولوی صاحب اس میدان میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں مولوی صاحب نے جو کام کیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اُس کا ذکر بھی تفصیل سے کیا۔



ڈاکٹر رضی الدین صدیقی



جناب جمیل نقوی نظم سُنا رہے ہیں

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے بعد جناب جمیل نقوی تشریف لائے آپ نے بابائے اُردو پر ایک پیاری نظم پڑھی جو شاملِ اشاعت ہے۔

جناب جمیل نقوی ایک خوش گو خوش فکر اور خوش وضع شاعر ہیں۔ آپ ہر سال پابندی سے بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے بارے میں ایک نظم لکھتے ہیں، اور ان کی ہر نظم گزشتہ سال کی نظم سے بازی لے جاتی ہے۔

نظم کے بعد ڈاکٹر شوکت سبزواری نگاہوں کا مرکز بنے ۔ آپ نے نہایت پُرمغز اور دلچسپ تقریر فرمائی ، جس میں بابائے اُردو کی زندگی کے بعض واقعات پیش کیے ۔ ڈاکٹر صاحب نے مولوی صاحب کی شخصیت کے بنیادی عناصر کا تجزیہ کر کے یہ بتایا کہ اُن کی شخصیت ہر اعتبار سے عظیم اور مثالی تھی ۔



ڈاکٹر شوکت سبزواری تقریر کر رہے ہیں



جناب فضل احمد صدیقی نظم سنا رہے ہیں

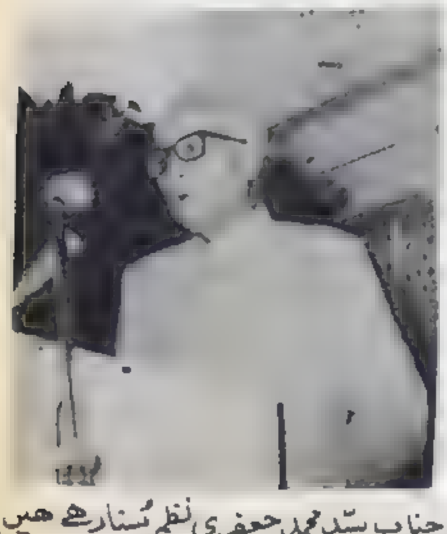
ڈاکٹر شوکت سبزواری کے بعد جناب فضل احمد صدیقی نے ایک نظم سُنائی جو اس شمارے میں شائع کی گئی ہے۔

اب ملک کے ممتاز علم پرور اور مشہور ماہرِ طب جناب حکیم محمد سعید دہلوی مائک پر تشریف لائے ۔ آپ نے بہت دھیمے اور دلکش پیرائے میں ایک مختصر تقریر سامعین کے گوش گزار کی ۔ ان کی تقریر اس شمارے میں شاملِ اشاعت ہے ۔



جناب حکیم محمد سعید

حکیم محمد سعید دہلوی کے بعد جناب سیّد محمد جعفری نے اپنے مخصوص طنزیہ و مزاحیہ انداز میں اُردو کے لیے رومن رسم الخط کی تجویز پر ایک شگفتہ نظم عنایت کی ۔



(جناب سیّد محمد جعفری نظم سُنا رہے ہیں)

آخر میں جلسے کے صدر جناب اختر حسین نے صدارتی خطبہ پڑھا جس میں زیرِ تعمیر اقامتی اُردو کالج کے منصوبے اور انجمن کے دوسرے علمی و ادبی کاموں کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا تھا ۔ یہ خطبہ اسی شمارے



جناب اختر حسین

میں شائع کیا گیا ہے۔

جلسے کے علاوہ یومِ بابائے اُردو کے موقع پر انجمن ترقی اُردو کے دفتر میں قرآن خوانی بھی ہوئی جس میں بے شمار خواتین و حضرات



(قرآن خوانی کا ایک منظر)

نے شرکت فرمائی

بلدیہ کراچی

بلدیہ کراچی کے وائس چیئرمین جناب ضیاء اللہ نے حسبِ معمول شہریوں کی طرف سے بابائے اُردو کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی:



جناب فضل احمد صدیقی اور جناب ضیاء اللہ وائس چیئرمین بلدیہ کراچی۔



بابا کے مزار پر

انجمن ترقیٔ اُردو خواتین

انجمن ترقیٔ اردو خواتین کی طرف سے بابائے اُردو کی یاد میں ایک عام جلسہ ہوا جس کی صدارت بیگم محمد شریف صاحبہ نے کی۔ جلسے میں بیگم صاحبہ موصوف کے علاوہ بیگم سروری عرفان اللہ اور بیگم برلاس صاحبہ نے تقریریں فرمائیں اور بابائے اُردو کے لسانی، ادبی اور علمی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مقرر خواتین نے فرمایا کہ بابائے اُردو اس صدی کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اور اُن کی تمام تر صلاحیتیں اُردو کی تعمیر و ترویج جیسے عظیم کام کے لیے وقف تھیں۔ اس جلسے میں خواتین سے اپیل کی گئی کہ وہ بابائے اُردو کے مشن کی تکمیل کے لیے آگے بڑھیں اور زیرِ تعمیر اقامتی اُردو کالج کے لیے عطیات فراہم کرنے میں انجمن سے تعاون کریں۔

تنظیم طلبہ

تنظیم طلبہ اُردو کالج کی جانب سے جناب امتیاز حسین مفتی کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مختلف اسکولوں کالجوں اور جامعات کے طلبہ و طالبات نے بابائے اُردو کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔ طلبہ نے عہد کیا کہ بابائے اُردو کو طلبہ سے جو توقعات وابستہ تھیں، طلبہ انھیں زندگی کے ہر موڑ پر پیشِ نظر رکھیں گے۔ اور زیرِ تعمیر اقامتی اُردو کالج کے لیے عطیے فراہم کرنے کے سلسلے میں جو مہم چلائی جارہی ہے اُس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ جلسے میں عوام، خصوصاً صنعت کاروں سے اس نیک کام کے لیے دل کھول کر عطیات دینے کی اپیل کی گئی۔

ریڈیو پاکستان

ریڈیو پاکستان کراچی نے ۱۶ اگست ۱۹۶۷ء کو یوم بابائے اُردو کے سلسلے میں ایک پروگرام نشر کیا جس میں شمیم احمد کا لکھا ہوا ایک فیچر پیش کیا گیا اور انجمن ترقیٔ اُردو کے صدر جناب اختر حسین اور بابائے اُردو

کے قدیم خادم جناب سید بدرِ عالم نے تقریریں فرمائیں۔ سید بدرِ عالم صاحب نے اپنی اس مختصر تقریر میں کہا :-



جناب سید بدرِ عالم

"مولوی صاحب کی زندگی بظاہر تنہائی کی زندگی نظر آتی ہے، مگر اس کے معنی ہرگز یہ نہیں تھے کہ وہ مردم بیزار تھے۔ ان کی محفل ہمہ رنگ آدمیوں سے ہمیشہ جگمگاتی رہی۔ مولوی صاحب کی ایک عادت میرے لیے ہزار نیکیوں سے افضل تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ غریب اور مستحق لوگوں اور بیوہ عورتوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور ان کی ہر ممکن امداد کرتے تھے۔ کسی کو بھی دکھ میں دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور اس میں مذہب و ملت کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ نادار طلبہ کا بے حد خیال رکھتے اور ان کی تعلیم میں ہر قسم کی مدد کرتے تھے۔ وظائف دیتے تھے اور کتابیں مہیا کرتے تھے۔ یہی انسانی پہلو مجھے ان کی اس عادت میں بھی نظر آیا کہ وہ دوسروں کے آرام کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مولوی صاحب بہت سویرے اٹھ جانے کے عادی تھے۔ صبح پانچ بجے جب سب سو رہے ہوتے تو مولوی صاحب چپکے چپکے اٹھتے اور بہت احتیاط سے جوتے پہنتے اور آہٹ کیے بغیر ٹہلنے نکل جاتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اس عادت سے ہماری نیند میں خلل پڑے۔ سیر کر کے ٹھیک سات بجے گھر واپس آجاتے تھے۔ مولوی صاحب ساری عمر وقت کے بڑے پابند رہے۔ وہ بڑے وضع دار بھی تھے۔ انھوں نے کبھی شیروانی اور جوتے اپنے ملازموں سے نہیں اتروائے۔ خود ہی اتارتے تھے اور خود ہی پہنتے تھے۔ غسل کرتے اور اس کے پندرہ منٹ بعد اخبار کا مطالعہ شروع کر دیتے۔ ٹھیک آٹھ بجے ناشتے کی میز پر بیٹھ جاتے۔ ناشتے میں عموماً کھچڑی پسند کرتے اور اس کے ساتھ سبزی ان کا من بھاتا کھاجا ہوتی۔ گوشت انھیں زیادہ پسند نہ تھا۔ کم خور تھے اور کھانے سے زیادہ کھلانے کے شوقین تھے۔ مولوی صاحب کو باغ لگوانے کا بے حد شوق تھا اور اس کی خود نگہداشت کرتے تھے۔ آموں اور امرودوں کے خود بھی بہت شوقین تھے اور دوستوں کو تحفے میں روانہ کر کے اور بھی خوش ہوتے تھے۔ انجمن ترقی اُردو کی حالت ہمیشہ بنتی بگڑتی چلی آئی تھی۔ مثلاً جب دہلی آئے تو اس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ ریاست سے دہلی آنے پر انجمن کی گرانٹ بند ہو چکی تھی مگر مولوی صاحب نے اس کے لیے دوبارہ درخواست نہیں کی اور کافی عرصے تک انجمن کے عملے کی تنخواہ اپنی جیب سے ادا کرتے رہے۔ اسی طرح مختلف اوقات میں جب بھی ضرورت پڑتی مولوی صاحب انجمن ترقی اُردو اور اس کی ترقی پر اپنے پاس سے روپے صرف کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے مزاج میں شوخی بھی تھی۔ ایک صاحب جو انجمن میں نوکر تھے وہیں ایک کمرے میں رہا کرتے تھے لیکن رات کو گرمی کی وجہ سے کمرے سے باہر سویا کرتے تھے، مولوی صاحب جب صبح ٹہلنے جاتے تو ان کے جوتے چپکے سے ان کے سرہانے چھپا دیتے تھے اور وہ صاحب بہت حیران ہوتے تھے کہ آخر یہ کون کرتا ہے مگر مولوی صاحب کی یہ حرکت برابر جاری رہی۔ وہ ان صاحب کی حیرانی پر بہت ہنستے تھے لیکن جب یہ سلسلہ بند ہی نہ ہوا تو ان صاحب نے پریشان ہو کر باہر سونا چھوڑ دیا۔"

اخبارات | ان تقریبات کے علاوہ یوم بابائے اُردو کے موقع پر ملک کے ممتاز اخبارات نے خصوصی نمبر شائع کیے جن میں بابائے اُردو کی زندگی کے حالات اور ان کی علمی و ادبی کاوشوں کے بارے میں مشاہیر اہلِ قلم کے لکھے ہوئے مضامین شامل تھے۔

فضل احمد صدیقی حرماں

نذرِ عقیدت

وہ جس سے قلب نے سیکھا سلیقۂ فریاد
ہزار گُر تھے جسے گفتگو کے ازبر یاد
وہ جس نے فکر و بیاں کو لطافتیں بخشیں
وہ جس نے نوکِ قلم کو نزاکتیں بخشیں
سجھائے جس نے معانی ہمیں ثقافت کے
نشاں خِرد کو بتائے زباں کی عظمت کے
وہ جس سے حالیؔ و سیدؔ کا تھا چلن باقی
تھا جس سے یوسفِ ماضی کا پیرہن باقی
وہ جس سے کُہنہ مرقعوں نے رنگ نو پایا
وہ جس سے حسنِ قیادت میں اور ابھار آیا
سوادِ قوم کو نعروں کے بول جس نے سکھائے
چلا جو قائدِ اعظم کے ساتھ شانہ ملائے
جتا کے لطف و صلہ سب پہ ہم زبانی کا
وہ درس دے کے اٹھا وحدتِ لسانی کا
وہ پیر مردِ جواں کوش آج ہم میں نہیں
دفورِ غم میں بھی لغزش یہاں قدم میں نہیں

ڈاکٹر یاحیدر شہریار

تہران میں یوم بابائے اُردو

بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم کی عظیم شخصیت کچھ ایسی ہمہ گیر اور محبوب شخصیت ہے کہ جس دل میں بھی اس نے جگہ پیدا کی وہ ہمیشہ کے لیے ان کا حلقہ بگوش ہوکر رہ گیا۔ ان کی میٹھی میٹھی اور ساحرانہ پُرخلوص باتیں جب یاد آجاتی ہیں تو دل بے چینی کے ساتھ ان کی جستجو کرتا ہے اور آنکھیں نہایت بے تابانہ انداز میں ان کی جذّاب شکل و صُورت کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔

وقت کے تیرہ و تار پردوں کو تصوّر کے ہاتھوں سمیٹ لینے پر مرحوم کی رعب دار جیتی جاگتی نورانی تصویر نگاہوں کے سامنے مجسّم ہوکر اپنی مخصوص اداؤں کے ساتھ وہ تمام داستانیں سنانے لگتی ہے جن میں بیتے دنوں کی مسحور کن مٹھاس بھی ہے اور ایّام گذشتہ کی ناگوار تلخیاں بھی جن کے سُر ملہار کے حیات بخش نغموں سے بھی مالا مال ہیں اور دیپک کے شعلہ بار ترانوں سے بھی لبریز۔ ان کی لال ٹوپی اور سفید داڑھی کے درمیان جن کی آڑ میں دہلی کے پادشاہی قلعے اور آگرے کے تاج محل کے جلال و کمال در عروج و زوال کے نشاط اور



سیّد مرتضیٰ موسوی یوم بابائے اُردو میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔

ملال کا سنگم ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا ایک ایسی روایت پروان چڑھی جو دوستوں کے لیے حریر و پرنیاں بنی اور دشمنوں کے لیے خنجر و سناں ثابت ہوئی جس نے مخالفین کے ساتھ فاتحانہ تیوریوں کے ہمراہ نبرد آزمائی کی اور جو متحدین کی راہ میں پھولوں کی طرح بچھی۔

انھی بابائے اُردو کی یاد میں جن سے راقم الحروف کو بچپن ہی سے گہرا لگاؤ تھا، دل کچھ اس طرح مچلا کہ ایران میں بیٹھ کر انھیں یہاں بلانے اور ایرانیوں سے متعارف کرانے کی ٹھان لی چنانچہ بروز سنیچر بتاریخ ۸ جولائی شام کے سات بجے مرحوم ایک تابلو (بڑی تصویر) کی صورت میں انجمن روابط فرہنگی ایران و پاکستان کے ایک بڑے جلسے میں جو انھی کی یادگار منانے کے لیے منعقد کیا گیا تھا کچھ اس طمطراق کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے کہ تمام حاضرین جلسہ ان سے آشنا ہونے کے بعد اُن کی شخصیت کی عظمت اور ان کی علمی و اَدبی خدمات کی اہمیت سے معترف ہو گئے۔

بابائے اُردو کی یادگار میں منعقد ہونے والے اس جلسے میں تہران میں مقیم ادب دوست پاکستانیوں کے علاوہ ایرانی بلند پایہ ادیب شریک ہوئے، ان ادیبوں میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے اور ان سب نے بابائے اُردو کی خاص طور پر فارسی سے متعلق خدمات اور ان کے علمی اور ادبی آثار اور ساتھ ہی ان کی زندہ جاوید یادگار انجمن ترقی اُردو کو خراج تحسین ادا کیا۔

تہران میں مقیم دو پاکستانی آرٹسٹوں یعنی سرور سیال اور انور صاحبان نے اپنے "سنگیت" سے جلسے کا آغاز کیا۔ انھوں نے حافظ کی وہ مشہور غزل گا کر سنائی جس کا ایک حسب ذیل شعر اُردو کی ضرب الامثال میں شامل ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حافظ کی اس غزل کے بعد انجمن روابط فرہنگی ایران و پاکستان کے دبیر کل۔ (سکریٹری جنرل) نے جو پاکستان دوستی اور اردو نوازی کے ایک دیدہ زیب اور دلنواز قسم کے شاہکار کہلائے جا سکتے ہیں اور جو شعر و سخن کی ماہیت میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ بابائے اُردو کی منقبت میں نثری زبان میں بڑا مزین قصیدہ پڑھا۔ انجمن کے دبیر کل جناب ڈاکٹر ابوتراب رازانی نے فرمایا کہ اُردو کے خدمت گزاروں کو بھی فارسی کا خدمت گزار ماننا پڑے گا چنانچہ بابائے اُردو کو بابائے فارسی کہنا عین حقیقت بیانی ہے۔ ڈاکٹر رازانی صاحب کی سحر بیانی کے بعد راقم الحروف کو اعزاز سخن رانی حاصل ہوا اور اس کے بعد پاکستان کے دو ادیبوں جناب ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی اور جناب ڈاکٹر سید مرتضیٰ موسوی صاحبان نے انجمن ترقی اردو اور شخصیتِ مولوی عبدالحق کے موضوعات پر سیر حاصل تقریریں کیں جن کا ماحصل درج ذیل ہے:-

جلسہ دو گھنٹے تک جاری رہا اور اس کے آخر میں حسنِ اختتام کے طور پر ایران کے مشہور موسیقار جناب ابراہیمی صاحب نے اپنے ساز ندول کے ہمراہ حافظ کی ایک غزل گا کر سنائی۔

سیّد مرتضیٰ موسوی جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے سیّد مرتضیٰ موسوی صاحب نے سرزمین پاکستان میں گذشتہ آٹھ سو سال میں رواج پانے والی ملکی اور غیر ملکی زبانوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

" ۶۵۰ سال تک سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی پھر انگریزوں نے انگریزی کو فارسی کی جگہ دے دی چنانچہ ہندوؤں نے بڑھ چڑھ کر انگریزی سیکھنی اور سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونا شروع کیا۔ عبدالحق مرحوم نے پہلے سرسید احمد خاں کی انگریزی زبان کی ترویج کو

دیکھا پھر بیسویں صدی کے شروع کا حصہ علامہ اقبال کی فارسی شاعری کے سبب فراموش شدہ فارسی کی حیات ثانیہ کا دور سمجھنا چاہیے۔ مولوی عبدالحق کو فارسی زبان وادب سے بے انتہا لگاؤ تھا، چنانچہ ان کی خدمات علمی وادبی کا ایک بڑا حصہ اس زبان وادب کی ترویج واشاعت پر مشتمل ہے لیکن مولوی عبدالحق بہت اچھی طرح سے یہ محسوس کرتے تھے کہ باوجود ساڑھے چھ سو سال سابقہ کے فارسی زبان سرزمین پاکستان و ہند میں اتنی ہی غیر ملکی سمجھی جاتی ہے جتنی ڈیڑھ سو سال سابقہ کے بعد انگریزی منتہا فارسی مسلمانوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ابھی دو قومی نظریہ پوری طرح ابھر نہ سکا تھا اور تصور یہی تھا کہ ایک غیر معینہ مدت کے لیے ہندو اور مسلمان برصغیر میں یکجا رہیں گے۔

مولوی صاحب نے بہت اچھی طرح یہ معلوم کر لیا تھا کہ تنہا زبان جو ہندوستان بھر میں پڑھی، بولی اور لکھی جاتی ہے وہ اُردو ہے اور باوجود ہندوؤں کے اس اظہارِ خیال کے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے مولوی صاحب نے ہندو فضلا وادبا کے ایک بڑے طبقے کو قبولوا دیا تھا کہ اُردو برصغیر ہی کی پیداوار ہے اور اتنی ہی ملکی ہے جتنی ملک کی بسنے والی آریائی آبادی۔

مولوی عبدالحق نے اپنی زندگی میں اُردو زبان کے لیے انتھک کوشش کی تقسیم برصغیر سے پہلے تو ایک لمبے چوڑے محاذ پر کشمیر سے راس کماری اور خیبر سے چٹاگانگ تک اُردو کی تحریک آگے بڑھاتے رہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا اور مولوی صاحب کراچی تشریف لے آئے تو انھوں نے مملکت خداداد میں اس زبان کو اس کی اصلی حیثیت، یعنی سرکاری زبان بنوانے کی مہم شروع کر دی اور اگرچہ عملاً آج تک پاکستان کی سرکاری زبان انگریزی ہی ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ اگلے چند سال میں ہم انگریزی ختم کر کے اُردو کو جاگزیں کر سکیں گے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ یہ بتاؤں کہ اگرچہ مولوی صاحب ہم میں نہیں ہیں لیکن جب بھی اُردو پاکستان کی سرکاری زبان بنے گی مولوی صاحب کی کوششوں کا اس میں بڑا دخل ہوگا۔"

پروفیسر سید سبطِ حسن

پروفیسر سید سبطِ حسن رضوی گورنمنٹ کالج راولپنڈی نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا کہ



مشرکائے جلسہ

" بابائے اُردو مولانا عبدالحق کی زندگی خود ایک مجسم اور متحرک تحریک ہے جس کی ابتدا علی گڑھ سے انجمن ترقی اُردو کی صورت میں ہوتی ہے اور یہ تحریک اورنگ آباد اور حیدر آباد کے مرکزوں سے تمام برصغیر کے بڑے چھوٹے شہروں میں پھیل گئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو وسیلۂ تدریس بنانا، بے شمار کتابوں کا دوسری زبانوں سے اُردو میں ترجمہ کرنا اور اُردو کو زندگی کے ہر شعبے میں اپنانا اس تحریک کی چند کارگزاریاں ہیں۔ دراصل مولانا عبدالحق کی اس تحریک کے ڈانڈے سید احمد خاں مرحوم کی تحریک سے مل جاتے ہیں اور اس تحریک کے پس منظر میں ایسی محبوب اور معروف شخصیتیں ابھرتی ہیں جن کی علمی، ادبی اور فکری خدمات سے برصغیر میں مسلم ثقافت، مسلم ادب اور مسلم تمدن زینت پاتا ہے جیسے شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، اکبر الہ آبادی۔ انیس اور اقبال۔ اگر مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو یہ ساری ہستیاں دراصل ایک ہی تحریک کی مختلف کڑیاں نظر آتی ہیں۔ مگر یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اس تحریک کو جو تنظیم اور شکل وصورت مولانا نے عنایت کی وہ آپ اپنی مثال ہے یعنی باقاعدہ ایک منظم تحریک کی صورت میں اُردو کو اس کا مناسب مقام دلوانے کی پیہم کوشش اور اس میں مولانا کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی اور اس کی بڑی وجہ ان کی ثبات قدمی، مستقل مزاجی اور وہ یقین کامل ہے جو ان کو اپنے مقصد کی عظمت، اہمیت اور افادیت پر تھا۔ جب اس شدت سے مقصد کی لگن دل میں پیدا ہو جائے تو پھر راستے کی دشوار منزلیں بھی آسان ہوتی چلی جاتی ہیں۔

مولانا کے اس کام میں بہت سے مخالفین بھی پیدا ہو گئے۔ ایک طرف ان کو انگریزوں کی انگریزی سے لڑنا پڑتا تھا تو دوسری طرف ہندوؤں کی ہندی سے نبرد آزمائی کرنی پڑتی تھی۔ علاوہ ان سب کے خود اُردو کے میدان میں کچھ رقیب کچھ حسد کرنے والے کچھ طنز کرنے والے کچھ نقد و تبصرہ کرنے والے ان کے پیچھے پڑ گئے۔ اس طرح ایک فرد کو کئی کئی محاذوں پر لڑنا پڑتا تھا اور تحریک چونکہ عالمگیر تھی یعنی برصغیر کے گوشے گوشے میں اس کو پہنچانا مقصود تھا اس لیے اس کے مخالفین بھی شمال سے جنوب تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے نامساعد حالات میں اور تقسیم پاکستان و ہند سے قبل کے تاریک ہیجانی سیاسی دور میں اُردو کی تحریک کو پروان چڑھانا مولانا عبدالحق ہی کا کام تھا۔

خیال تھا کہ تشکیل پاکستان کے ساتھ یہ تحریک اپنے انتہائی مقصد پر پہنچ جائے گی اور منزل پر پہنچنے کے بعد راستے کی دشواریاں ختم ہو جائیں گی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مختلف وجوہ کی بنا پر پاکستان بننے کے بعد بھی ایسا محسوس ہوا کہ یہ تحریک ابھی راستے ہی میں ہے، منزل دُور ہے۔ منزل پر پہنچ کر جب کسی تھکے ہوئے مسافر کو یہ معلوم ہو کہ ابھی منزل حقیقی دُور ہے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے اور دل ٹوٹ جاتا ہے لیکن ایسے موقع پر بھی مولانا نے ہمت نہ ہاری، حوصلہ بلند رکھا اور اُردو سے بے پناہ عشق ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں جو طاقت پیدا ہو گئی تھی وہ پیرانہ سالی میں جوانوں کا سا کام کرتی رہی۔ ہم کو خوب یاد ہے مولانا کی بے چینی جب ایک اُردو کے مدرسوں میں لکھے ہوئے نمبروں کی کارکا چالان کر دیا گیا۔ انجمن کے دفتر میں جب ہنگامہ ہوا تب بھی مولانا کا اضطراب قابل دید تھا۔

مولانا کی زندگی کے آخری لمحات میں کچھ امید کی کرنیں نظر آئیں۔ کچھ حکومت نے حوصلہ افزائی کی، ارباب اقتدار نے مولانا کی کوششوں کو سراہا اور اُردو کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کیا۔ انجمن کی دوبارہ تنظیم ہوئی۔ مفید مبسوط کتابیں لکھنے کا اہتمام ہوا اور مولانا کا دیرینہ خواب اُردو یونیورسٹی کی شکل میں عمل ہوتا ہوا نظر آیا، ہر چند کہ مولانا نے ایک طویل عمر پائی مگر اُردو کے لیے ان کی موت نا وقت تھی بلکہ قبل از وقت تھی اگر

چند سال کی زندگی ان کو اور مل جاتی تو یقیناً وہ اس تحریک کو آخری منزل پر پہنچا کر ہی دم لیتے۔ بہرحال ان کے بعد بھی اس تحریک کے جاں نثاروں نے اپنے کام کو سرگرمی اور جذبے سے جاری کر رکھا ہے اور قوی امید ہے کہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

مولانا دھن کے پورے اور کام کے پکے تھے اور ان کی زندگی سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ ایک بلند مقصد کی پیروی، ایک اچھے نصب العین کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینا، مسلسل جدوجہد اور انتھک کوشش سے ناممکن کو ممکن بنا دینا آج کی دنیا میں بھی ممکن ہے۔

ڈاکٹر شہریار نقوی | جناب آقائی مطیع الدولہ بجا تور محمد حجازی —— حضار گرامی و ارجمند

لازم میدانم از مقام عالی ریاست محترم انجمن فرہنگی ایران و پاکستان و دبیر کل فاضل و فعال آن جناب آقائی دکتر ابوتراب رازانی که در راه توسعه روابط دوستی در بین دو کشور ہمجوار از ہیچگونہ مجاہدت دریغ نمی ورزند و پیوستہ با بکار بردن تمام وسائل ممکن در تشیید علائق، محبت و مودت در ملت برادر میکوشند برائی برگزاری چنین جلسہ پرشکوہی بیاد بود علامہ فقید شادروان مولوی عبدالحق ملقب بہ "بابائی اردو" صمیمانہ تشکر کنم۔

تا دربند غروب و طلوعِ خورشیدایم و بدست گردش ایام و نیرنگ چرخ نیلی فام پردہ ہای سیاہ و سفید بامداد و شام در مقابل چشمان حیرت زدۂ ما کشیدہ میشود ولی آفتاب اسیرِ زوال و افول و گرفتار طلوع و غروب نمی باشد و قرص تابانش از آغاز آفرینش پا برجاست و روی تابناکش از حجاب تاریکی شب ناآشناست۔

رادمردان و اشخاص بزرگ ہم مانند خورشید از طلوع و غروبِ حیات و ممات آزاد اند و از زندگی جاویدان برخوردار میباشند۔ قطعِ نفس بسر ودِ وجودِ حقیقی شان پایان نمی بخشد و از ہم پاشیدن کالبدِ خاکی کاخ ہستی معنوی آنان را فرو نمی ریزد۔ ہمیں مطلب را شاعرِ نامدارِ جہان بلبل شیراز بدینگونہ میفرماید۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تا بلندترین کوہ گیتی "ہمالہ" دستار فضیلت بر سر دارد و تا در رود خانہ عظیم سند آب در جریان است نام نامی خدمت گزار صدیق اُردو و فارسی مولوی عبدالحق کہ بحق بابای اُردو نیز نامیدہ میشود از لوحۂ تاریخ شبہ قارہ ہند و پاکستان پاک و نقش برجستہ خدمات وی از صفحۂ خاطرات ملتش محو نخواہد شد۔

مولوی عبدالحق شہسوار میدان قلم و بیان و تاجدار ادب و زبان کہ شش سال قبل پس از ۹۱ سال زیستن در کراچی نقاب خاک برخ کشید فارغ التحصیل جامعہ اسلامی علی گڑہ بود و پس از اتمام تحصیل وظائف ناخدائی کشتی اُردو را بعہدہ گرفت و در تمام عمر زیر پرچم انجمن ترقی اردو خدمات شایانی بزبان و ادبیات اردو و فارسی انجام داد۔ وی در زمان بحران سیاسی و لسانی در ہندوستان در صدد دفاع از فرہنگ اسلامی برآمد و چندین بار علیہ مخالفان آن بہ مبارزہ پرداخت و بہمین علت یکی از قہرمانان مسلمانان ہند و پاکستان محسوب گردید۔

پس از برچیدہ شدن بساط سلطنت فارسی زبانان در سرزمین ہند و پاکستان حکومت انگلستان جہت حفظ منافع خود دیوار صدو پنجاہ سالہ ای در بین ایران و آن دیار برپا ساخت۔ در نتیجہ اہالی ہر دو طرف آن دیوار از اوضاع یک دیگر بی اطلاع و ناآشنا ماندند۔

ولی درہمیں اثنا مسلمانان شبہ قارہ بیشتر بعلت مواجہ شدن با تمکار غربی درجادہ ترقی و تعالی فکری گام زدند و دربوجود آوردن زندگی نوینی کہ باید آن را نشاۃ ثانیہ آنان قلمداد نمود توفیق یافتند ولی متاسفانہ وجود دیوار فوق الذکر نگذاشت ایرانیان نیز از خدمات ارزندہ علمی و ادبی کہ دراین مدت توسط ہمسایگان مخصوصاً درزمینہ فارسی و ایران شناسی صورت گرفت مطلع شوند و با خدمت گزاران صدیق بفارسی درآن مملکت آشنا گردند۔

سرسید احمد خان موسس جامعہ اسلامی علی گڑھ ۔ مولانا محمد حسین آزاد ۔ مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد ۔ سید سلیمان ندوی. علامہ محمد اقبال، و مولوی عبدالحق از پیشروان نبام نہضت "نشاۃ ثانیہ" فکری و علمی مسلمانان شبہ قارہ میباشند. مولوی عبدالحق در بین ہمہ آنان از نظر زبان و ادبیات اُردو و فارسی مقام شامخی را داراست ولی مانند سائر خدمت گزاران بفارسی در دورہ استیلائی انگلستان در ہند و پاکستان وی نیز چونکہ باید بہ ایرانیان معرفی نشدہ است ۔ لذا درانیجا گرد آمدہ ایم تا درمورد شخصیت و خدمات برجستہ علمی و ادبی وی سخنی بہ میان آوریم و یکی از شائستہ ترین خدمت گزاران فارسی و ایران را بہتر بشناسیم ۔

علاوہ بر دانش کدہ اُردو (کراچی) و انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کہ از یادگارہای جاویدان اوست زبدہ آثار علمی بابائی اردو، باختصار بدینقرار است ۔

۱ ۔ تعداد زیادی از مقدمہ ہای تحقیقی بر کتب مختلف ٭ ۲ ۔ فرہنگ معیاری انگلیسی باردو ٭ ۳ ۔ نفوذ فارسی در زبان مرہتی ۔
۴ ۔ حالات و افکار سرسید احمد خان ٭ ۵ ۔ چند ہم عصر ٭ ۶ ۔ سہم متصوفین در نشو و نمائی اُردو
۷ ۔ نصرتی ملک الشعرائی بیجا پور ٭ ۸ ۔ مرحوم دہلی کالج ٭ ۹ ۔ مقدمات عبدالحق (دو جلد) بکوشش میرزا محمد بیگ ٭ ۱۰ ۔ تنقیدات عبدالحق (دو جلد) بکوشش تراب علی خان ٭
۱۱ ۔ قاموس الکتب ٭ ۱۲ ۔ اردوی قدیم ٭ ۱۳ ۔ سب رس، مصنفہ ملا وجہی ٭
۱۴ ۔ مثنوی قطب و مشتری اثر وجہی ٭ ۱۵ ۔ مثنوی گلشن عشق اثر ملا وجہی ٭ ۱۶ ۔ خطبات عبدالحق (۲ جلد) بکوشش دکتر عبادت

فکر و بیان از علائم زندگیست و کسی کہ میتواند از دریچہ تالیفات و تحریرات بمردم پیام بدہد و با نہام کلام باشد پس از خاک شدن ہم بامحبت در بجائے روی زمین در قلوب اشخاص با علم زندگی میکند ۔

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو
در سینہ ہای مردم عارف مقام ماست

"مولوی عبدالحق کی شخصیت کے اثر اور قوت نے اُردو زبان و ادب کے دامن کو وسیع کیا، ان کی بے لوث اور پیہم کوششوں نے اُردو کو ایک پائدار اور علمی زبان بنانے میں صرف ہوتی رہی ہیں کبھی محو نہیں ہوسکتیں ۔

نواب حیدر نواز جنگ بہادر سر اکبر حیدری

پروفیسر ہارون خان شروانی



بابائے اردو

مولوی عبدالحق مرحوم سے سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔ ابھی مسلم یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مدرسۃ العلوم (ایم۔ اے او۔ کالج) علی گڑھ کے ٹرسٹیوں کا جلسہ تھا۔ نواب اسحاق خاں کالج کے سکریٹری تھے اور ان میں اور کالج کے یوروپین پروفیسروں کے درمیان اقتدار کی کشمکش چھڑی ہوئی تھی۔ انگریز پروفیسروں میں سے اکثر نے، بلکہ شاید سبھی نے، استعفا دے دیا تھا۔ والد مرحوم، جو کالج کے قدیم ترین ٹرسٹیوں میں سے تھے، اسحاق خاں صاحب کے مویدوں میں سے تھے۔ اور ان کا کہنا تھا کہ کالج کی مقتدر جماعت ٹرسٹی ہیں نہ کہ اسٹاف کے انگریز ممبر، انگریز پروفیسروں کی حیثیت تو محض تنخواہ یاب ملازموں کی ہے اور انہیں انتظامی معاملات میں ٹرسٹیوں کا تابع ہونا چاہیے۔ دوسری طرف انگریزوں کو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی تائید حاصل تھی، اور ایک اعتبار سے پورا سامراج ان کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ بہرحال اسی کشمکش میں ٹرسٹیوں کا جلسہ ہوا۔ باہر سے جو ٹرسٹی آنے والے تھے ان کے استقبال کے لئے اکثر مقامی ٹرسٹی ریل کے اسٹیشن گئے تھے۔ ان میں سے ایک میرے والد مرحوم بھی تھے۔ میں دو ڈھائی سال پہلے انگلستان میں تعلیم ختم کر کے آیا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اپنی مادر علمی کے ٹرسٹیوں سے ملوں۔ میں والد ماجد کے ساتھ اسٹیشن گیا اور وہاں مولوی عبدالحق صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ بھرا ہوا جسم، بہت سے دوسرے ٹرسٹیوں سے ذرا پستہ قد، خوب چوڑی چکلی تن چالونی داڑھی سر پر کچھ میلی سی ترکی ٹوپی، بدن پر دیدہ زیب اچکن جس کے ساتوں بٹن اپنے اپنے کاجوں میں لگے ہوئے تھے۔ یہ تھی ہیئت اس شخص کی جو آئندہ چل کر بابائے اردو بنا۔ مولوی صاحب کی عمر لگ بھگ پچاس برس کی ہوگی اور اس وقت بھی ان کا ہنس مکھ ہونے کے ساتھ باوقار چہرہ اور ان کی پوشش انہیں باقی تمام ٹرسٹیوں میں ممتاز کئے ہوئے تھی۔ اس تقریباً نصف صدی میں کئی مرتبہ مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی اور ساتھ رہا لیکن ۱۹۱۷ء کے مولوی صاحب اور ۱۹۶۳ء کی سج دھج میں سوائے بالوں کا رنگ تبدیل ہو جانے کے کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔

۲۸ اگست ۱۹۱۹ء کو کلیہ جامعہ عثمانیہ قائم ہوا۔ میرا تقرر جامعہ کے مددگار پروفیسر تاریخ پر ہوا۔ مولوی صاحب اس سے پہلے ہی عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے صدر ہو کر جا چکے تھے اور دارالترجمہ کی نظامت کا جائزہ سید محی الدین مرحوم کو دے دیا تھا۔ شاید ۱۹۲۰ء میں حیدری صاحب مرحوم یا مسعود جنگ مرحوم (اب تو اس زمانے کے سب ہی مرحوم ہو گئے) کے ہاں ملاقات ہوئی۔ پوچھنے لگے کہ "شعبہ تاریخ میں کوئی پروفیسر تو ہے ہی نہیں یہ آپ مددگاری کس کی کرتے ہیں؟" میں نے جواب دیا کہ "آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کرتے ہیں۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے نصاب کی یا دہری

جتنی بھی کمیٹیاں بنیں اور جن کی قراردادوں پر گویا جامعہ کی بنیاد پڑی ان کے جزو لاینفک تو آپ تھے۔ آپ میری مددگاری کی توجیہہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں!"

مولوی صاحب نے عثمانیہ کالج اورنگ آباد کی صدارت کیا کی وہاں کے جنگل کو منگل بنا دیا۔ مقبرہ رابعہ دورانی کے باغ کے اس گوشے کو جس میں مولوی صاحب رہتے تھے، لوگ اردو باغ کہنے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے مرزا فرحت اللہ بیگ کی لکھی ہوئی ادبی تمثیل کو جس کا عنوان "۱۲۶۱ھ کا ایک مشاعرہ" تھا، اپنے کالج میں پیش کیا۔ اس تمثیل کی مقبولیت کا اس سے اندازہ ہوگا کہ حیدرآباد سے جو لوگ اسے دیکھنے کے لئے اورنگ آباد گئے تھے ان میں علاوہ جامعہ کے سینیر اساتذہ کے حیدرآباد ریاست کے وزیر فنانس حیدری صاحب، اعلیٰ حضرت حضور نظام کے صدر المہام پیشی نواب سرامین جنگ، یہاں کے ممتاز ناظم تعلیمات مسعود جنگ، اور دوسرے عمائد شامل تھے۔ مولوی صاحب نے سب مہمانوں کے رہنے سہنے کھانے پینے کا ایسا انتظام کیا تھا کہ آج بھی اس کی یاد تازہ ہے۔ تمثیل کاروں میں نہ صرف اساتذہ اور طلبہ نے حصہ لیا تھا بلکہ اورنگ آباد کے بعض سربرآوردہ عمائد نے بھی اردو زبان کے بڑے بڑے شعرا کا روپ بھرا تھا اور اس سے مولوی صاحب کے اثر اور ان کی شہرت کا اندازہ ہوتا تھا۔

مولوی صاحب اورنگ آباد میں تھے کہ انہوں نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے رسالہ "اردو" نکالنا شروع کیا۔ اس رسالے نے بڑی بڑی سیاحتیں کیں اور چند روز پس پردہ رہنے کے بعد اس نے دو توام بچوں کو جنم دیا، ایک تو سہ ماہی "اردو" جس کی ۴۳ ویں جلد نہایت آب و تاب سے کراچی سے نکل رہی ہے، دوسرا "اردو ادب" جو علی گڑھ سے نکل رہا ہے، گو اس پر (نہ جانے کس مصلحت سے) جلد کا تعین نہیں کیا جاتا۔ دونوں رسالوں کے شذرات کا، تبصروں کا، نثر کا، نظم کا معیار اتنا ہی اونچا ہے جتنا پہلے دن تھا، بلکہ زمانے کے ساتھ ساتھ ان دونوں میں معتدبہ ترقی بھی ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کی ادارت میں رسالہ "اردو" صرف چار برس لیتھو میں چھپا، لیکن جب مرحوم کو اس کا احساس ہوا کہ لیتھو کے ذریعے سے اردو زبان کی ترقی محال ہے تو بلا خوف و خطر انہوں نے اسے عمدہ اردو ٹائپ میں چھپوانا شروع کیا، اور کم سے کم کراچی کا رسالہ تو برابر اردو ٹائپ ہی میں چھپتا رہا۔

استاد فن وحید الدین سلیم مرحوم کے انتقال کے بعد ۱۹۲۹ء میں مولوی صاحب جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر ہو کر آئے اور وظیفہ حسن خدمت تک اس پر مامور رہے۔ میں مولوی صاحب کا ہمیشہ ممنون رہوں گا کہ ان کی بدولت مجھے انگریزی اردو دونوں میں مضمون نویسی ہی نہیں بلکہ تصنیف و تالیف کی طرف بھی میلان پیدا ہوا۔ وہ جب کبھی ملتے مجھ سے کہتے کہ "آپ تقریر کر لیتے ہیں مگر لکھنے سے کیوں گھبراتے ہیں، آپ کو جامعہ کے کمروں سے نکل کر وسیع تر پبلک کے سامنے آنا چاہیے۔ اگر آپ کو اپنے پر اعتماد کلی نہ ہو تو پہلے آپ روانی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر لکھ لیا کیجیے۔ اس کے بعد اسے اطمینان کے ساتھ پڑھ کر اسے درست کر لیا کیجیے اور کسی علمی رسالے میں بھیج دیا کیجیے۔" مولوی صاحب کے بار بار کہنے سے میری جھجک نکل گئی اور میں نے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا۔ جو بھی تھوڑا بہت انگریزی اور اردو میں لکھ لیتا ہوں اس کی بنیاد ایک اعتبار سے مولوی صاحب ہی نے ڈالی تھی۔

پروفیسری سے سبکدوش ہونے کے بعد مولوی صاحب نے یہ محسوس کیا کہ اردو زبان کی خدمت بحسن و جوہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ انجمن ترقی اردو کو دہلی منتقل کر دیا جائے۔ جب میں نظام کالج حیدرآباد کی صدارت سے سبکدوش ہوا اور میرا تقرر دہلی کے اینگلو عربک کالج کی صدارت پر ہوا تو

دہلی میں مولوی صاحب کا قیام اور انجمن کے وسیع کتاب خانے کا وجود نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوا۔ مولوی صاحب کی سکونت اور انجمن کا دفتر دونوں اسی کوٹھی (دریا گنج نمبر ۱) میں تھے۔ جو کسی زمانے میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کا مسکن اور بڑے بڑے قومی اجتماعوں کی آماجگاہ رہ چکی تھی بشمول ۱۹۲۷ء اور ۱۹۴۷ء کی خوں چکاں داستان تک۔ مولوی صاحب سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان کی قیام گاہ ہر اس شخص کے لئے کھلی ہوئی تھی جسے ذرا بھی علمی ذوق یا اردو زبان سے ذرا بھی لگاؤ ہو۔ اس میں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے کا گزر ہوتا تھا۔ کتاب خانہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ، کم یاب اور نایاب کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور ہر کتاب تہذیب یافتہ تھی۔ لیکن ظالم زمانے نے مولوی صاحب کو دہلی سے اکھاڑ دیا اور کتاب خانے کا ایک حصہ انسانی درندگی کی نذر ہو گیا۔ جو کتابیں باقی رہیں انہیں کسی نہ کسی طرح اینگلو عربک کالج کے ایک کمرے میں ذخیرے کے طور پر بھر دیا گیا۔

اگست کے آخری دہے اور ستمبر کی ابتدا کا زمانہ دہلی کے لئے تاریکی کا زمانہ تھا کسی کو کسی دوسرے کی خبر ملنا ممکن نہ تھا۔ دہلی یونیورسٹی کی موسم خزاں کی تعطیل شروع ہونے میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ اینگلو عربک کالج نئی اور پرانی دہلی کے عین وسط میں واقع تھا لیکن قتل و غارت اور ۸۲،۸۶ گھنٹے کے کرفیو کی وجہ سے کالج کے تعلقات قریب ترین آبادی سے بھی بالکل منقطع ہو گئے تھے۔ تعلیم و تعلم بالکل ناممکن کام تھا جب کالج کے مودی خانے کا سامان بالکل ختم ہو گیا اور مزید سامان کی سربراہی ناممکن ہو گئی تو "مجبوراً"، ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو کالج سے باقی ماندہ طلبہ اور اساتذہ کا تخلیہ کرانے کے بعد دوسرے دن بالکل آخری طیارے سے میں حیدرآباد چلا آیا۔ جب خزاں کی تعطیل ختم ہوئی تو میں اپنے زعم میں کالج کھولنے کے لئے ۱۲ اکتوبر کو واپس دہلی پہنچا۔ مگر وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ اینگلو عربک کالج ختم ہو چکا تھا اور ابھی تک اس نے دہلی کالج کی شکل میں جنم نہیں لیا تھا۔ جب ڈاکٹر راجندر پرشاد نے، جو ان دنوں ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے صدر تھے، دستور کے مسودے کا اردو ترجمہ کرانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی تو مجھے بھی اس کا رکن مقرر کیا۔ اس میں شرکت کے لئے مجھے نومبر ۱۹۴۸ء میں چھ مہینے کے لئے از سر نو دہلی جانا پڑا۔ میں ویسٹرن کورٹ میں ٹھہرایا گیا۔ معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق صاحب دہلی میں زاہد حسین صاحب کے ہاں (جو کسی زمانے میں حیدرآباد کے وزیر مالیات رہ چکے تھے اور ۱۹۴۸ء کے آخر میں ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے)، قیام ہے۔ میں مولوی صاحب سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وہ بہت پریشان ہیں۔ کہنے لگے کہ اب ہندوستان میں اردو کا کوئی موقف نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ مولوی صاحب ہندوستان میں اردو کے لئے جدوجہد کا زمانہ تو اب شروع ہوا ہے اور اردو والوں کو آپ کی قیادت کی بڑی ضرورت رہے گی۔ مگر انہوں نے کراچی کو اپنا مستقر بنانے کی ٹھان لی تھی اور اس موضوع پر مزید گفتگو بے کار ثابت ہوئی

مارچ ۱۹۵۴ء میں مجھے کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس میں، جو لاہور میں ہوئی تھی، ہندوستانی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے پاکستان جانا پڑا۔ کانفرنس بارہ روز رہی۔ اس کے اختتام پر کراچی کے راستے بمبئی ہو کر حیدرآباد واپس آیا۔ کراچی میں مولوی صاحب سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ مولوی صاحب کی عمر ۸۰ سے متجاوز ہو چکی تھی، تاہم روزمرہ کے معمولات برابر جاری تھے، روزانہ ہوا خوری، طنز آمیز گفتگو، ہنس مکھ چہرہ ان سب میں سر مو فرق نہ آیا تھا۔ روزمرہ کتاب خانے میں آکر بیٹھنا اور ایک بجے تک برابر بیٹھے رہنا، خطوں کا جواب خود لکھنا یا لکھوانا، تصنیف و تالیف پر نظر ثانی کرنا بس یہی مولوی صاحب کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ کتاب خانے میں اچھا ذخیرہ دکن کی تاریخ کی کتابوں کا تھا چنانچہ میں ان کا مطالعہ کرنے اور مولوی صاحب کی سبق آموز گفتگو سے حظ حاصل کرنے کے لئے روزانہ جاتا تھا، اور کتاب خانے میں قیام کا ایک حصہ مولوی صاحب سے کچھ اخذ کرنے میں صرف کرتا تھا۔

مولوی صاحب سے میری آخری ملاقات اکتوبر سنہ ۶۰ء میں ہوئی۔ اپنے بعض عزیزوں سے ملنے کراچی گیا ہوا تھا۔ سرسید کی برسی پر سرسید کالج برائے اناث میں ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت مولوی صاحب نے کی۔ میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب میں وہ جولانی نہیں رہی جو چند سال پہلے تھی۔ تاہم اردو کے ساتھ لگاؤ جو عشق کے درجے پر پہنچ گیا تھا اب بھی موجود تھا۔ خطبہ صدارت میں انہوں نے پاکستان میں اردو کی جد و جہد کا ذکر کیا اور ساتھ ہی نہایت زور کے ساتھ اردو یونیورسٹی کے مسئلے کو چھیڑا اور کہا کہ میں اس وقت تک چین نہیں لونگا جب تک پاکستان میں اردو یونیورسٹی قائم نہیں ہو جائے گی۔ کراچی سے چلنے سے پہلے میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابتدا میں مولوی صاحب کا قیام انجمن کی عمارت کی دوسری منزل میں رہتا تھا۔ لیکن اب کبرسنی کی وجہ سے وہ نیچے کی منزل میں آگئے تھے اور دفتر کا ایک حصہ اپنے لئے خالی کرالیا تھا۔ ثقل سماعت ہو گیا تھا اور آلہ لگائے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں آنکھ بنی تھی اور اگر عینک لگی نہ ہوتی تو مہمان کو پہچاننا محال ہو جاتا۔ حیدرآباد کی باتیں کرتے رہے اور ہر شخص جس سے ان کی ملاقات تھی پوچھتے رہے۔ ایک گھنٹے تک اٹھنے نہیں دیا۔ بالآخر میرے چلنے کا وقت آگیا اور میں نے چشم نم کے ساتھ (جس کا انہیں احساس نہیں ہونے دیا) انہیں خدا حافظ کہا۔

بابائے اردو محض ایک مہربان انسان ہی نہ تھے، وہ تو ایک چلتا پھرتا ادارہ تھے۔ آخر عمر میں انہیں دو آرزوئیں ستاتی تھیں، ایک تو اردو یونیورسٹی کا قیام اور دوسرے Murray's Oxford Dictionary کے نمونے پر کئی جلدوں میں ایک ضخیم اردو لغت کی تیاری جس میں ہر اردو لفظ کے درجہ بدرجہ ارتقا کی کیفیت بیان کی جائے۔ ان کی پیہم کوششوں سے ایک اول درجے کا اردو کالج بن کر کھڑا ہو گیا ہے اور اس میں سیکڑوں طلبہ اور طالبات تعلیم پاتے ہیں۔ ساتھ ہی کم سے کم جامعہ کراچی کا ذریعہ تعلیم اردو ہو گیا ہے۔ اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا سہرا اس کے معین امیر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے سر ہے۔ ایک ضخیم اردو لغت کا کام ترقی اردو بورڈ نے اپنے ذمے لے لیا ہے جسے ممتاز حسن صاحب (ستارۂ پاکستان) کی صدارت اور شان الحق حقی صاحب کی معتمدی کا فخر حاصل ہے۔ الحمد للہ مولوی صاحب کی جد و جہد آہستہ آہستہ نتیجہ خیز ثابت ہو رہی ہے۔

مولوی صاحب ۹۱ برس کی عمر میں پہنچ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے اور آخر تک اپنی دھن میں لگے رہے۔ ان کو کوئی دیکھتا تو اندازہ ہوتا کہ ایک محتاط اور متناسب زندگی بسر کرنے اور اپنے دماغ کو برابر کام میں لگائے رہنے کی وجہ سے انہوں نے اپنے عزم، تندہی اور تنومندی کی کیسی مثال جوانوں، ادھیڑوں اور بوڑھوں کے لیے قائم کر دی اور ہندوستان اور پاکستان دونوں میں گویا اپنے کام کا جھنڈا گاڑ کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ آج ہندوستان ہو یا پاکستان جب تک اردو کا نام باقی رہے گا اس وقت تک بابائے اردو کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔

"مولوی عبدالحق صاحب کی ہستی اردو علم و ادب کے لیے ایک بیش بہا نعمت ہے جس کی وجہ سے ان کا شمار اردو ادب کے محسنوں میں ہوتا ہے۔ اور یہ ہر لحاظ سے بجا ہے ان کا شمار ملک کے سچے بہی خواہوں میں ہونا بھی لازمی ہے۔"

مہاراجا سرکشن پرشاد شاد

سیّد ہاشم رضا

عالمِ باعمل

ایک مرتبہ میں نے بابائے اُردو کو اپنے مکان پر ایک تقریب میں دعوت دی تھی جس میں کئی اور عالم اور ادیب بھی مدعو تھے۔ گفتگو لفظ مومن کی تشریح پر تھی۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں اور جب مولوی عبدالحق مرحوم کی باری آئی تو انھوں نے فرمایا کہ مومن کی ایک پہچان یہ ہے، کہ اسے اُردو سے محبت ہوتی ہے۔ اس قول پر عمل کرتے ہوئے میں حاضرینِ محفل کو اس طرح بھی مخاطب کر سکتا ہوں کہ یا ایھا المومنین والمومنات!

میرا رسمی تعارف بابائے اُردو سے ۱۹۴۰ء میں خالق دینا ہال کراچی میں ہوا، جب وہ اردو کانفرنس کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد مجھے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میری راہ سول سروس کی راہ تھی اور ان کی راہ اُردو سروس کی راہ تھی، لیکن یہ دونوں راہیں قیامِ پاکستان کے بعد اس طرح ملیں کہ مولوی صاحب دہلی سے ہجرت کر کے کراچی آئے اور میرے پاس انجمن ترقی اُردو کے دفتر کے الاٹمنٹ کے لیے تشریف لائے۔ گویا کنواں خود پیاسے کے پاس آیا۔ میں اس زمانے میں کراچی کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس زمانے میں روزانہ سینکڑوں آدمی مجھ سے مکان اور دکان کے الاٹمنٹ کے لیے ملتے تھے۔ مولوی صاحب کو اس عمارت کا الاٹمنٹ دے کر جس میں انجمن ترقی اُردو کا دفتر ہے اور جس میں چند سالوں کے بعد اُردو کالج قائم ہوا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ خود مجھے کچھ مل گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے مکان کے لیے درخواست نہیں دی، آپ کو مکان کی بھی تو ضرورت ہوگی۔ فرمایا "مجھے انجمن کے لیے دفتر چاہیے اپنے لیے مکان نہیں چاہیے۔ میرے گھر میں کوئی صاحب خانہ نہیں۔ میں دفتر ہی کے ایک کمرے میں اقامت گزیں ہوں گا۔"

پھر جب کراچی پاکستان کا پہلا دارالخلافہ بنا اور اس کی نظامت کا بار میرے کاندھوں پر ڈالا گیا تو دفاتر میں اُردو کی ترویج کے سلسلے میں مولوی صاحب سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے وقتاً فوقتاً وہ احکامات صادر کیے جن سے اُردو کراچی کی دفتری زبان بنی۔ ان احکامات کا حوالہ اس بیان میں ہے جو مولوی عبدالحق نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۵ء کو دیا اور جو "جنگ" اور "انجام" میں شائع ہوا۔ میری حقیر خدمات کا ذکر بابائے اُردو نے اس سپاس نامے میں کیا جو نظمائے انجمن ترقی اُردو پاکستان کی جانب سے شہیدِ ملت لیاقت علی خاں مرحوم کو دیا گیا اور اس کے پڑھنے کے بعد میں یہ مصرع دہرا سکتا ہوں کہ ؎ نازم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

میں جب بہاولپور میں کمشنر تھا تو مولوی صاحب نے مجھے انجمن ترقی اُردو کی مجلس نظما کی رکنیت کی دعوت دی۔ میں نے اس بنا پر معذرت ظاہر کی کہ میں کراچی سے دور ہوں اور جلسوں میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھے دو خطوط لکھے اور مجھے ان کی دعوت پر "لبیک" کہنا پڑا۔ (خطوط مورخہ ۲۷ر فروری ۵۶ء ۴ر مئی ۱۹۵۶ء)

مولوی عبدالحق اُردو زبان کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ وہ اُردو کے مدرس بھی رہے، محقق بھی رہے۔ خادم بھی رہے اور ناظم بھی۔ جامعہ عثمانیہ کی نشوونما میں انھوں نے میر عثمان علی خاں مرحوم والئی دکن، اور سر اکبر حیدری مرحوم وزیر اعظم حیدر آباد کے دوش بدوش کام کیا۔ انگریزی اُردو کی ڈکشنری، اور انجمن ترقی اُردو کا نادر کتب خانہ دونوں ان کے کارنامے ہیں۔

بات سے بات نکلی ہے۔ بقول شاعر ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تری جوانی تک

مولوی صاحب کا ذکر اُردو کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے اور اُردو کا ذکر پاکستان کے ذکر کے بغیر ناتمام ہے۔ خلافت کی تحریک میں اُردو پیش پیش رہی اور پاکستان کی تحریک میں اُردو زبان کے تحفظ کا مسئلہ بار بار اٹھایا گیا۔

اردو اور تحریک پاکستان دو قومی نظریہ برصغیر ہندوستان و پاکستان میں سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے ۱۸۶۷ء میں پیش کیا اور سر سید کو یہ احساس اس وقت ہوا جب بنارس کے چند سرکردہ ہندوؤں نے یہ ایجی ٹیشن شروع کیا کہ تمام سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو کی جگہ ہندی کو دی جائے اور عربی رسم الخط کے بجائے دیوناگری رسم الخط استعمال کیا جائے۔ دو قومی نظریئے کا منطقی نتیجہ تقسیم ہند تھا اور اُردو کے مشہور ادیب مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے ہفتے وار رسالے میں جو لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا تقسیم کی تجویز بھی پیش کر دی تھی۔ اس کا نام "مہذب" تھا اور ۲۳ر اگست ۱۸۹۰ء کے پرچے میں اس زمانے کے ہندو مسلم فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے شرر نے لکھا:-

"حالات کچھ ایسے ہی ہیں کہ کوئی قوم دوسرے فرقے کے جذبات کو مجروح کیے بغیر اپنے مذہبی رسوم ادا نہیں کر سکتی اور نہ عوام میں رواداری اور صبر کا اتنا مادہ ہے کہ وہ دوسروں کی توہین کو معاف کر سکیں۔ اگر حالات اس حد تک پہنچ چکے ہیں تو پھر دانشمندی یہی ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور آبادی کا تبادلہ کر دیا جائے۔"

پاکستان کو محکم بنانے کے لیے اُردو زبان کی مدد ضروری ہے۔ اگر پشاور کا باشندہ چٹا گانگ میں رہنے والے پاکستانی بھائی سے ملے گا، تو گفتگو کا ذریعہ نہ پشتو ہوگا اور نہ بنگالی، ان کی باتیں صرف اُردو ہی میں ہو سکیں گی اور جب میر پور کشمیر کا رہنے والا اپنے سندھی بھائی سے میر پور خاص ملنے آئے گا تو اُردو زبان ہی دونوں کی ترجمان بنے گی۔ ہندوستان میں بھی ابھی کچھ ایسے حق گو اور انصاف پسند باقی ہیں جو اردو کو "صلح" کی زبان کہتے ہیں جیسے آنند نرائن ملاؔ کا شعر ہے ؎

ملاؔ بنا دیا ہے اسے بھی محاذ جنگ
اک صلح کا پیام تھی اُردو زبان بھی

آج کل پاکستان میں اُردو کی ترویج کی مخالفت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو لارڈ مکالے کی اُمیدوں پر پورے اترتے ہوں۔ آج سے سوا سو

سال پہلے انگریزی کے بے مثل اہل قلم اور اس زمانے کی حکومت کے قانون کے ممبر لارڈ میکالے نے کہا تھا " انگریزوں کی تمام تر کوشش یہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ وجود میں لایا جائے جو انگریزوں میں اور ان کروڑوں ہندوستانیوں میں جن پر ہم حکومت کرتے ہیں مفاہمت پیدا کرے ۔ ان لوگوں کا رنگ اور خون تو ہندوستانی ہو لیکن ان کے دل و دماغ پر انگریز اور انگریزی چھائی ہوئی ہو۔"

میں نے ٹائم میگزین میں دنیا کی زبانوں پر ایک مضمون پڑھا تھا ۔ یہ مضمون ۲۴ فروری ۱۹۶۱ء کے پرچے میں چھپا تھا ۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا میں تین ہزار سے لے کر چھ ہزار زبانیں رائج ہیں لیکن جو زبانیں مشہور ہیں اور جن زبانوں میں وزن ہے ، ان کی تعداد ۱۳۰ ہے ۔ مضمون نگار نے ایک درجن زبانوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد کا اندازہ یوں لگایا ہے :۔

چینی زبان (منڈرین) ــ ۴۶ کروڑ ÷ انگریزی ــ ــ ۲۵ کروڑ ÷ ہندوستانی ــــــ ۱۶ کروڑ

اسپینی زبان ــــ ۱۴ کروڑ ÷ روسی ــــــ ۱۳ کروڑ

جرمنی ــــــ ۱۰ کروڑ ÷ جاپانی ــــــ ۹½ کروڑ

(جسے ہم اردو کہتے ہیں اور جسے ہندوستان والے ہندی کہتے ہیں)

عربی ــــــ ۸ کروڑ ÷ بنگالی ــــــ ۷½ کروڑ ÷ پرتگالی ــــ ــ ۷½ کروڑ

فرانسیسی ــــــ ۶½ کروڑ ÷ اطالوی ــــــ ۵½ کروڑ ۔

ان اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دنیا کی قدیم زبانوں میں چینی اور جدید زبانوں میں اُردو کا دائرہ سب زبانوں سے زیادہ وسیع ہے ۔ اُردو ان بارہ زبانوں میں جن کا تذکرہ ہوا ہے ، سب سے کم عمر ہے لیکن اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ برصغیر ہندوستان و پاکستان میں تو یہ ہر جگہ بولی جاتی ہے ۔ نیپال ، سیلون ، برما ، ملایا ، افغانستان ، ایران ، عراق ، مڈگاسکر ۔ کینیا اور زنجبار میں بھی اُردو بولنے والوں کی تعداد کافی ہے اور سمجھنے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے ۔

بابائے اُردو کا بیان

کراچی ، ۲۰ نومبر ، مولانا عبدالحق نے پریس کو حسب ذیل بیان دیا ۔ جو ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء کے جنگ اور انجام میں شائع ہوا ۔

" اخباروں میں یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ کراچی کے اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ حکم دیا ہے کہ کراچی کی عدالتوں کی کارروائی سندھی میں ہونی چاہیئے یا انگریزی زبان میں ۔ اُردو عدالتی زبان نہیں ۔ ابھی اس شہر میں حکومت کے ایسے عامل موجود ہیں جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کراچی میں کون سی زبان بولی جاتی ہے اور عدالتوں اور دفاتر کو اس سے بہت پہلے اُردو میں کارروائی کرنے کی ہدایت دی جا چکی ہے ۔ میں فاضل مجسٹریٹ کی واقفیت کے لیے ان ہدایات و احکامات کی نقل پیش کرتا ہوں جو وقتاً فوقتاً اس بارے میں نظامت کراچی کی جانب سے جاری ہوتے ہیں :۔

" از روئے دفعہ ۵۵۸ ضابطۂ فوجداری مقامی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ (باستثنائے ہائی کورٹ) ان عدالتوں کو جو اس کی حدود ارضی کے اندر واقع ہیں ہدایت کر سکتی ہے کہ وہ عدالتی کارروائی کس زبان میں انجام دیں ۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں نظامت کراچی کی طرف سے ان صاف الفاظ میں یہ ہدایت کی گئی کہ اس کے جملہ دفاتر اور عدالتوں کی کارروائی صرف اُردو ہی میں انجام دی ۔

جائے۔ دسمبر سنہ۵۰ء میں ایک اشد ضروری گشتی مراسلہ بہ عنوان "ترویج و ترقی زبان اردو" ناظم صاحب بلدیہ کراچی و جملہ ماتحت دفاتر نظامت کراچی کو بنا برتعمیل و مقامی اخبارات و تمام فرموں نیز کارخانہ جات و کمپنیوں کو بنا بر اطلاع و تعاون و ترویج زبان اُردو جاری کیا۔ جس کی اصل عبارت یہ ہے:۔

"بانیٔ پاکستان اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے ارشاد و خواہش کے مطابق اُردو ملکی و قومی زبان قرار پا چکی ہے۔ صوبہ پنجاب و سرحد پیش قدمی کر چکے ہیں۔ وہاں ڈپٹی کمشنر نیز ان کے ہم رتبہ دیگر دفاتر و نیز ماتحت دفاتر میں اب صرف اُردو زبان مستعمل ہے گو صوبے کی حکومت نے کمشنروں کو سردست اجازت دی ہے کہ خواہ وہ انگریزی زبان استعمال کریں یا اردو مگر حکومت کی جانب سے یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ بھی جلد از جلد اُردو زبان کا استعمال شروع کر دیں گے۔ نظامت کراچی و نیز اس کے جملہ ماتحت دفاتر و عدالتوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ سرکاری مراسلت، عدالتی کارروائیوں و بین محکمہ جاتی مراسلت میں حتی المقدور صرف اردو ہی استعمال کریں۔"

(دستخط) سید ہاشم رضا صاحب ناظم کراچی

اس کے بعد سید صاحب نے ایک گشتی حکم ۱۲ کو جاری کیا:۔

"چونکہ نظامت ہذا اور جملہ ماتحت و متعلقہ دفاتر میں اب اردو زبان میں سرکاری مراسلت کا کام شروع کر دیا گیا ہے لہٰذا بہ نظر سہولت آیندہ اب خالی اسامیوں کے پُر کرتے وقت اُمیدواروں کا امتحان انگریزی اور اُردو دونوں میں لینا لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ جملہ متعلقہ اور ماتحت دفاتر و پریس مطلع کیے جاتیں۔"

(دستخط) سید ہاشم رضا صاحب (ناظم کراچی)

اس کے بعد پھر تیسری بار ایک گشتی حکم بنا بر تعمیل و اطلاع ملازمین نظامت و متعلقہ دفاتر ۱۲ فروری ۱۹۵۱ء کو جاری کیا۔ و ہو ہذا:۔

مقدمہ

تاکید سیکھنے زبان اُردو تا یکم جولائی سنہ۵۱ء و ابتدائے کار مراسلت بزبان اردو نظامت ہذا و صدر دفتر کراچی کے اُردو داں ملازمین کی فہرست ملاحظہ کرنے کے بعد واضح ہوا کہ منجملہ ۱۰۰ ملازمین نظامت ہذا کے ۹۲ اور صدر دفتر پولیس کے ۶۸ ملازمین میں سے ۶۵ افراد اُردو داں ہیں۔ یہی حال بیشتر بقیہ دفاتر کا بھی ہے۔ تقریباً ہر دفتر میں بیشتر اہلکاران سرکاری مراسلت کا کام اُردو زبان میں بخوبی انجام دینے کی صلاحیت و استعداد رکھتے ہیں۔ محض چند ملازمین ایسے ہیں جنھوں نے یکم جولائی سنہ۴۹ء کے تاکیدی حکم کے بعد بھی مزید ایک سال کی مہلت گزر جانے کے بعد اب تک اُردو زبان میں لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا ہے۔ نظامت ہذا و نیز اس کے جملہ ماتحت و متعلقہ دفاتر کے اردو نہ جاننے والے ملازمین کو اس حکم کے ذریعے تاکید کی جاتی ہے کہ وہ یکم جولائی سنہ۵۱ء کے اندر اُردو زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیں تاکہ جولائی سنہ۵۱ء کے امتحان میں کامیاب ہو سکیں۔ اس امتحان میں ناکام رہنے والے ملازمین کے خلاف حسب دستور کارروائی ضابطہ عمل میں لائی جائے گی۔ چونکہ محض چند افراد کے اُردو نہ جاننے کے باعث نظامت ہذا و متعلقہ و ماتحت دفاتر میں اُردو کی مراسلت و ترویج کو کسی غیر معمولی مدت کے لیے ملتوی کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا ذریعہ حکم ہذا یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ تمام اہلکاران جو سرکاری مراسلت اُردو میں انجام دے سکتے ہیں۔ اب کار مراسلت و کارروائی عدالت اُردو میں انجام دیں۔ اس

مسئلے میں حکام بالا کا مکمل تعاون ان کو حاصل ہونا چاہیے۔"

(دستخط) سید ہاشم رضا صاحب ناظم کراچی

اس کے علاوہ کراچی کارپوریشن کی زبان اُردو ہے اور اس کی تمام کارروائیاں اُردو ہی میں ہوتی ہیں۔ کراچی یونیورسٹی نے اردو کو ذریعہ تعلیم تسلیم کرلیا ہے۔ خود فضیلت مآب گورنر جنرل کے دعوت نامے اور دیگر مراسلے اُردو میں جاری ہوتے ہیں۔ حکام و عاملان حکومت کو لازم ہے کہ وہ احکام دینے اور رائے قائم کرنے کے وقت حالات و واقعات کو پیش نظر رکھیں انہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تمام پاکستان بلکہ برِّعظیم بھارت و پاکستان میں کراچی ہی ایسا خطہ ہے جہاں کی مادری تہذیبی علمی و ادبی زبان اُردو ہے اور اب رفتہ رفتہ سرکاری زبان بھی اُردو ہوتی جارہی ہے۔

مکتوبات بابائے اُردو

انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ کراچی مورخہ ۲۷ فروری ۵۶ء حوالہ نمبر ۵۱۶

کرم فرمائے بندہ زاد لطفکم، تسلیم

گرامی نامہ ملا۔ میں بہت ممنون ہوں کہ انجمن کی مجلس نظما کی رکنیت قبول فرمائی۔ آپ پاکستان میں کہیں ہوں انجمن سے آپ کا تعلق ہمیشہ قائم رہے گا۔ انجمن آپ کی عنایات کبھی نہیں بھول سکتی۔

آج کل میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کی فکر میں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے میں کسی وقت بھاولپور میں حاضر ہو کر ملاقات کا شرف حاصل کرسکوں۔

مخلص عبدالحق

انجمن ترقی اُردو پاکستان اسپتال روڈ کراچی ۴ مئی ۵۶ء

جناب مکرم و معظم زاد لطفہٗ تسلیم

وقت کی تنگی کی وجہ سے خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا اس لیے سندھ اُردو کانفرنس سکھر ملتوی کردی گئی۔ اب اس کے اجلاس ۲۲، ۲۳، ۲۴ مئی کو ہوں گے۔ میں نے اس کی اطلاع کئی روز ہوتے سیّد علی شبر صاحب کے ذریعے آپ کی خدمت میں کردی تھی۔ معلوم ہوا انھیں ملاقات کا موقع نہ ملا اور وہ اپنے کام پر چلے گئے اور مجھے خبر نہ کی مجھے اس کا بہت افسوس ہے اور معافی کا خواستگار ہوں۔

اب کانفرنس کی مجلس استقبالیہ اور دیگر معزز ارکانِ انجمن کی یہ دلی درخواست ہے کہ آپ اس کانفرنس کی صدارت قبول کرکے ہم سب کو ممنون فرمائیں۔ بلوچستان اردو کانفرنس کوئٹہ کی صدارت میری استدعا پر چوہدری محمد علی صاحب وزیر فنانس نے قبول فرمالی ہے۔ ہمیں کامل امید ہے کہ آپ ہماری درخواست ضرور قبول فرمائیں گے۔ کانفرنس کی آخری تاریخ کو مشاعرہ ہوگا۔

جواب کا منتظر، نیازمند عبدالحق

سپاس نامہ | منجانب نظمائے انجمن ترقی اُردو پاکستان :-

بخدمت قائد ملت عزت مآب عالی جناب، لیاقت علی خاں صاحب وزیر اعظم دولت خداداد پاکستان

(اقتباسات) انجمن ترقی اُردو نے گزشتہ چالیس سال میں اپنی قومی زبان کی اشاعت و تبلیغ اور اس کی حفاظت و حمایت نیز علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کرنے کی جو مہتم بالشان خدمت انجام دی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس کا اعتراف غیروں تک نے کیا ہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

تقسیم کے بعد جو قتل و غارت خونریزی و بربریت اور ناقابل بیان مظالم برپا ہوئے انجمن بھی ان سے نہ بچی۔ اس کا سامان لوٹ لیا گیا۔ کتب خانے کا ایک حصہ برباد کر دیا گیا جو بچا وہ ضبطی میں ہے۔ یہاں تک کہ معتمد کی کتابیں بھی ضبط کر لی گئیں جو ناقابل تلافی نقصان ہے۔ انجمن کا سب سے قابل کاتب اور اس کی بیوی بچے انجمن ہی کے مکان میں بڑی بے دردی سے شہید کر دیئے گئے۔ باوجود اس کے انجمن نے ہندوستان میں بھی کام کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہاں ہمارے کروڑوں ہم زبان آباد ہیں جن کی خدمت ہم پر لازم ہے لیکن موجودہ حالات میں اس کی اجازت نہیں دی گئی بالآخر انجمن اور اس کا بچا کھچا عملہ ایک لٹے قافلے کی شان سے پاکستان میں داخل ہوا۔

اب انجمن کا میدانِ عمل دولت علیہ پاکستان ہے۔ تصنیف و تالیف اور ترجمے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ چار قابل قدر علمی و ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک جدید معلومات سائنس حصہ اوّل ہے۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں پر مشتمل ہوگی جس میں تمام جدید سائنس سلیس اُردو زبان میں آجائیں گے۔ اس سے قبل انجمن تقریباً اڑھائی سو کتابیں، ادب، لغت، معاشیات، سائنس، فلسفہ تعلیم تاریخ وغیرہ علوم کی شائع کر چکی ہے۔ باوجود بے سروسامانی کے انجمن نے بڑی جرأت دُور اندیشی اور حقیقی قومی خدمت کا یہ کام کیا کہ یہاں ایک ایسا کالج قائم کیا جس میں یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم اردو زبان کے ذریعے سے دی جاتی ہے۔ انجمن نے اس عرصے میں ایک اور کام یہ کیا کہ یہاں کے مختلف محکموں کو اُردو کے رواج کی طرف توجہ دلائیں۔ ہم ان اعلیٰ حکام کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اس پر عمل شروع کر دیا ہے۔ خاص کر سید ہاشم رضا صاحب ناظم کراچی، جن کی توجہ سے ان کے دفتر میں اُردو کی کارروائی ہونے لگی ہے۔ نظام الدین صاحب ڈائرکٹر جنرل ریلوے نے ہماری تحریک کو بڑی خوشی سے لبیک کہا اور ریلوے ٹائم ٹیبل اور تمام ریلوے قواعد و ضوابط و قوانین کا مجموعہ انجمن میں بھیج کر ان کے اُردو ترجمے کی خواہش کی۔ انجمن نے ان سب کا ترجمہ کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ زاہد حسین صاحب ریزرو بنک کی رپورٹ کا اُردو ترجمہ اور بینک کی اصطلاحات کا لغت اپنی نگرانی میں تیار کرا رہے ہیں۔

اردو کی اشاعت سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ لوگ اُردو پڑھ کر زبان سیکھ لیتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہماری تہذیب اور روایات وابستہ ہیں۔ جہاں تک اس کا قدم پہنچا اس نے وہاں کے لوگوں میں نیا ولولہ، نیا قومی جذبہ، اور نئی زندگی پیدا کر دی۔ ہندوستان میں اس کے مٹانے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ حیدر آباد دکن جو ہماری تہذیب و زبان و روایات کا آخری مقام تھا اسے غاصبوں نے چند روز میں فنا کر دیا اور اس کے ساتھ ہماری تہذیب و زبان کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اب اس کی ترقی و فروغ پاکستان میں ہی ہو سکتا ہے۔ جب تک حکومت اس کی ترقی کے لیے فراخدلی اور فیاضی سے کام نہیں لے گی اسے اعلیٰ علمی درجہ حاصل ہونا دشوار ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے جو بے نظیر علمی کام سالہا سال کی محنت و جانفشانی اور لاکھوں روپے کے صرفے سے کیا تھا اس سے نہ صرف استفادہ کیا جائے بلکہ اسے اور ترقی دے کر اس سلسلے کو جاری رکھا جائے۔

یہ زبان کی خدمت نہیں پاکستان کی خدمت ہوگی۔ پاکستان کو حقیقی معنوں میں پاکستان بنانے کے لیے مختلف فرقوں اور علاقوں میں اتحاد و یک جہتی کی ضرورت ہے اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ ہماری قومی زبان ہے۔ اس کے بارے میں قائد اعظم کا بیان قول فیصل ہے۔ انھوں نے فرمایا " لنگوا فرینکا صرف ایک ہی ہوسکتی ہے یعنی وہ زبان جو مختلف صوبوں کے مابین استعمال ہوسکے اور وہ زبان اُردو ہوگی اور کوئی دُوسری زبان نہیں ہوسکتی "۔ ایک مرتبہ فرمایا " مملکت پاکستان کی سرکاری زبان بلاشبہ اُردو ہونی چاہیے۔ یہ وہ زبان ہے جس کی اس برِ عظیم کے دس کروڑ مسلمانوں نے غور و پرداخت کی ہے جو پاکستان کے طول و عرض میں ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ مزید برآں یہ وہ زبان ہے جس میں بہ نسبت کسی دوسری صوبائی زبان کے سب سے زیادہ اسلامی تہذیب اور اسلامی روایات کا بہترین ذخیرہ ہے جو دوسرے اسلامی ممالک کی زبانوں سے قریب تر ہے "۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا " میں آپ سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہوسکتی، جو کوئی اس بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ بغیر ایک سرکاری زبان کے کسی قوم میں رشتۂ اتحاد مضبوطی سے قائم نہیں رہ سکتا اور نہ وہ اپنے فرائض منصبی انجام دے سکتی ہے "۔ قائد اعظم کا یہ قول سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے ....

" مولوی عبدالحق صاحب نے گزشتہ چالیس سال میں جس دل جمعی، دل سوزی، اور یک سُوئی کے ساتھ اُردو کی خدمت کی ہے اس کی مثال زبان و ادب کے میدان میں تو کیا قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی بہت کم ملے گی۔ انھوں نے " فنا فی الاُردو " ہو کر " بقا بالاردو " کا درجہ حاصل کر لیا ہے "۔

خواجہ غلام السیّدین

" ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنی ذات میں خود انجمن اُردو ہیں۔ ان کی ساری عمر اُردو کی خدمت میں گزری۔ حق یہ ہے کہ بابائے اُردو کا خطاب مولوی عبدالحق کی قامت پر راست آتا ہے "۔

جسٹس ایس۔ اے رحمان

" یونانیوں کے مذاق مذہب کے موافق اُردو زبان اگر دیوی ہوتی تو شاید اس کے مندر کے سب سے بڑے پجاری اور پروہت ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہی ہوتے۔ اپنے کو اس خدمت میں ایسا لگایا، لگا یا کیا یہ کہیے کہ " مٹایا " کہ عرف ہی بابائے اُردو پڑ گیا اور اس عرفیت کی شہرت رفتہ رفتہ اصل نام پر غالب آ گئی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

حکیم محمد سعید

بڑا آدمی

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ان انسانوں میں سے تھے جن کی عظمت اور بڑائی کسی اتفاق، کسی سہارے یا کسی سازش کا تحفہ نہیں ہوتی۔ بلکہ جو اپنے کاموں کی بنا پر بڑے ہوتے ہیں اور ان کی بڑائی چھینی نہیں جا سکتی۔ ایسے بڑے آدمی دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ بابائے اردو میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ انھوں نے طویل زندگی گزاری اور اردو کی خدمت کرتے ہی گزاری۔ ان کی زندگی اردو تھی، ان کی توانائی اردو تھی، ان کی کمزوری اردو تھی۔ ان کی محبوبہ اردو تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو اردو کا بندہ بنا لیا تھا۔ قوم نے ان کو بابائے اردو بنایا۔ خادم بن کر ہی آدمی مخدوم بنتا ہے۔ بابائے اردو نے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور آخر سانس تک اردو کے لئے جیئے۔ وہ فرماتے تھے کہ "میں اردو کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان بنائے بغیر مرنا بھی نہیں چاہتا۔" اردو کے لئے جو تڑپ، جو لگن اور جو دھن ان میں تھی اس نے ان کو جوانوں سے زیادہ مضطرب، مستعد اور متحرک بنا رکھا تھا۔ بابائے اردو سے مل کر بلکہ صرف ان کو دیکھ کر ہی زندگی کا اعتماد اور زندہ رہنے کا جوش پیدا ہو جاتا تھا بابائے اردو سے جو چیز ہر شخص سیکھ سکتا ہے وہ ہے زندگی کا ایک مقصد متعین کر کے اس کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دینے کا سبق۔ خوب سوچ سمجھ کر ایک مقصدِ حیات چُن لیجئے، پھر اس مقصد کے علاوہ سب کچھ بھول جایئے۔ کامیابی کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔ اور کامیابی کیا ہے؟ بقول میرؔ "کام کرنا ہی کامیابی ہے۔"

پر سچ یہ ہے کہ کامیابی کا سہارا تو چھوٹے انسان لیا کرتے ہیں۔ بڑے لوگوں کو کامیابی کی پروا نہیں ہوتی۔ بابائے اردو کا ہر کام اردو کی بہتری کے لئے ہوتا تھا۔ اردو کے لئے ہی ملتے اور اردو کے لئے ہی جھگڑا کرتے۔ ان کی دوستی دشمنی اردو کے لئے تھی۔ اردو کا دوست ان کا دوست تھا۔ اردو کا دشمن ان کا دشمن۔

بابائے اردو میں بہت سی بڑائیاں تھیں۔ ان میں سے ایک بڑائی چھوٹوں کی ہمت افزائی اور ان کا دل بڑھانا تھا۔ اردو کے لئے کسی نے ذرا سا کام بھی کیا تو بابائے اردو نے اس کا اتنا حوصلہ بڑھایا کہ وہ واقعی کام کا آدمی بن گیا۔ انھوں نے اس طرح نہ معلوم کتنوں کو بنایا۔ ان کی حوصلہ افزائی نے بہت سوں کو زندہ رہنے کا اعتماد اور آگے بڑھنے کا ولولہ عطا کیا۔

بابائے اردو بجائے خود ایک تحریک تھے۔ ان کی یاد تازہ رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اردو کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ اور جو کام وہ اپنی زندگی میں پورے نہ کر سکے ان کو پورا کیا جائے۔ اردو کی دشمنی یا نادان دوستی کو ترک کیا جائے۔ زبان کو زیادہ سرمایہ دار بنایا جائے اور اردو کے نام سے شرمانے کے بجائے اس پر فخر کرنا سیکھا جائے۔

سہیل عظیم آبادی

شرافت کا آئینہ

یہ کہنا ذرا مبالغہ نہیں کہ بابائے اُردو کو جتنی محبت اُردو زبان سے تھی اتنی دنیا کی کسی دوسری چیز سے نہیں تھی۔ شاید اپنی زندگی سے بھی نہیں۔ اور ان کی عظمت کا راز یہی ہے۔ اُردو کا نام سن کر وہ کھل اُٹھتے تھے۔ اور اُردو کی راہ میں کوئی کانٹا نظر آتا تو بے چین ہو جاتے تھے۔ اسے بچانے کی ہر کوشش کرتے اور بڑی سے بڑی مصیبت اٹھانے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اُردو سے انھیں ایسا ہی عشق تھا جیسا کہانیوں کے شہزادوں کو کسی شہزادی سے۔ بڑھاپے میں بھی اُردو کے لیے جوانوں کی طرح کام کرتے تھے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اگر بڑھاپے میں بھی اُن سے کوئی کہتا کہ اگر آپ ایورسٹ پر اُردو کا جھنڈا گاڑ آئیں تو اُردو کو ملک (ملک سے میری مُراد غیر منقسم ہندوستان ہے) کی قومی اور سرکاری زبان مان لیا جائے گا تو وہ ہرگز نہ سوچتے کہ اس عمر میں ایورسٹ کی چوٹی تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ لیکن وہ تیار ضرور ہو جاتے۔ خواہ اس کوشش میں ان کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہوتا۔

اُردو زبان اور اَدب کی ترقی کے لیے وہ دن رات سوچتے اور کام کرتے تھے۔ سخت سے سخت محنت کرتے تھے جو اُردو کا دوست وہ ان کا دوست اور جو اُردو کا دشمن وہ ان کا دشمن۔ وہ اُردو کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی شخصیت سے لڑ جاتے تھے اور اس کے لیے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے سامنے جھک جاتے تھے۔ اُن کی زندگی اُردو کے لیے تھی۔ اس کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ زندہ رہے تو اُردو کے لیے اور مرے تو اُردو کے لیے۔

جو لوگ بابائے اُردو کو قریب سے نہیں جانتے انھیں میری باتوں میں شاید مبالغہ معلوم ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرا قلم رُک رُک کر چل رہا ہے۔ اور میں اُردو سے اُن کی غیر معمولی محبت کی تصویر لفظوں میں نہیں اُتار سکتا۔ یہ موقع یہ جتانے کا نہیں کہ وہ مجھے عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی بہت سی باتیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ بہت سی باتیں انھوں نے خود مجھے بتائی ہوئی ہیں اور بہت سے واقعات میری آنکھوں کے سامنے پیش آئے۔ ایک واقعہ سنیے۔ قصہ دلچسپ ہے۔ بظاہر مذاق معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بابائے اُردو کا ذہن یہی تھا۔ شاید یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی واقع دریا گنج میں انجمن کا دفتر تھا اور ملک کے ہر حصے سے علما و فضلا آیا کرتے تھے اور بہت سی باتیں ہوتی تھیں۔ مولانا ظفر الملک سے بابائے اُردو کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔ وہ ملنے آئے تھے۔ ساڑھے تین بجے کا وقت ہوگا۔ ہم لوگ چائے

پی رہے تھے۔ چائے کی میز پر مولانا محمود شیرانی اور پنڈت کیفی بھی تھے اور شاید ہاشمی فریدآبادی بھی۔ مختلف مسئلوں پر باتیں ہو رہی تھیں نہ جانے مولانا ظفر الملک کو کیا سوجھی۔ اور انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "مولوی صاحب اب آپ کو حج کر لینا چاہیے"۔ بابائے اُردو ہنس پڑے اور بولے "ہاں ایک شرط پر"۔ یہ عجیب سی بات تھی۔ حج اور شرط۔ مولانا ظفر الملک نے پوچھا، شرط کیا ہے؟ بابائے اُردو نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "اگر تم سلطان ابن سعود سے انجمن کو دس لاکھ روپے دلا دو تو میں اتنا لمبا سفر کرنے کو بھی تیار ہوں"۔ اس جواب پر سب لوگ ہنس پڑے۔

بات مذاق کی معلوم ہوتی ہے لیکن جو لوگ بابائے اُردو کو جانتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُن کے دل کی آواز تھی۔ جمعیۃ العلماء ہند کے سیکریٹری مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے کہا تھا۔ مولانا عبدالحق نے اُردو کو اپنا مذہب بنا لیا ہے۔ یہ بات انھوں نے کسی اور سلسلے میں کی تھی۔ لیکن یہ غلط نہیں، بابائے اُردو نے اُردو کے لیے سب کچھ کیا۔ اُن سے جو بھی ممکن تھا۔

وہ جن لوگوں میں اُردو کی خدمت کا جذبہ پاتے تھے ان کے لیے آنکھیں بچھا دیتے تھے۔ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا آدمی ہوتا۔ لیکن اگر کوئی اُردو کے معاملے میں اُن کے نقطہ نظر کی مخالفت کرتا (خواہ اُردو زبان کا مخالف نہ بھی ہو) تو وہ اس سے ٹکر لینے کو تیار رہتے تھے۔ راشٹر بھاشا پرشد کے اجلاس ناگ پور کے بعد مہاتما گاندھی سے ان کا اختلاف مشہور ہے۔ حالانکہ وہ مہاتما گاندھی کے بڑے مداح تھے۔ انھوں نے اپنے خرچ سے مہاتما گاندھی کے سوانح حیات لکھوائے تھے لیکن جب اُردو کے معاملے میں اختلاف ہوا تو مہاتما گاندھی سے دُور ہوتے چلے گئے۔

بابائے اُردو نے ملک کی سیاست میں کبھی حصّہ نہیں لیا لیکن وہ اپنے خیالات کے لحاظ سے کٹر ملکی تھے۔ مشترکہ زبان اور تہذیب کے علم بردار تھے۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے مداح تھے۔ مگر اُن سے بے حد خفا رہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مولانا کو سیاست سے الگ رہ کر علم و ادب کی خدمت کے لیے زندگی کو وقف کر دینا چاہیے تھا۔ راجا سر نریندر ناتھ سیاسی عقیدے کے لحاظ سے ہندو سبھائی تھے۔ لیکن وہ اُردو کے حامی تھے۔ اس لیے بابائے اُردو کے ممدوح تھے۔ یعنی بابائے اُردو کی محبت اور نفرت کی بنیاد بھی اُردو تھی۔ جو اُردو کا حامی بابائے اُردو اس کے حامی اور مداح۔ جو اُردو کا مخالف اس کے وہ مخالف، جو اُردو کی طرف سے بے پروا، اس کی طرف سے وہ بے پروا۔ اور اس معاملے میں وہ بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔۔۔

بابائے اُردو یوں بھی ہنگامی سیاست سے الگ رہتے تھے۔ حالانکہ اُن کے سیاسی خیالات تھے اور اُن میں بڑی شدت بھی تھی لیکن اُردو کی خاطر اپنے سیاسی خیالات کبھی ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔ اُن کا سارا وقت انجمن کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ انجمن ترقی اُردو کو مشترکہ تہذیب کا پلیٹ فارم بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کے دوستوں میں مختلف خیال کے لوگ تھے۔ سر سپرو بھی، پنڈت کیفی بھی۔ پنڈت سندر لال بھی اور پنڈت بنارسی داس چترویدی بھی۔ مولانا ظفر علی خاں بھی۔ عبدالرحمان صدیقی بھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی۔ مولانا محمود شیرانی بھی اور ڈاکٹر عبدالستار بھی۔ ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب بھی۔ اور نواب زادہ لیاقت علی خاں اور نواب صدیق علی خاں بھی۔ لیکن بابائے اُردو سب سے زیادہ احترام سر تیج بہادر سپرو کا کرتے تھے۔ سر سپرو کو وہ ہندوستانی تہذیب کا نشان کہتے تھے۔ انجمن ترقی اردو میں ہر خیال کے لوگ تھے، لیکن انجمن کو انھوں نے کسی سیاسی رنگ میں نہیں ڈھلنے دیا حالانکہ بعض لوگوں نے اس کی بڑی کوشش کی۔

اللہ نے بابائے اُردو کو غیر معمولی جرات دی تھی۔ بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے وہ حق بات کہنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ اور نہ اس کی پروا کرتے تھے کہ اس کا اثر کیا ہوگا۔ ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ خواجہ سر ناظم الدین متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے اپنی بعض تقریروں میں اُردو کی حمایت کی تھی۔ بابائے اُردو کو اُمید ہوئی کہ بنگال میں اُردو کے لیے کچھ کام ہو سکے گا۔ سر ناظم الدین سے انھوں نے خط و کتابت کی۔ عبدالرحمان صدیقی مرحوم درمیان تھے۔ آخر ملاقات پر بات ٹھہری۔ اور بابائے اُردو دلّی سے کلکتے کے لیے روانہ ہوئے۔ مجھے رانچی میں تار ملا۔ کلکتے حاضر ہونے کا حکم تھا۔ میں بھی کلکتے پہنچ گیا۔ قیام عبدالرحمان صدیقی صاحب مرحوم کے ساتھ تھا۔ بابائے اُردو بہت خوش تھے۔ دوسرے دن سر ناظم سے ملنے پایا گیا تھا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ سر ناظم بہت مصروف تھے۔ بابائے اُردو کو سخت غصہ آیا۔ جو لوگ اُن کا غصہ دیکھ چکے ہیں۔ وہ اندازہ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے صدیقی صاحب مرحوم کو کھری کھری سنائی اور وہ ہنستے رہے۔ بابائے اُردو بھی کچھ سوچ کر خاموش رہے۔ تیسرے دن وہ عبدالرحمان صدیقی مرحوم کے ساتھ سر ناظم سے ملنے گئے۔ جاتے وقت بہت خوش تھے۔ لیکن ایک گھنٹے کے اندر ہی واپس آگئے۔ بابائے اُردو کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ گاڑی سے اُترے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ ان لوگوں سے کوئی اُمید رکھنا فضول ہے۔ مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہیں اور اپنا اُلو سیدھا کرنے کو دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن جب وقت آتا ہے تو کسی سے بھی اچھے ثابت نہیں ہوتے۔ صدیقی صاحب مرحوم نے سمجھانے کی کوشش کی۔ اور کہتے رہے کہ دوبارہ چل کر باتیں کریں گے لیکن بابائے اُردو رضامند نہیں ہوئے۔ بولے کہ ان لوگوں کے بارے میں میری ایک رائے ہے اور ان سے کوئی اُمید نہیں۔ میں تو صرف تمھارے کہنے سے آگیا تھا، ورنہ آتا بھی نہیں۔

ٹھیک ایسا ہی واقعہ شہید سہروردی مرحوم کے ساتھ پیش آیا۔ اور انھوں نے دس بارہ آدمیوں کے سامنے شہید مرحوم کو کھری کھری سنا دی۔ لیکن شہید سہروردی مرحوم ہوشیار آدمی تھے۔ انھوں نے نہ جانے کس طرح انھیں خوش کر لیا۔

یہ تو ایک پہلو تھا بابائے اُردو کی بے باکی کا۔ بڑے سے بڑے انسان سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہو جاتے تھے لیکن اُردو سے محبت کرنے والوں کے سامنے وہ موم کے بن جاتے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ تھے جنھیں وہ بہت مانتے تھے۔ صرف اس لیے کہ اُردو سے انھیں محبت تھی۔ کس کس کا نام گنایا جائے۔ بعض لوگوں نے اُن سے خوب فائدہ اٹھایا۔

بابائے اُردو عجیب طبیعت کے آدمی تھے۔ کبھی ذرا سی بات پر ایسی ترش روئی سے پیش آتے کہ دل ٹوٹ جاتا اور کبھی بڑی سے بڑی غلطی کو اس طرح معاف کر دیتے جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ بے حد نرم دل اور ہمدرد انسان تھے۔ جن لوگوں سے انھیں ذرا بھی لگاؤ ہوتا ان پر کوئی بات آتی تو بے چین ہو جاتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں بابائے اُردو بیماری سے صحت پانے کے بعد حیدر آباد چلے گئے تھے۔ میں بھی وہاں گیا تھا۔ علی شبر حاتمی مرحوم انھیں بے حد عزیز تھے۔ ایک دن بابائے اُردو کو معلوم ہوا کہ علی شبر کو بخار آگیا ہے تو ایسے بے چین ہوئے کہ دن میں تین بار دیکھنے گئے۔ اور رات کے وقت کھانا بھی نہ کھا سکے۔ حالانکہ علی شبر کو معمولی سا بخار تھا۔ کوئی بات گھبرانے کی نہ تھی۔ اور یہ بھی دیکھا کہ انھوں نے علی شبر کو ایک کتاب لانے کو کہا، لیکن وہ بھول گئے اور خالی ہاتھ آئے، تو اتنا خفا ہوئے کہ جس کی حد نہیں۔ بے چارے کو اتنا برا بھلا کہا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شاید کوئی دوسرا ایسی باتیں علی شبر سے کہتا تو وہ قطع تعلق کر کے چلے جاتے۔ لیکن وہ سنتے رہے۔ بابائے اُردو نے اس ذرا سی غلطی پر اتنی ڈانٹ پلائی کہ طبیعت اُکتا گئی۔

دُوسری طرف وہ بے حد نرم دل تھے۔ ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ بابائے اُردو نے حیدرآباد سے چار ہزار روپوں کا ایک چک دلی بھیجا، انجمن کے اخراجات کے لیے۔ چک ایک صاحب کو دے دیا کہ رجسٹرڈ پوسٹ سے بھیج دیں۔ لیکن وہ چک دفتر تک پہنچا ہی نہیں۔ بینک سے پوچھا گیا۔ معلوم ہوا کہ چک تو بھُن چکا۔ بات چھپی نہیں رہی۔ بابائے اُردو کو معلوم ہوگیا کہ کس نے یہ کام کیا اور ان صاحب نے بھی اقرار کر لیا اور بتایا کہ انتہائی ضرورت کے عالم میں انھوں نے ایسا کیا۔ بابائے اُردو کا غصہ بالکل ختم ہوگیا۔ انھوں نے یہ رقم اپنی جیب سے ادا کردی۔ دو چار آدمی جو اس واقعے کو جان گئے تھے، انھیں تاکید کردی کہ کبھی کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کریں۔

بابائے اُردو اصول پرست انسان تھے۔ ان کی عادتیں بھی بندھی بندھائی تھیں۔ روزانہ کے معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ چار بجے صبح وہ اٹھ جاتے تھے اور مُنہ ہاتھ دھو کر سیر کو نکل جاتے تھے۔ پانچ چھ میل ٹہلنے کے بعد سورج نکلتے نکلتے واپس آجاتے تھے۔ پھر نہانے کے بعد ناشتہ کرنے بیٹھ جاتے تھے۔ ان کا ناشتہ ہمیشہ ایک سا رہا۔ دو توس دو انڈے اور چائے کی دو پیالیاں۔ اس کے بعد حقہ اور اخبار بینی۔ جب تک وہ دلّی میں تھے مجھے یاد ہے کہ دلّی سے نکلنے والے سارے اخبارات خریدتے تھے۔ اُردو اور انگریزی ہی کے نہیں ہندی کے بھی۔ اور سارے اہم حصّے پڑھ لیتے تھے۔ اس کے بعد کام کرنے بیٹھ جاتے تھے۔ حقہ پیتے جاتے اور کام کرتے جاتے تھے۔ ایک بجے دن تک کام اور اس کے بعد آرام کرتے تھے۔ پھر ساڑھے تین بجے چائے۔ چائے کے ساتھ پاپڑ ضرور ہوتے تھے۔ وہ ہاپڑ کے رہنے والے تھے جہاں کے پاپڑ سارے ہندوستان میں آج بھی مشہور ہیں۔ دن کا کھانا نہیں کھاتے تھے لیکن اُن کے ہاں کھانا ضرور پکتا تھا۔ دوسرے لوگ کھانا کھاتے تھے۔ وہ بڑی پابندی سے کھانے کی میز پر آتے اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھتے اور باتیں کرتے تھے لیکن رات کا کھانا ساڑھے سات بجے تک ختم کر لیتے تھے۔ غذا برائے نام تھی۔ دو تین پھلکے، شوربہ اور سبزی۔ گوشت پابندی سے پکتا تھا لیکن ایک دو ٹکڑے سے زیادہ نہیں کھاتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ اتنا کم کھا کر کیسے رہتے ہیں۔

دن کا کھانا نہ کھانے کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ چھوٹا ناگ پور اُردو مرکز کی سرگرمیاں دیکھنے بابائے اُردو رانچی آئے میں نے اُن کے قیام کا انتظام اپنے ایک رشتے دار بزرگ خان بہادر سید بشیرالدین احمد کے ساتھ کیا۔ وہ ان دنوں بہار اڑیسہ و سی پی پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے۔ نہایت وضع دار اور مہذب بزرگ تھے۔ انھیں بابائے اُردو کو اپنے ساتھ ٹھہرا کر بڑی خوشی ہوئی۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ یہ کہا ہی نہیں کہ بابائے اُردو دن کے وقت کھانا نہیں کھاتے۔ چنانچہ اُن کے کھانے کا خاص طور سے اہتمام کیا گیا۔ وقت پر بشیرالدین صاحب دفتر سے آگئے۔ اور خود کھانے کے لیے بلائے گئے۔ بابائے اُردو ساتھ آکر میز پر بیٹھ گئے۔ بشیرالدین صاحب نے فرمایا۔ بسم اللہ! تو بابائے اردو نے کہا میں بیٹھا ہوں، آپ شروع کریں۔ میں تو دن کو کھانا کھاتا ہی نہیں۔ بشیرالدین صاحب ہنس پڑے اور بولے کھانا تو آپ کے لیے پکا ہے۔ میں دن کو کھانا نہیں کھاتا۔ پھر دونوں خوب ہنسے۔ مجھے بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔

بابائے اُردو اپنے سارے کام اُردو میں کرتے تھے لیکن انگریزی زبان پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اگرچہ شاید ہی وہ باتوں میں انگریزی کا کوئی لفظ بھی استعمال کرتے ہوں، عام طور پر لوگ یہی سمجھتے تھے کہ وہ انگریزی پڑھتے تو ضرور ہیں لیکن شاید لکھنا اور بولنا اُن کے لیے مشکل کام ہوتا۔ لیکن ایسی بات نہ تھی جب وہ انگریزی بولنے کی ضرورت محسوس کرتے تو بولتے تھے۔ جب وہ رانچی گئے تھے تو راستے میں

ایک مخیر بزرگ سید تفضل کریم نے انھیں جمشید پور بلایا۔ اور ایک اچھی رقم انجمن کو دی۔ جمشید پور میں آندھرا پردیش والوں کی ایک ساجی انجمن ہے۔ آندھراوالے اکثر اُردو جانتے ہیں۔ ان لوگوں نے انھیں اپنی انجمن میں دعوت دی۔ بابائے اُردو نے منظور کرلیا، لیکن ٹھیک وقت پر ان لوگوں نے فرمائش کردی کہ سارے لوگ اُردو نہیں جانتے۔ اس لیے انگریزی میں تقریر کریں ۔۔ بابائے اُردو سوچ میں پڑ گئے لیکن پھر انھوں نے انگریزی میں تقریر شروع کی اور لگ بھگ ایک گھنٹے تک بولتے رہے۔ اس موقع کے علاوہ اور کبھی میں نے انھیں انگریزی میں تقریر کرتے نہیں سنا تھا۔ مجھے کیا، بہت سے لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی، گرچہ خود انھوں نے تقریر کرنے سے پہلے معذرت کرلی تھی کہ "انگریزی میں بولنے کے عادی نہیں ہیں۔

انجمن ترقی اُردو کا دفتر ارباب علم وادب کا مرکز تھا۔ پنڈت کیفی اور مولانا محمود شیرانی تو وہاں مستقل رہتے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا دن گزرتا ہو جب ایک دو مہمان وہاں نہ آتے ہوں۔ سارا خرچ بابائے اُردو اپنی جیب سے کرتے تھے۔ میں نے ایک بار دبی زبان سے کہا کہ آپ کے حالات اجازت دیتے ہیں، اور آپ تنخواہ لیے بغیر کام کرسکتے ہیں، بلکہ مہمانوں کی خاطر بھی کرتے ہیں۔ اس طرح انجمن کے سکریٹری کا ایک معیار بن گیا ہے، لیکن نہ جانے آپ کے بعد سکریٹری کون بنے گا۔ اور اس کی مالی حالت کیسی ہوگی۔ اور وہ آپ کی روایت باقی رکھ بھی سکے گا یا نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنی زندگی میں سکریٹری کا الاؤنس مقرر کردیں اور مہمان خانے کا بھی اور اپنی زندگی میں شروع کردیں۔ وہ مسکرائے اور بولے، تم بات تو ٹھیک ہی کہتے ہو۔ لیکن میری زندگی بھر اسے اسی طرح چلنے دو۔ میں اپنی وضع کیوں بدلوں۔



بابائے اُردو اور عبدالرحمان صدیقی ۱۹۴۳ء کی ایک تصویر جو جناب سہیل عظیم آبادی نے اتاری۔

بابائے اُردو کا زیادہ وقت مطالعے میں گزرتا تھا۔ یوں تو ان کا اصل میدان تحقیق تھا اور مسودوں کے مطالعے میں زیادہ وقت گزارتے تھے لیکن نئی کتابیں اور رسالے بھی پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے اور اَدب کی رفتار سے اچھی طرح واقف تھے اور ہر لکھنے والے کے بارے میں اپنی جچی تلی رائے رکھتے تھے۔ نئے لکھنے والوں سے انھیں بڑی محبت تھی۔ ان کی ہمّت افزائی کرتے تھے اور انھیں عزیز رکھتے تھے۔ مجاز کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا اور وہ دلی میں تھے، جہاں بیٹھ جاتے، باتیں شروع کر دیتے تھے۔ اکثر ایسی باتیں کہ جن کا سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا تھا انھوں نے انجمن میں آنا شروع کیا۔ آکر بابائے اُردو کے پاس بیٹھ جاتے اور باتیں شروع کر دیتے۔ انھیں سخت الجھن ہوتی مگر کبھی ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا، جس سے مجاز کو رنج پہنچے۔ اسی زمانے میں راچی سے میں آگیا۔ بابائے اُردو نے فرمایا اور بڑے دُکھ کے ساتھ کہ مجاز کا ذہنی توازن ان دنوں ٹھیک نہیں اور بہتر ہے کہ یہ اپنے گھر چلے جائیں۔ انھوں نے خود روپے دیئے کہ لکھنؤ بھجوانے کا سامان کردوں۔ مجاز کی بربادی کا انھیں بے حد رنج تھا اور جب بھی ذکر کرتے تو بڑے دُکھ کے ساتھ۔

خیالات کے لحاظ سے بابائے اُردو بڑے ترقی پسند تھے لیکن وہ قدامت اور ترقی پسندی کا خوبصورت امتزاج چاہتے تھے۔ وہ نہ ہر قدیم چیز کے مداح تھے اور نہ ہر نئی چیز کو دیکھ کر مُنہ ناک بناتے تھے۔ بلکہ ندرت اور جدّت دونوں کو وہ تنقیدی نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ اور جو اچھی چیز جہاں ملتی اسے قبول کرتے۔ ترقی پسندی کا مفہوم اُن کی نظر میں یہ ہرگز نہ تھا کہ جتنی نئی چیزیں ہیں وہ اچھی ہیں اور پرانی چیزیں بری۔ یہ نظریہ اُن کے خیال میں نظریہ نہیں بلکہ خبط تھا۔

بابائے اُردو میں ایک بڑی بات یہ تھی کہ خواہ کیسا ہی ہنگامی موقع کیوں نہ ہوتا، وہ دھارے میں نہیں بہتے تھے بلکہ زیادہ سنجیدہ بن جاتے اور حالات پر غور کر کے کوئی فیصلہ کرتے تھے۔

باتیں تو اتنی ہیں کہ ختم ہونے کو نہیں آتیں۔ میں نے صرف اُن باتوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے، جن سے اُن کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک واقعہ یہ ہے جو ہر لکھنے والے کے لیے سبق ہے اور خاص کر نئے لکھنے والوں کے لیے۔ ایک رات وہ کچھ لکھنے میں مشغول تھے۔ جب وہ لکھتے ہوتے تو کوئی اُن کے پاس جا نہیں سکتا تھا۔ مجھے ایک بات دریافت کرنی تھی۔ گیا اور انھیں مشغول دیکھ کر لوٹ آیا اور کھڑا انتظار کرنے لگا، کہ وہ فارغ ہوں تو دریافت کروں۔ دیکھا کہ وہ کچھ لکھتے لکھتے رُک گئے اور سوچنے لگے۔ انھوں نے کچھ سوچا اور لکھا پھر لکھ کر کاٹ دیا اور سوچنے لگے۔ پھر لکھا اور کاٹا۔ اس طرح کچھ لکھتے اور قلم زد کرتے گئے۔ آخر انھوں نے قلم بند کر کے رکھ دیا اور کرسی چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے جن لوگوں کو بابائے اُردو کی تحریریں دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ لکھ کر کاٹتے کم تھے۔ اُن کی تحریر میں بڑی روانی ہوتی تھی، اور کچھ لکھ کر کاٹنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ بابائے اُردو کمرے سے نکل کر میدان میں آگئے اور ٹہلنے لگے۔ میں بھی ساتھ ہولیا اور ٹہلتا رہا۔ اپنی باتیں ختم کر کے میں نے بڑی ہمت کر کے اُن سے پوچھ ہی لیا کہ آپ آخر لکھنا چھوڑ کر کیوں آگئے؟ وہ بڑی سادگی سے بولے "لکھ نہیں سکا"۔ پھر خود ہی اس کی صراحت کردی "ایک جملے کو کئی بار کئی طرح سے لکھا اور ہر بار یہی محسوس ہوا کہ جو میں لکھنا چاہتا ہوں ویسا یہ جملہ نہیں بن سکا اور طبیعت الجھ گئی"۔ انھوں نے بتایا کہ پہلے بھی ایک دو بار ایسا تجربہ ہو چکا ہے کہ جس طرح بات کہنی چاہی ہے ویسی جملوں میں ادا نہ ہوسکی۔ لکھنے والے کے لیے یہ وقت بڑے کرب کا ہوتا ہے۔ جب الفاظ اس کا ساتھ نہ دیں۔ واقعی یہ بڑا ہی کربناک تجربہ ہے جو ہر لکھنے والے کو پیش آتا ہے۔

بابائے اُردو کی مجھ پر بے انتہا عنایتیں تھیں ۔ میں چھوٹا ناگ پور کے روی باسیوں میں اُردو کی اشاعت کا کام کر رہا تھا ۔ ملک کی تقسیم نے سارے پروگرام کو درہم برہم کر دیا ۔ ان دنوں انھوں نے مجھے بہت سے خطوط لکھے جو میرے پاس محفوظ ہیں ۔ انشاءاللہ موقع ملتے ہی ان خطوں کو کتابی شکل میں شائع کر دوں گا ۔ ان کا آخری خط ہسپتال سے آیا تھا جو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا ۔ دستخط ان کے ہیں لیکن وہ بھی کچھ خراب ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ میں طاقت باقی نہیں رہی تھی ۔ اُن کے خطوط اُن کی زندگی اور شرافت کا آئینہ ہیں ۔ آخری خط جس کا میں نے ذکر کیا نہ جانے ماہ نامہ" ماہ نو" میں کس طرح شائع ہوگیا ، اس خط سے اُن کی شرافت اور نیک نفسی ظاہر ہوتی ہے میں نے اُن خطوط کی اشاعت کی اجازت چاہی تھی جو انھوں نے مجھے لکھے تھے ۔ جب میں نے ماہ نامہ "تہذیب" جاری کیا تھا اور اُن خطوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی تو انھوں نے منع کر دیا تھا لیکن میرے اصرار پر اجازت دی تو اس شرط کے ساتھ کہ اگر کسی شخص کے لیے کوئی دل آزار جملہ لکھا ہو تو اسے نکال دیا جائے ۔

اگر واقعات لکھتا جاؤں تو ختم ہونے کو نہ آئیں ۔ اگر کبھی موقع ملا تو لکھوں گا ۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے لوگ صدیوں کے بعد اس دُنیا میں آتے ہیں ۔



(ماسکو (روس) میں یوم بابائے اُردو ۔ سفیر پاکستان جناب بلاکی اور پروفیسر غفوراف

سید ہاشم رضا

عَبدُالحق

زبانِ خلق کے خدمت گزار عبدالحق
ادب کے عابدِ شب زندہ دار عبدالحق

روش روش نکھر آئی ہے باغ اردو کی
خزاں رسیدہ چمن کی بہار عبدالحق

کبھی شراب سے مطلب رہا نہ شاہد سے
عروسِ فن سے ہوئے ہمکنار عبدالحق

کچھ اور گیسوئے اردو کو تابدار کیا
بہت سے چھوڑ گئے شاہکار عبدالحق

کبھی دکھن میں پھرے اور کبھی گئے سرحد
اٹھائے خدمتِ اردو کا بار عبدالحق

مہاسبھا سے بھڑے اور کانگرس سے لڑے
کچھ ایک بار نہیں، بار بار عبدالحق

جہاں کہیں بھی پڑی ضرب فرق اردو پر
وہاں پہنچ گئے دیوانہ وار عبدالحق

ولی کے دورِ معلیٰ سے دورِ حاضر تک
ہر ایک دور کی سمجھے پکار عبدالحق

سنیں انھوں نے صدائیں انیس و غالب کی
بڑے بڑوں کے بنے رازدار عبدالحق

ندائے حالی و آزاد و داغ و حسرت پر
کھنچے چلے گئے بے اختیار عبدالحق

بنا گئے رخ اردو کو مثلِ آئینہ
مٹا کے داغ، ہٹا کر غبار عبدالحق

زہے نصیب کہ محسن اسی کے کہلائے
کہ جس کے حسن پہ خود تھے نثار عبدالحق

کہیں کی پوچھئے، کرتے تھے بات اردو کی
سدا نکال کے پہلو ہزار عبدالحق

وہیں پہ ڈال گئے داغ بیل خدمت کی
جہاں پہ بیٹھ گئے باوقار عبدالحق

دیارِ پاک میں اس کی حیات نو کے لئے
یہیں پہ آ گئے انجام کار عبدالحق

دیا تھا قائدِ اعظم نے صرف اردو کو
وہ رتبہ جس کے تھے امیدوار عبدالحق

عمل نہیں ہوا قائد کے قول فیصل پر
اسی سبب سے رہے بیقرار عبدالحق

خدا کرے کہ پھر اردو کا بول بالا ہو
مزار میں سہی، پائیں قرار عبدالحق

مولوی محمد بیگ مرحوم



مقدماتِ عبدالحق

سقوط حیدرآباد کے بعد وہاں سے جن لوگوں نے پاکستان ہجرت کی ان میں مولوی محمد بیگ صاحب کو ایک منفرد حیثیت حاصل تھی۔ وہ حیدرآباد کی تہذیب و ثقافت، شائستگی و شرافت اور وضعداری کا ایک نمونہ تھے۔ وہ کردار، فرض شناسی، دیانت، حسنِ اخلاق اور اعلیٰ انسانی خصائل کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ حضرت غفران مکان رحمۃ اعلیٰ حضرت آصف جاہ کے زمانۂ حکومت میں محمد بیگ صاحب سلک ملازمت میں داخل ہوئے اور تحصیلداری جیسے وقیع عہدے پر مامور کئے گئے۔ کم و بیش چالیس پینتالیس سال وہ حیدرآباد کی حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ ایسے عہدوں پر جنہیں عرف عام میں "سونے کی کان" سے تعبیر کیا جاتا تھا لیکن کیا مجال کہ محمد بیگ صاحب کا دامن ذرا بھی ملوث ہوا ہو۔ عہدے دارانِ سرکاری میں ذہانت کا اس سے بہتر نمونہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ وہ آخر عمر میں اول تعلقداری یا کلکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور اس کے بعد بھی انھیں مہاراجا کشن پرشاد کی جاگیرات کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا اور یہ انتخاب ان انگریز عہدے داروں نے کیا تھا جو محمد بیگ صاحب کی دیانت اور احساس فرض سے بے حد متاثر تھے۔

محمد بیگ صاحب نے حیدرآباد کی مشہور درسگاہ "دارالعلوم" سے اپنی تعلیم کی تکمیل کی تھی، ان میں ابتدا ہی سے علم و ادب کا نہایت نکھرا ہوا ذوق تھا۔ حیدرآباد کی علمی محفلوں اور حیدرآباد کی ایجوکیشنل کانفرس کے یہ روح رواں تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے ان کے گہرے مراسم تھے اور حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کو مستحکم مالی بنیادوں پر قائم کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ابھی انجمن ترقی اردو

نے کوئی اشاعتی کام باقاعدہ شروع نہیں کیا تھا کہ مولوی بیگ صاحب نے اپنے ذاتی خرچ سے "مقدمات عبدالحق" مرتب کر کے شائع کی اور اس کے سارے حقوق انجمن ترقی اردو کو دے دیئے۔ محمد بیگ صاحب کو سرکاری مصروفیتوں نے کوئی علمی کام کرنے کی مہلت نہیں دی لیکن مشہور ادیبوں اور مصنفین سے ان کے تعلقات آخر وقت تک قائم رہے۔ مولانا عبدالحلیم شرر، نیاز فتحپوری، بابائے اردو، خواجہ حسن نظامی، امجد حیدر آبادی، حبیب الرحمان شروانی وغیرہم سے ان کے شخصی مراسم تھے اور مراسلت کا سلسلہ جاری تھا۔ سرکاری ملازمت کے تعلق سے انہوں نے اپنی ایک خود نوشت سوانح عمری لکھی تھی جس میں اپنی ابتدائی ملازمت سے پاکستان ھجرت کرنے تک کے واقعات شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ ان کی اولاد خصوصاً ان کے لڑکے جو سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اس کی اشاعت کا انتظام کر رہے ہیں۔ اس سے حیدر آباد کی زندگی کے بہت سے گوشے منظر عام پر آئیں گے جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ ذیل میں اس خود نوشت کا ایک حصہ شائع کیا جاتا ہے۔

(بدر شکیب)

مولوی عبدالحق بی۔ اے اپنے ذوقِ علم اور انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد اور بابائے اردو کے لقب سے ملقب ہونے کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کر چکے ہیں مولوی صاحب موصوف حیدر آباد میں مختلف سرکاری خدمات پر فائز رہتے ہوئے متعدد علمی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ علاوہ بریں آل انڈیا انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے۔ اس انجمن کا مرکزی دفتر اورنگ آباد (دکن) میں ایک طویل عرصہ تک رہا۔ بعد ازاں دہلی میں منتقل ہو گیا تھا۔ حکومت حیدر آباد ایک گراں قدر رقم (چالیس ہزار روپیہ) سالانہ بطور امداد دیا کرتی تھی۔ قیام انجمن کے ابتدائی زمانے میں انجمن کے اغراض اور مقاصد کی اشاعت و فراہمی اراکین کے سلسلے میں مولوی صاحب موصوف سے میرا ربط غالباً ۱۳۲۴ف میں قائم ہوا تھا اور باہمی مراسلت بھی ہوتی رہی۔ جو متعدد خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اگر آئندہ مولوی صاحب کی کوئی سوانح حیات کسی نے مرتب کی تو یہ خطوط سوانح نگار کے کام آ سکتے ہیں۔ ان خطوط سے مولوی صاحب کی جدوجہد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ حیدر آباد میں مولوی صاحب کے متعلق موافق و مخالف آرا موجود ہیں۔ اس سلسلۂ بیان میں ان کا تذکرہ غیر ضروری ہے۔ یہاں تو صرف مولوی صاحب کی قابل تعریف علمی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے متعدد مشہور مصنفین و مولفین کی کتابوں پر مقدمات لکھے ہیں۔ یہ مقدمات مختلف اعتبارات سے بہت ہی قابل قدر اور دلچسپ ہیں خصوصاً انتقادی اصولوں کا کافی سرمایہ ان میں موجود ہے۔ مجھے چند کتابوں میں مقدمات پڑھنے کے بعد خیال پیدا ہوا کہ ایسے تمام مقدمات کو ایک جگہ کر کے شائع کیا جائے تو نہ صرف ایک علمی خدمت انجام پائے گی بلکہ زبان اردو میں طرز مقدمہ نویسی اور انتقادی اصولوں کو معلوم کرنے کا قیمتی مواد بھی فراہم ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے ان کتابوں میں سے جن پر مقدمات لکھے گئے تھے۔

مقدمات کی نقلیں لینے کا کام شروع کر دیا۔ نقول مرتب کرنے میں ایک کرم فرما عابدی صاحب نے بھی قابل شکریہ مدد دی۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کن کن کتابوں پر مقدمات لکھے گئے ہیں، میں نے مولوی صاحب موصوف سے مراسلت بھی کی ہے۔ انھوں نے چند کتابوں کے نام بتائے اور بعض مقدمات کی نقول بھی فراہم کر دیں۔ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ خود انھیں یاد نہیں رہا کہ کن کن کتابوں پر مقدمات لکھے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ مولوی صاحب موصوف اور سید ہاشمی صاحب فرید آبادی کی رہنمائی میں تلاش و جستجو کے بعد مقدمات کی کافی تعداد فراہم کر لی گئی اور "مقدمات عبدالحق" کے نام سے کتاب شائع کرنے کا تہیہ کر لیا گیا۔

سلسلۂ بیان میں مولوی صاحب کے خطوط میں سے ایک خط مورخہ یکم خورداد ۱۳۳۵ف کی نقل یہ واضح کرنے کے لئے درج ذیل کی جاتی ہے کہ وہ خود اپنے بعض مقدمات کے بارے میں اپنی کیا رائے رکھتے ہیں۔ نیز اس خط میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ مولوی صاحب موصوف نے مولانا شبلی مرحوم کے خطوط موسومہ زہرہ بیگم و عطیہ بیگم فیضی کی اشاعت پر بڑی خوبی سے اپنے نظریئے کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ اس بنا پر کہ میں نے اپنے خط میں مشورہ دیا تھا کہ ایسے خطوط کی اشاعت مولانا شبلی کے تقدس اور مرتبے کے خلاف ہوگی۔

اورنگ آباد (دکن) ۲ر خورداد ۱۳۳۵ف

شفیق و مکرمی زاد لطفہ

عنایت نامہ اور اس کے ساتھ چار مقدموں کی نقل پہنچی جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے چاہا تھا اور کسی عنوان سے عرض بھی کیا تھا کہ آپ معرکہ مذہب و سائنس کو اس مجموعے میں داخل نہ فرمائیں لیکن آپ نہ مانے۔ تعجب ہے کہ یہ مقدمہ آپ کو پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ میرے نوٹ تھے جو میں نے مقدمے کے لئے تیار کئے تھے۔ ظفر علی خاں صاحب کو آپ جانتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں جلد بازی ہے۔ وہ آئے اور لے کر چل دیئے۔ اس کے بعد دفعۃً ان کا یہاں سے جانا ہوا۔ میں نے بہت کہا کہ اسے واپس کر دو تو میں اصل مقدمہ جو لکھنا چاہتا ہوں لکھ دوں گا مگر انھوں نے کاغذات واپس نہ کئے اور یہ خیال کیا کہ شاید میں نہ لکھوں یا کاغذات تلف کر دوں اور آخر یہی چھپ گئے۔ مجھے یہ مقدمہ اس لئے بھی پسند نہیں کہ اگر میں اب لکھتا تو وہ کچھ اور ہوتا۔ یہ وجوہ تھے کہ میں چاہتا تھا کہ یہ مقدمہ اس مجموعے میں شائع نہ ہو۔ مگر اب آپ کو روک بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ شائع ہو چکا ہے لیکن اگر کبھی مجھے ان مقدمات کے چھاپنے کی توفیق ہوتی تو میں اسے کبھی شامل نہ کرتا۔ بہر حال اب آپ کی جو رائے ہو۔ میں دیکھ کر بھیجے دیتا ہوں۔

مقدمۂ کلام میر کو میں از سر نو لکھنے والا ہوں۔ اس میں کچھ تغیر و تبدل کی ضرورت ہے۔

اس زمانے میں میں نے ایک اور مقدمہ لکھا ہے جو فرہنگ اصطلاحات علمیہ پر ہے۔ یہ کتاب انجمن کی طرف سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ میں چاہتا تھا کوئی اور صاحب لکھ دیتے۔ ایک صاحب نے وعدہ بھی کیا تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا اور وعدہ وفا نہ ہوا۔ جب دو روز رہ گئے تو ناچار میں نے خود لکھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ اس کتاب کی کچھ جلدیں جشن جوبلی علی گڑھ میں لے جاؤں۔

فوراً لکھا اور چھپوایا۔ راتوں رات کچھ کتابوں کی جلدیں بنوائیں اور جوبلی میں ساتھ لے گیا۔ آپ فرمائیں تو کتاب بھیج دوں۔ اسے ملاحظہ فرمالیجئے اگر مناسب خیال فرمائیں تو شریک کردیجئے۔

کیوں صاحب آپ نے ٹکٹ پھر بھیجے۔ آخر آپ مجھے کیوں باربار نادم کرتے ہیں۔ آپ بھیجتے رہیئے اور میں واپس کرتا رہوں گا۔ اس سے نتیجہ؟

مولانا شروانی کے عزم حج کی اطلاع سے مجھے بھی کھٹکا ہوا تھا کہ اب مقدمے کا خدا حافظ لیکن ان کے خط سے جس کی نقل آپ نے بھیجی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور لکھیں گے لیکن یہ بھی آپ سے کہے دیتا ہوں کہ وہ بہت دیر لگائیں گے۔

تعجب ہے کہ مقدمہ تمدن ہند آپ کو اب تک نہیں ملا۔ اڈیٹر الناظر کے پاس ضرور ہوگا۔ ان کے پاس اپنے رسالے کی تمام جلدیں مکمل موجود ہیں وہ چند روز کے لئے مستعار دے سکتے ہیں یا نقل کرواکر بھیج سکتے ہیں۔ میں ہاشمی صاحب کو لکھتا ہوں کہ وہ پھر لکھیں اور تاکید کرکے منگوالیں۔

آپ عطیہ بیگم کے خطوط سے متردد نہ ہوں۔ اس سے مولانا شبلی کی کچھ منقبت نہیں ہوتی۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ نرے خشک ملّا یا مولوی ہی نہ تھے بلکہ لطیف انسانی جذبات بھی رکھتے تھے۔ وہ شاعر تھے اور عاشق مزاج بھی تھے اور یہ انسان کے لئے عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ اس سے ان کی وقعت اور بڑھنی چاہیے۔ لوگوں کو سمجھنے اور بدگمانی کرنے سے کچھ نہیں ہوتا یہ رائیں فوری ہوتی ہیں۔ صحیح فیصلہ زمانے کے ہاتھ ہے۔

ملاقات کے متعلق ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اعظم الکلام اور تمدن ہند کے مقدموں میں ایک حصہ مصنفین کے ذاتی حالات کا ہے۔ یہ حصہ زیادہ قابل قدر ہے کیونکہ ان دونوں کے حالات اس نہج سے کہیں نہیں ملیں گے اور ان کے کاموں کو سمجھنے کے لئے ان کا ہونا ضروری ہے۔ بعض صاحبوں نے ان حالات کی بہت قدر کی تھی کیونکہ وہ اس طرح لکھے گئے ہیں کہ ان مصنفین کی سیرت کے پڑھنے والوں کو صحیح اندازہ ہوجاتا ہے۔ اگر آپ نامناسب نہ خیال کریں تو یہ حصہ بھی ضرور شریک کردیجئے ورنہ جو آپ کی رائے ہو مجھے کوئی اصرار نہیں۔ اس کتاب کی ترتیب وغیرہ آپ کی رائے اور ذوق پر موقوف ہے۔

نیازمند

عبدالحق

مجمعہ مقدمات پر کسی مشہور شخصیت سے مقدمہ لکھوانے کا مرحلہ بھی درپیش تھا۔ میں نے مولوی عبدالحلیم شرر کو اس باب میں خط لکھا تھا۔ ان کی پیرانہ سالی اور علالت کا زمانہ تھا۔ انھوں نے یہی عذر ظاہر کیا تھا اور بعد ازاں مولانا حبیب الرحمان صاحب شروانی (صدر یار جنگ) سابق صدر الصدور حیدرآباد دکن کی خدمت میں استدعا کی گئی۔ مولانا نے جواباً جو عنایت نامہ ارسال کیا یہاں اس کی نقل کردی جانا بہتر ہوگا۔

حبیب گنج، ڈسٹرکٹ علیگڑھ۔ ۲۷ محرم الحرام سنہ ۱۳۵۰ھ

مکرم کرم فرما جناب مرزا صاحب

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ممنون فرمایا۔ ایک علمی خدمت باعثِ نگارش ہوئی۔ یہ مزید کرم ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب کی ادبی خدمات کا میں مدت سے معترف ہوں۔ خصوصًا مقدمہ نگاری میں سب سے پہلے موصوف کے مقدمات میرے واسطے چراغِ ہدایت ہوتے تھے۔ اس لئے مقدمات پر مقدمے کی تحریر ایک گونہ شکر احسان ہوگی بشرطیکہ سرانجام ہوسکے۔ مطبوعہ مقدمات کا ایک نسخہ عنایت ہو۔ بعد مطلب واپس حاضر ہوگا:

آج کل خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی مرحوم کے فارسی کلیات کا مقدمہ زیر تحریر ہے اس سے فارغ ہو کر آپ کے حکم کی تعمیل انشاءاللہ ہوگی

امید کہ آپ مع الخیر اپنے مفید مشاغل میں مصروف ہوں گے۔ بحمد اللہ میں بھی بعافیت ہوں۔

نیازمند۔ صدر یار جنگ

بعدازاں مولانا نے اپنے عنایت نامے مورخہ ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء میں مقدمہ ارسال فرماتے ہوئے تحریر فرمایا کہ۔

"بہ تعمیلِ ارشاد مقدمہ پیش ہے۔ کوشش تعمیل کی کی گئی۔ کامیابی کہاں تک ہوئی میں نہیں کہہ سکتا۔"

مختصر یہ کہ کوئی پانچ چھے سال کی کوششوں کے بعد جو مختلف رکاوٹوں پر مشتمل رہیں یہ کتاب مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے دو جلدوں میں چھپ گئی۔ پہلی جلد چھپ جانے کے بعد مکتبے نے ایک جلد مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی تھی۔ اسکے پہنچنے کے بعد مولوی صاحب نے جو عنایت نامہ میرے نام ارسال فرمایا تھا اس کی نقل بھی درج کر دینا مناسب ہوگا۔

"پنجارا روڈ۔ حیدرآباد دکن۔ مورخہ ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۳۳ء

شفیق مکرم زاد لطفہٗ۔ تسلیم

دو تین روز ہوتے مجھے مکتبۂ ابراہیمیہ سے مقدمات کا اوّل حصہ وصول ہوا۔ میں نے آپ کا دیباچہ اور شروانی صاحب کا مقدمہ پڑھا۔ آپ صاحبوں نے میری نسبت جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں، میں ہرگز اس کا مستحق نہیں ہوں۔ ایک معمولی مزدور ہوں لیکن آپ نے اپنی عنایت سے معمار بنا دیا ہے۔ یہ میں انکساری سے نہیں کہتا بلکہ امر واقعی ہے۔ ایسی حالت میں میں نہیں کہہ سکتا شکر کروں یا شکایت۔ یہ محض آپکی کریم النفسی اور مروت ہے جو آپ میری نسبت ایسا حُسنِ ظن رکھتے ہیں۔ ورنہ میں اپنی اور اپنے مقدمات کی حقیقت سے خوب واقف ہوں۔ میرے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ مقدمات کبھی اِس طرح کتاب کی صورت میں شائع ہوں گے۔ یہ صرف آپ کی قدر دانی ہے جس کی بدولت انھیں یہ دن نصیب ہوا۔

میں آج کل بے حد مصروف ہوں۔ علاوہ دوسرے کاموں کے لغات کا کام ایسا کٹھن ہے کہ مجھے پہلے اس کا اندازہ نہ تھا۔ اگرچہ مدد کے لئے پورا اسٹاف موجود ہے لیکن اس کی دشواریاں ایسی ہیں کہ بعض وقت ہمت جواب دے دیتی ہے۔ وقت کم ہے اور کام بہت اسلئے گوشہ نشین ہوگیا ہوں اور گزشتہ غفلت کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ اور ایک ایک منٹ کو بڑی کفایت شعاری سے صرف کرتا ہوں۔ امید کہ آپ بخیر و عافیت ہونگے

آپکا ممنون عبدالحق۔

مقدمات بصورت کتاب مرتب کرنے میں پانچ چھے سال کا طویل زمانہ گزر چکا تھا۔ مجھے اس کی فکر تھی کہ جلد چھپ جائیں میں نے مکتبہ ابراہیمیہ کو کتاب کے شائع کرنے پر آمادہ کیا۔ کسی منافع پر کوئی معاملت نہیں کی گئی۔ مقصود صرف علمی خدمت تھا۔ بلکہ کتاب چھپنے کے بعد اپنی طرف سے (۲۵) جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا گیا تھا جو پورا کیا گیا۔ ان دنوں میں ضلع نظام آباد کی اول تعلقداری (کلکٹری) پر متعین تھا۔ نظام ساگر مشہور پراجکٹ کی ترقیات کے غیر معمولی کاموں میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دیباچہ لکھنے کے لئے مطبع سے تقاضا ہو رہا تھا اور اس کے لکھنے کے لئے مستقر سے کچھ فاصلے پر جا کر قیام کرنا پڑا۔ الغرض اپنی مصروفیات کے باعث چھپائی وغیرہ کی نگرانی بذاتِ خود کرنے کے بجائے دوسروں کے ذمے کر دی تھی۔ بدیں وجہ کتاب اتنی خوبیوں کے ساتھ تیار نہ ہو سکی جو درکار تھیں، تاہم بجائے خود موزوں اور مجھے یہ اطمینان ہوا کہ یہ کام پورا ہو گیا۔

یہ دونوں جلدیں بہت مقبول ہوئیں اور تھوڑے عرصے میں مکتبے نے فروخت کر دیں۔ میرے پاس کی جلدیں تقسیم ہو گئیں۔ آخر میں صرف ایک ایک جلد باقی رہ گئی تھی۔ کسی نے مجھ سے جلد اوّل مستعار لی تھی۔ مجھے یاد نہ رہا کس نے لی تھی اور نہ لینے والے نے واپس کی۔ ممکن ہے کہ پاکستان میں کسی کے پاس یہ جلدیں ہوں یا حیدرآباد سے فراہم کی جا سکیں اور افادیت کے پیشِ نظر آیندہ پھر کوئی اڈیشن انجمن ترقیٔ اُردو کی جانب سے شائع ہو جائے یا بشرطِ استطاعت میں خود ایسا ارادہ کر سکوں۔

مکتوب بنام محمد بیگ مرحوم

مورخہ ۱۳ ر دسمبر ۱۹۵۴ء

شفیق مکرّم زاد لطفہٗ السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ پہنچ گیا تھا۔ جس کے ساتھ مقدمات کے متعلق میرا اور مولوی حبیب الرحمان خاں صاحب مرحوم کا خط بھی تھا۔ اس کا تہ دِل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن آپ نے اپنے زمانہ حیدرآباد کے حالات جو قلم بند کئے تھے ان کے دیکھنے کی مجھے بڑی تمنا ہے۔ آجکل کسی روز حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔ وہیں آپ کے سامنے بیٹھ کر دیکھ لوں گا۔ یا اگر آپ نے اجازت دی تو ایک دو روز کے لئے اپنے ساتھ لے آؤں گا۔

آج کل ایک دوست کی فرمائش پر نواب عماد الملک پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ بعض باتیں دریافت طلب ہیں ممکن ہے آپ سے مدد مل جائے۔ اس لئے جمعے کے روز ساڑھے چار بجے حاضرِ خدمت ہوں گا۔ زیادہ نیاز

خیر طلب۔ عبدالحق

"بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی اعلا خدمات کی یاد ہند و پاکستان میں لوگ آسانی سے فراموش نہ کر سکیں گے۔ خود میں نے اُن کی تحریروں سے اُدبیاتِ عالیہ کا درس لیا ہے۔ اُن کی نثر میرے لئے اور مجھ جیسے کئی اوروں کے لئے چراغِ راہ رہی ہے۔"

فراق گورکھپوری



محمد معین الدین دردائی

ایک عظیم انسان

عبدالحق صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بنگلے پر ہوئی تھی۔ میں اس وقت بی اے آنرز کا طالب علم تھا۔ رشید صاحب نے شام کی چائے پر عبدالحق صاحب کو مدعو کیا تھا مجھکو اور ابو اللیث صدیقی کو چونکہ رشید صاحب اپنے شاگردوں میں سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس نجی صحبت میں ہم دونوں کو بھی ان سے ملانے کیلئے بلا لیا تھا ــــــ سانولا رنگ، پروقار اور سنجیدہ چہرہ، محسن الملک جیسی سفید نورانی داڑھی، شیروانی پائجامہ اور پیشانی کی طرف جھکی ہوئی ترکی ٹوپی ــــ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا یہ صرف گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات تھی لیکن اس کم وقت میں بھی اردو زبان و ادب کے اس بڑے محسن کی عظمت اور بڑائی کا بہت گہرا اثر لے کر میں وہاں سے اٹھا۔

ایک سال بعد ۱۹۳۶ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے جب مجھکو اور لیث صاحب کو اردو ادب کے دو مختلف موضوعات پر تحقیقی مواد جمع کرنے کیلئے حیدرآباد بھیجا تو ہم لوگ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے ساتھ کئی مہینے ٹھہرے ڈاکٹر صاحب اس وقت بنجارہ ہل پر ایک نہایت ہی حسین، پرفضا اور شاندار بنگلے میں رہتے تھے اور ان کی شاندار زندگی دیکھکر میں متحیر ہو گیا تھا۔ دو تین ماہ انکے ساتھ رہنے کے بعد اس عظیم انسان کی بہت سی خوبیاں اور کچھ کمزوریاں بھی میرے سامنے آئیں ۱۹۳۸ء میں جب میں ان کے ساتھ انجمن ترقی اردو (دھلی) میں رہ کر ان کے زیر نگرانی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کر رہا تھا اور مجھے کئی سال ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تو ان کی علم دوستی، انسانیت، شرافت، فیاضی اور علمیت کا صحیح اندازہ مجھے اس وقت ہوا۔ میں نے انہیں اس زمانے میں بہت قریب سے دیکھا۔ ان کا دل صاف اور بے ریا تھا۔ وہ جس سے بگڑتے تھے۔ بلاخوف و رعایت اسکے منہ پر سب کچھ کہہ دیتے تھے اور جس پر اعتماد کرتے تو خود کو گویا اسکے حوالے کر دیتے تھے۔ انکی خفگی اور اعتماد دونوں بہت غضب کے ہوتے تھے اور کسی حد تک ضرر رساں بھی لوگ انکی اس طبیعت سے بہت ناجائز اور غلط فائدہ بھی اٹھا لیتے تھے۔ جس سے اکثر ان کی بدنامی ہو جاتی تھی اور آخر وقت میں تو وہ خود بھی اس کے شکار ہوئے جسکے باعث کچھ دنوں تک انکی زندگی میں بہت تلخیاں شامل ہو گئی تھیں۔ ان کی اس طبیعت کا ایک دو بار مجھے بھی تجربہ ہوا ہے۔

۱۹۴۸ء میں جب میں مشرقی پاکستان کے ایک ڈگری کالج میں معلم ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ میں مشرقی پاکستان کے ایک کالج

میں آگیا ہوں تو مجھے اردو بنگلا ڈکشنری کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اسے مرتب کرانیکی ہدایت کی میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا اور بڑی تندہی سے بنگلا زبان سیکھ رہا تھا۔ ان کا ایما پاتے ہی میں نے بنگلا زبان کے دو لائق اسکالرز کو اپنے ساتھ ملا کر تین آدمیوں کا ایک بورڈ بنالیا اور فوراً اسکی ابتدا کردی۔ دو برس تک یہ کام کرتا رہا اور وقتاً فوقتاً مسودہ بھیج کر ڈاکٹر صاحب سے مشورے بھی لیتا رہا۔ اور وہ پسند بھی کرتے رہے اور ہدایتیں بھی دیتے رہے۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں جب ایک ہزار اوراق پر مشتمل ڈکشنری مکمل ہوئی۔ اور میں نے اسے کراچی روانہ کیا تو ان پر بعض حاوی لوگوں نے جو دہلی میں میرے قیام کے دوران مجھ سے کبیدہ خاطر رہا کرتے تھے۔ اس ڈکشنری کو مسترد کرا دیا اور میرا ذاتی کئی ہزار روپیہ علاوہ میری شب و روز کی محنت کے رائگاں ہوا۔ اتفاق سے اس واقعے کے ایک دو ماہ بعد میں ایک مہلک مرض میں بیمار ہو کر باہر چلا آیا اور پھر پاکستان جانے کے لائق نہیں رہا۔

۱۹۵۴ء میں عبدالحق صاحب پر میرا ایک مضمون الحمرا لاہور میں چھپا تھا وہ مضمون اصل میں تو خلوص اور عقیدت کے جذبات کے تحت لکھا گیا تھا لیکن اظہار حقیقت کے طور پر اس میں بعض باتیں ایسی بھی لکھی گئی تھیں جو ڈاکٹر صاحب کو ناگوار گزرگئیں وہ مجھ سے خفا ہو گئے۔ ان کا غیض و غضب میں ڈوبا ہوا خط مجھے ملا تو میں سہم گیا۔ جواب میں میں نے انکو معذرت کا خط بھی لکھا۔ مگر ان کا دل صاف نہ ہوا۔ ان کی خفگی تو غضب کی ہوتی تھی کئی سال تک وہ مجھ سے خفا رہے اور خط و کتابت بند رکھی۔ آخر میں میرے ایک عزیز پروفیسر آرشد کاکوی مرحوم نے درمیان میں پڑ کر غلط فہمی دور کرائی۔

حد درجہ خشک اور سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی عبدالحق صاحب میں ظرافت بہت زیادہ تھی۔ نجی صحبتوں میں وہ کھل کر بولتے تھے۔ اور مزاح سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ رات کے کھانے پر وہ بہت بے تکلف ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب میز پر کھانا کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹنے لگے۔ عبدالحق صاحب انکی بغل میں تھے۔ جب وہ اپنی انگلی چاٹ چکے تو مولوی صاحب نے بڑی سنجیدگی سے اپنی انگلیاں بھی بڑھا دیں کہ انہیں بھی صاف کر دیجئے۔ کھانے کی میز پر سب لوگ ہنس پڑے اور وہ صاحب شرما گئے۔

عبدالحق صاحب میں اعلیٰ ظرفی بہت زیادہ تھی اور وہ ادیبوں اور اسکالروں کی حد درجے قدر و عزت کرتے تھے انکے رفقائے کار کو انکے ساتھ کام کرنے میں بارہا اس کے تجربے ہوتے رہتے تھے ایک دفعہ مجھے یاد ہے۔ ہندوستانی ڈکشنری کے ترتیب دینے میں میرے ساتھ ایک صاحب گوری سرن لال سریواستوا ام اے علیگ بھی کام کر رہے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ کام کرتے کرتے اکثر اپنے دارالمطالعے سے اٹھکر چائے پینے کسی ریستوران میں چلے جاتے تھے۔ انجمن ترقی اردو (دہلی) میں بعض اسکالرز کے درمیان کچھ چشمک بھی رہا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے اس واقعے کی رپورٹ عبدالحق صاحب سے کردی۔ مولوی صاحب حد درجہ کبیدہ اور منغض ہو کر بولے "میاں یہ علما اور ادیبوں کے کام کرنیکی جگہ ہے سرکاری دفتر نہیں ریسرچ کرنیوالے کلرک نہیں ہو سکتے۔ اس طرح کی پابندی میں اپنے رفقائے کار کے لئے پسند نہیں کرتا" شکایت کرنیوالے بزرگ کو بڑی خفت ہوئی۔

غرض وہ بعض کمزوریوں کے باوجود انسانی خوبیوں کے مجموعہ اور قرون اولی کے مسلمانوں کی سچی تصویر تھے۔ انکی سادگی اور معصومیت قابل رشک تھی وہ صرف سخی اور فیاض نہیں بلکہ جوادتھے مزدور تمند لینے سے تھک جائیں۔ لیکن وہ دینے سے نہیں گھبراتے تھے۔

اردو زبان و ادب کیلئے انہوں نے جو کچھ کیا وہ ناقابل فراموش ہے اور اردو دنیا انکے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

سید قدرت نقوی



مولوی عبدالحق کے لسانی افکار

مولوی عبدالحق نے ایک طویل عمر پائی اور انھوں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ ان کی شعوری زندگی اسّی سال کے لگ بھگ تھی۔ ان اسّی برسوں میں وہ زمانے کے انقلابات و حادثات سے نبرد آزما رہے۔ ان کی یہ نبرد آزمائی علم و عمل کے میدان میں تھی۔ اس صدی میں اتنا بڑا جنگ جو اور اتنا دلیر سپاہی شاید ہی کوئی گزرا ہو۔ بلاشبہ وہ دوسرے سرسید احمد کہلانے کے مستحق ہیں۔ یوں تو انھیں سرسید کا فیض صحبت اور ان کے ساتھ کام کرنے کا شرف بھی حاصل تھا، لیکن انھوں نے سرسید سے جو کچھ سیکھا وہ یہ تھا کہ اپنی زندگی کا ایک نصب العین بناؤ اور اسے حاصل کرنے میں لگ جاؤ، زندگی یہی ہے کہ راستے کے دریاؤں، پہاڑوں اور میدانوں کو سر کرتے چلے جاؤ، اپنے مقصد سے انحراف نہ کرو تاوقتیکہ موت تمھیں ناکارہ نہ بنا دے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بلاشبہ مولوی عبدالحق کی زندگی کا بھی ایک ہی نصب العین رہا اور مرتے دم تک وہ اس پر سختی سے قایم رہے۔ انگریز، ہندو، حکومت، افسران، وہ کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنے مقصد کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

مولوی عبدالحق کے مقصد کو سمجھنے کے لئے ہمیں اب سے پوری ایک صدی قبل کے حالات کا جائزہ لینا ہوگا اب ۱۹۶۷ء ہے اور ۱۸۶۷ء میں پہنچ کر ہم مولوی عبدالحق کے نصب العین کو سمجھ سکیں گے۔ ۱۸۶۷ء وہ یادگار سال ہے جس میں خود ہندوؤں کے ہاتھوں دو قومی نظریے کی بنیاد رکھی گئی۔ انگریزوں کی شہ پر بنارس کے ہندوؤں نے یہ مطالبہ کیا کہ اردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط جاری کیا جائے۔ مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں:-

"۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جاوے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا

اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ "انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے، آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے، میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا "اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔" میں نے کہا "مجھے نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

ہندوستانیوں کے اس اختلاف و افتراق میں انگریز کی دانشمندی کو بڑا دخل تھا۔ ۱۸۰۰ء میں انگریز نے حکومتی نظام چلانے کے لئے محسوس کیا کہ انگریزوں کو اردو تعلیم دی جائے۔ اس سلسلے میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا، اسی کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی خاطر داری میں سنسکرت اور ہندی کی سرپرستی بھی اسی فورٹ ولیم کالج میں شروع ہوئی اور یہیں اردو ہندی نزاع کی بنیاد اس طرح رکھی گئی کہ ہندی (اردو دیوناگری رسم الخط میں) کے اندر سنسکرت کے نامانوس اور ثقیل الفاظ داخل کئے جائیں اور عربی فارسی کے مستعمل، عام فہم الفاظ نکال دیئے جائیں۔ ادھر بنگالیوں کو شہ دی اور وہاں بھی سنسکرت رسم الخط میں بنگلا لکھنے کی تحریک کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی الفاظ کا اخراج اور سنسکرت الفاظ عمداً استعمال شروع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ ۱۸۳۷ء میں اردو کو سرکاری زبان بنا دیا گیا تھا لیکن بنگال میں جلد ہی اردو کی جگہ بنگالی کو دے دی گئی اور ۱۹۰۰ء میں یوپی میں بھی میکڈانل نے ناگری حروف کے استعمال کی سفارش کی تھی مگر لارڈ کرزن نے اس سفارش کے متعلق اپنے حکم میں حروف کا لفظ کاٹ کر زبان کا لفظ بنا دیا۔ اس طرح اردو پر وہ کاری ضرب لگائی گئی جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

۱۸۶۷ء سے ۱۸۹۸ء تک سر سید احمد نے اردو کی بقا احیا اور اس کے ارتقا کے لئے نہایت خلوص، مستعدی اور تن دہی سے کام کیا۔ ان کے مقابل، انگریز تھے اور ہندو۔ ہندو تحریک چلاتا، انگریز شہ دیتا اور پشت پناہی کرتا۔ غرض ۱۸۶۷ء سے لے کر آخر دم تک سر سید نے اردو کے لئے جو کوشش کی تھی، مولوی عبدالحق کی ان سب پر نظر تھی اور سر سید کی رفاقت میں کام کرنے کی وجہ سے انھیں اردو کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا انھوں نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا:-

"جس قوم کی کوئی ایک زبان نہیں وہ قوم نہیں اور جس ملک کی کوئی ایک زبان نہیں وہ ملک نہیں۔"

مولوی عبدالحق نے بھی سر سید کے نصب العین کو اپنایا اور اسی کو اپنا مقصد بنایا۔ یعنی اردو زبان و ادب کی خدمت۔ سر سید جو کچھ سوچا کرتے تھے اور جن امور کا اظہار کرتے تھے، مولوی عبدالحق بھی انھی کو مشعل راہ بنا کر کام کرنے کے منصوبے بناتے رہتے ہوں گے۔ مولوی عبدالحق کو بھی سر سید کے بعد اردو کی خدمت کرنے کا موقع بہت جلد مل گیا۔ وہ امور جو ان کے شعور اور لاشعور میں جاگزیں تھے ان کو بروئے کار لانے کے لئے حیدر آباد دکن جیسی اردو نواز مملکت میں انھیں ملازمت مل گئی۔ اپنی ملازمت کے دوران

یں انھوں نے اردو کی علمی سطح پر خدمت کی ۔ حیدرآباد دکن میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں ان کا بہت زیادہ ہاتھ تھا ۔ قدیم اردو کے مخطوطات کی تلاش اور ان کی اشاعت سے اردو کے مدفون خزانوں کو منظرِ عام پر لائے ۔ بہترین کتابیں لکھوائیں اور چھپوائیں ۔ معیاری رسالے نکالے ۔ سرسید، مولانا حالیؔ، مولانا وحیدالدین سلیم اور دیگر اہل الرائے کی آرزو کہ ایک ضخیم اور مستند لغت اردو کی تیار ہو کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور ایک اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے تگ و دو میں لگے رہے ۔ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہے، کیونکہ وہ دھن کے پکے، اصول کے پابند، بلند ہمت اور باحوصلہ آدمی تھے ۔

مولوی عبدالحق براہ راست، سیاست سے وابستہ نہیں تھے، لیکن ہندوؤں نے دیوناگری رسم الخط اور ہندی زبان کے مطالبے کو شروع ہی سے سیاسی مسئلہ بناکر اس کی اہمیت بڑھادی تھی، چنانچہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے اغراض و مقاصد میں بھی اس کو ایک خاص مقام اور اہمیت دی جاتی تھی ۔ اس دور میں گاندھی جی، ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے ۔ ان کا ہر حملہ ہندو مسلم نفاق پر مبنی تھا تھا، چنانچہ زبان کے سلسلے میں بھی وہ بظاہر بڑی اتحاد آفریں بات کہتے لیکن بباطن وہ انتہائی نفاق انگیز ہوا کرتی تھی ۔ ملکی سیاست میں گاندھی جی کی گرفت، قائداعظم جس انداز میں فرماتے گاندھی جی اس پر تلملا اٹھتے اور ان کا کوئی حربہ کارگر نہ ہوتا ۔ زبان کے سلسلے مولوی عبدالحق کی گرفت بھی ایسی ہی سخت ہوتی تھی ۔ زبان کے سلسلے میں مولوی عبدالحق نے گاندھی جی کے ہر بیان کے پرخچے بکھیر کر رکھ دیئے ۔ وہ گاندھی جی کی چالبازی کا کبھی شکار نہ ہوئے ۔ ۳۵ ـ ۱۹۳۶ء کا زمانہ اردو مخالفت کے لئے ایک بہت اہم زمانہ تھا ۔ اسی زمانے میں منشی پریم چند جیسا اردو افسانہ نگار بھی اردو کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا اور مخالفت میں کئی مضمون لکھے ۔ کانگریس یا اس کے پس پردہ گاندھی جی نے ایک انجمن بنائی جس کے بانی مسٹر کنھیا لال منشی تھے ۔ انجمن کا نام تھا " اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد " تھا ۔ اگرچہ اس کے اغراض و مقاصد ہندوستانی ادب اور ادیبوں کے حالات وغیرہ سے واقفیت اور ایک دوسرے کو قریب لانا تھے ۔ مگر درپردہ ہندی کا پرچار اور اردو کی بیخ کنی ہی مقصد وحید تھا اس کا سالانہ اجلاس ۱۹۳۶ء میں ناگپور میں گاندھی کی صدارت میں ہوا اور وہیں گاندھی جی کی اردو دشمنی طشت از بام ہوئی ۔ یہ داستان مولوی عبدالحق ہی کی زبانی سنیئے !

" ۱۹۳۵ء میں مسٹر کنھیا لال منشی (غذائی وزیر) مجھ سے حیدرآباد آکر ملے اور بیان کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت حاصل ہوسکے، آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہوجایئے ۔ چونکہ یہ ادبی معاملہ ہے میں نے منظور کرلیا ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگپور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا ۔ اس انجمن کا نام " اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد " تھا ۔ اس میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ پرشد کی زبان کیا ہونی چاہیئے ۔ مجھ سے پوچھا میں نے کہا کہ " ہندوستانی " گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں ۔ میں نے کہا اس لئے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا یہ رزولیوشن ہے کہ کانگریس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی، نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۱۲ میں صاف طور سے یہ درج ہے ۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ۔ میں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا گیا تو کام کیسے چلے گا ۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے ۔ جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور نیا نام تجویز کیا

یعنی ہندی ہندوستانی ۔ میں نے پوچھا ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے ۔ فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے ، بول چال میں نہیں ۔ پھر میں نے پوچھا، ہندوستانی سے آپ کا مطلب کیا ہے تو فرمایا وہ زبان جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں ۔ اس پر میں نے دریافت کیا تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی ۔ فرمایا وہ زبان آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی ۔ میں نے عرض کیا جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ اس پر انھوں نے جھنجھلا کر کہا ، میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا ۔ میں نے عرض کیا جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں ۔ اس پر انھوں نے ایسا غلط اور عجیب و غریب جواب دیا جس کی ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی ۔ فرمایا کہ مسلمان چاہیں تو اردو رکھ سکتے ہیں یہ ان کی مذہبی زبان ہے ۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے ۔ مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی ۔ اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور میں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا ۔ اب ہماری آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ زمانے کا رنگ کچھ اور ہے ۔"

یہ بیان گاندھی جی کی متعصب ذہنیت کو آشکار کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مولوی عبدالحق کے عزم اور حوصلے کو بھی ۔ گاندھی جی سے ٹکر لینا یقیناً کوئی آسان اور معمولی دل گردے کا کام نہ تھا ۔ مگر مولوی عبدالحق نے اس معاملے میں گاندھی جی کا خم ٹھونک کر اور ڈٹ کر مقابلہ کیا ۔

تقسیم ہند کے بعد جب تک ہندوستان میں رہے اردو کے لئے کام کرتے رہے ۔ پاکستان آئے تو یہاں اردو کے لئے جو کام کئے وہ سب پر ظاہر ہیں ۔ اردو کی خاطر ہر مرحلے پر ہر ایک سے الجھ جانا ان کے لئے معمولی کام تھا ۔ اور پھر کراچی کا یادگار جلوس تو ان کی کامیابی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے جس میں اردو کے حقوق کا مطالبہ کیا گیا تھا ۔

یہ تمام امور مولوی عبدالحق کی خدمت زبان کے سلسلے میں اردو کی حفاظت اور حق طلبی سے متعلق ہیں ۔ اب آیئے ! مولوی عبدالحق کی اردو کے متعلق علمی خدمات پر نظر ڈالی جائے ۔ یہ دائرہ بہت وسیع ہے ، کیوں کہ انھوں نے اپنی طویل زندگی میں تقریباً اردو علم و ادب کے ہر شعبے کے متعلق کچھ نہ کچھ کام انجام دیئے ہیں اور ہر ایک میں انتہائی غور و فکر سے کام لیا ہے ۔ دوسروں کے نتائج فکر و آرا پر اظہار خیال بھی ہے اور خود اپنے غور و فکر کے نتائج بھی شامل ہیں ۔ اس موضوع پر محترمہ آمنہ صدیقی نے بلا تبصرہ ایک کتاب " افکار عبدالحق " مرتب کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے ۔ اپنے مقدمے میں کچھ موضوعات پر تبصرہ بھی فرمایا ہے ۔ محترمہ کا یہ کارنامہ یقیناً قابل ستائش ہے کہ انھوں نے مولوی عبدالحق کے افکار کو ہر موضوع کے لحاظ سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے ۔ اس کے دو فائدے ہیں، ایک تو یہ کہ متفرق کتب و رسائل کی فراہمی اور چھان پھٹک سے چھٹکارا مل گیا ۔ دوسرے یہ کہ ہر موضوع کے متعلق ایک تسلسل کے ساتھ مولوی عبدالحق کے افکار سامنے آنے سے مولوی عبدالحق کے نظریات زیادہ واضح ہو گئے اور ان کے خیالات و افکار سمجھنے میں آسانی ہو گئی ۔ محترمہ کا مقصد یہاں آ کر پورا ہو جاتا ہے ۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں ۔

مولوی عبدالحق کی زندگی کا نصب العین اردو کی خدمت و حفاظت تھا ۔ اس لئے انھوں نے جو کچھ کہا اور لکھا

وہ سب بالواسطہ یا بلا واسطہ اردو ہی سے متعلق ہے ۔ افکار عبدالحق میں چھ مستقل عنوانات کے تحت افکار و خیالات جمع کیے گئے ہیں ان کی مختلف ذیلی سرخیاں قائم کر کے افکار پریشاں کو ایک سلک میں پرو دیا ہے ــــ اب یہ کام دوسروں کا ہے کہ وہ ان خیالات و افکار کو شرح و بسط سے بیان کریں اور ان کی روشنی میں مولوی عبدالحق کے کارناموں کو اجاگر کریں۔

مولوی عبدالحق نے اردو کے متعلق مختلف عنوانات سے اپنے خیالات و افکار پیش کئے ہیں ۔ ادب و شعر، تنقید اور تحقیق کے متعلق بڑے پتے کی باتیں بتائی ہیں ۔ مذہب و سائنس پر اچھا محاکمہ و تجزیہ ہے ۔ اسلوب بیان وغیرہ کی اچھی چھان پھٹک کی ہے ۔ دیگر مسائل پر ان کی رائے بڑی متوازن ہے ۔ لسانیات سے متعلق بھی اظہار خیال فرمایا ہے۔ لسانیات ایک مبسوط علم ہے جس کے مختلف شعبے ہیں ۔ مولوی عبدالحق نے اس کے صرف دو شعبوں پر اپنے خیال ظاہر کئے ہیں ایک زبان دوسرے الفاظ باقی تمام الفی کے ذیل میں آتے ہیں ۔ یہ دونوں موضوع بڑے وسیع اور اہم ہیں ۔ مولوی عبدالحق نے جزوی طور پر ان پر نظر ڈالی ہے اگرچہ ان کی رائے بڑی متوازن ہوتی ہے، لیکن وہ کہیں کہیں عام رائے کے پیرو کار نظر آتے ہیں یعنی وہ نظریات جو عام طور پر شہرت رکھتے ہیں ان کو پیش کر دیا ہے جو ابتدائی زمانے میں تو ممکن ہے کہ درست ہوں ، لیکن آج ان کی بعض باتوں سے اتفاق کرنا دشوار ہے ۔ ہمارے اچھے پڑھے لکھے طبقے میں ایک خیال جڑ پکڑ گیا ہے کہ زبان بھی مخلوط ہو سکتی ہے ۔ حالانکہ لسانیات میں مخلوط زبان کا کوئی بھی وجود نہیں ، جو حضرات مخلوط زبان کے وجود کے قائل ہیں وہ غلط فہمی کا شکار ہیں ۔ اور ان کی غلط فہمی اس بنا پر ہے کہ انھوں نے الفاظ (اسما) کو بڑی اہمیت دے دی ہے ۔ حالانکہ لسانیات میں اسما کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ اگر کسی زبان میں کسی غیر زبان کے الفاظ (اسما وغیرہ) داخل ہو جائیں تو وہ زبان مخلوط ہو گئی ، کیونکہ اس کے اجزائے ترکیبی میں دو زبانیں شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق بھی اسی نظریے کے قائل نظر آتے ہیں ۔

"یوں تو دنیا میں کوئی زبان خالص نہیں ۔ ہر زبان نے کسی نہ کسی زمانے میں دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ لفظ لئے ہیں ۔ یہاں تک کہ جو زبانیں مقدس کہلاتی ہیں وہ بھی اچھوتی نہیں ۔ لیکن جسے ہم مخلوط زبان کہتے ہیں اس کی خاص حیثیت ہوتی ہے ۔ مخلوط زبان سے مراد وہ زبان ہے جو دو زبانوں کے آپس میں گھل مل جانے سے ایک نئی صورت اختیار کر لے ۔ اور اس کا اطلاق ان دو زبانوں میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے جن سے مل کر وہ بنی ہے ۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے دو اجزا کیمیائی طور سے اس طرح ترکیب دیئے جائیں کہ وہ اپنی ہیئت، تاثیر اور خاصیت میں ایک نئی چیز بن جائیں اب اس کا اطلاق ان دو اجزا میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے گا" (افکار عبدالحق ص۱۵۹)

یہ بیان کافی غور طلب ہے ۔ یہ تو بالکل سچ ہے کہ دنیا کی کوئی زبان خالص نہیں ہر زبان میں دوسری زبانوں کے دخیل الفاظ کم و بیش ملتے ہیں ۔ لیکن آج دنیا میں کوئی زبان بھی مخلوط نہیں کہی جا سکتی ۔ مخلوط زبان کی جو تعریف اوپر بیان کی گئی ہے اس کی مصداق کوئی زبان نہیں اور اس کا اطلاق دنیا کی کسی زبان پر نہیں ہو سکتا ۔ مثلاً انگریزی زبان کو

لیجئے اس میں دنیا بھر کی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ فرانسیسی، لاطینی اور یونانی کے الفاظ تو بے شمار ہیں۔ ہماری زبان کے بھی کچھ الفاظ شامل ہیں۔ اس کو لسانی اعتبار سے کوئی بھی مخلوط زبان نہیں کہتا، البتہ دخیل الفاظ کی شمولیت کی وجہ سے قدیم اور جدید کی تخصیص تو کی جا سکتی ہے۔ مولوی عبدالحق ایک جگہ اس مخلوط زبان کی وضاحت اور اس کی پیدائش کے اسباب بالتفصیل بتاتے ہیں:-

"مخلوط یعنی کھچڑی زبانوں کے وجود میں آنے کے کئی سبب بیان کئے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک ملک گیری ہے۔ ایک ملک گیری تو یہ ہوئی کہ حملہ آور آیا اور لوٹ کھسوٹ کے چل دیا۔ دوسری قسم ملک گیری کی یہ ہے کہ فاتح نے کسی ملک کو فتح کر کے اس کا الحاق اپنے ملک سے کر لیا یعنی اسے اپنی سلطنت کا صوبہ بنا لیا۔ پہلی صورت میں ظاہر ہے کہ فاتح قوم کا کوئی اثر مفتوح قوم پر نہیں ہوتا، اگر ہوتا بھی ہے تو نہایت خفیف اور عارضی جو قابل اعتبار نہیں۔ دوسری صورت میں یا تو یہ ہوتا ہے کہ فاتح جبراً اپنی زبان اس دیس میں جاری کر دیتا ہے۔ یا اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں زبان کے مخلوط ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔

لیکن ملک گیری کی ایک تیسری قسم بھی ہے، وہ یہ کہ فاتح، مفتوح ملک میں آکر بس جاتا اور اس ملک کی قوم سے مل جل کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس کا اثر دیرپا اور مستقل ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں دونوں قوموں کے ملنے سے ان دونوں کی زبان میں بھی ٹکر ہوتی ہے تو دونوں کے ملنے سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے ہم نہ فاتح کی تہذیب اور زبان کہہ سکتے ہیں اور نہ مفتوح کی، بلکہ ان میں دونوں کی تہذیبیں اور زبانیں برابر کی شریک ہوتی ہیں اور دونوں قومیں اس کی بانی اور اس کی وارث ہوتی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو پھر کسی مخلوط زبان یا تہذیب کے پیدا ہونے کی گنجائش نہیں" (افکار عبدالحق ص۱۵۹)

یہ بیان مخلوط تہذیب کے لئے تو بالکل صحیح ہے۔ اب سے پہلے ہماری تہذیب میں ہند ایرانی اثرات ایسے گھل مل گئے تھے کہ بادی النظر میں دونوں میں امتیاز دشوار تھا پھر انگلش تہذیب کا اثر ہوا لیکن یہ یک طرفہ تھا یعنی فاتح کا اثر تھا، اختلاط نہیں تھا اس لئے انگلش تہذیب گھل مل نہ سکی اور الگ پہچانی جاتی ہے لیکن زبان کے متعلق یہ ہے کہ جب فاتح توطن اختیار کر کے مفتوح قوم سے اپنا ربط وضبط بڑھاتا ہے اور دونوں ایک امتیاز کے باوجود گھل مل جانے کی اس منزل پر پہنچتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک جدید زبان تشکیل ہوتی ہے تو زبان میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے وہ زیادہ تر ذخیرہ الفاظ پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے بعد کچھ تبدیلی ترکیب الفاظ میں بھی واقع ہوتی ہے البتہ ضمائر، لاحقے، سابقے زیادہ تر مقامی بولی کے رہتے ہیں اور افعال کی ساخت اور جملے کی ترکیب کے اصول وضوابط وہی قدیم زبان کے باقی و جاری رہتے ہیں۔ پس ایسی زبان کو مخلوط نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ زبان ایک ترقی یافتہ یا متاثرہ زبان کہلائے گی۔ اس کو کھچڑی زبان کہنا بھی خلاف حقیقت بات ہے اسی طرح ان کا یہ بیان بھی محل نظر ہے:-

"مخلوط زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں طرفین کو کچھ نہ کچھ قربانی کرنی پڑتی ہے جب دو مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں تو ہر ایک کو اپنی زبان کی بعض ایسی خصوصیتیں ترک کرنی پڑتی ہیں جو اس زبان سے مخصوص ہیں اور جس کے سمجھنے یا قدر کرنے سے غیر زبان والا قاصر رہتا ہے اس لئے دونوں زبان والے ایک دوسرے کی خاطر اپنی بعض

خصوصیتوں اور لفظی نزاکتوں کو قربان کر دیتے ہیں ۔" (افکار عبدالحق ص۱۲)

اس بیان میں بھی وہی نظریہ کارفرما ہے کہ زبان مخلوط ہو سکتی ہے حالانکہ جب دو زبانوں کے افراد ملتے ہیں تو بنیادی طور پر ایک زبان کا ڈھانچہ رہتا ہے اور دوسری زبان کا اثر، اور یہ دونوں صاف صاف اپنی ہیئت بتاتے رہتے ہیں ۔ جو بجنسہ یا بادنیٰ تغیر قائم رہتی ہے ۔ مثلاً " اشرف کی جورو مرگئی " غیر متاثرہ جملہ ہے ۔ مگر " اشرف کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا ، اشرف کی زوجہ وفات پاگئی ، اشرف کی وائف کی ڈیتھ ہوگئی " متاثرہ زبان ہے ۔ ان میں فرق یہ ہے کہ جو مفہوم غیر متاثرہ جملے میں ادا ہوا ہے ، وہی مفہوم متاثرہ میں لیکن متاثرہ میں دوسری زبانوں کے الفاظ " اہلیہ ، انتقال ، زوجہ ، وفات ، وائف ، ڈیتھ " کو استعمال کیا گیا ہے ۔ لیکن جملے کی ساخت اور فعل کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ، غیر متاثرہ میں تمام الفاظ اپنی زبان کے ہیں ۔ پس ایسی زبان کو متاثرہ کہیں گے مخلوط نہیں ۔ ان کا یہ بیان بھی کچھ اسی قسم کا ہے ۔

" مخلوط زبان میں ہوتا یہ ہے کہ وہ غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہے ۔ مخلوط نہیں ہوتی بلکہ اس کی اپنی زبان غیر زبان کے میل سے مخلوط ہو جاتی ہے ۔" (افکار عبدالحق ص۱۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولوی عبدالحق مخلوط کا لفظ متاثرہ کے لئے استعمال کر رہے ہیں ۔ لیکن ان کا یہ بیان بھی ہے :

" مخلوط زبان بننے کے دوران میں ایک اور بات بھی عمل میں آتی ہے جو قابل غور ہے یعنی ان میں سے ہر زبان کو اس خیال سے کہ جانبین کو ایک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آجائے اپنی بعض خصوصیات ترک کرنی پڑتی ہیں اور صرف ایسی صورتیں باقی رکھنی پڑتی ہیں جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اختیار کرنا دونوں کے لئے سہل ہوتا ہے اور اسی طرح دونوں میں ایک توازن سا پیدا ہو جاتا ہے ۔ جو فریقین کے لئے سہولت کا باعث ہوتا ہے ۔" (افکار عبدالحق ص۱۱)

اس بیان میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی نظیر کہیں نہیں ہے ۔ کم از کم تین زبانیں تو ہمارے سامنے ہیں جن میں اثر پذیری کا عمل بالکل واضح ہے ۔ انگریزی کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں ۔ فارسی کو دیکھئے کہ عرب فاتح بن کر آئے اور انھوں نے پہلوی کو متاثر کیا اور موجودہ فارسی کا روپ نکھرتا چلا گیا ۔ لیکن پوری زبان کو دیکھتے چلے جائیے ۔ کہیں بھی آپ کو مخلوط نظر نہیں آئے گی ۔ بلکہ اپنے اصول و ضوابط بروئے کار لا کر عربی کے دخیل الفاظ میں تصرف کرنا اس کی فطرت بن گیا الفاظ کی حد تک فارسی نے عربی سے فائدہ اٹھایا اور ایسا ہونا لازمی تھا لیکن افعال کی ساخت صرفی و نحوی اصول اس کے اپنے رہے ، جن پر ایک زبان کی بنیاد قائم ہوتی ہے ۔ عربی کے دخیل الفاظ فارسی کے تابع رہے ، اس کے اصول و ضوابط کو مطیع نہ بنا سکے بلکہ اکثر نے تو اپنی اصلیت ہی کو بھلا دیا مثلاً تیار کو موجودہ ہیئت کے لحاظ سے کوئی بھی عربی نہیں کہہ سکتا ۔ اس کی اصلی صورت " طیّار " اب بھلا دی گئی ہے ۔ یہی حال اردو کا ہے کہ جب اہل ایران یہاں آئے تو میل جول کی وجہ سے مقامی زبان بھی متاثر ہوئی ۔ الفاظ ، فارسی سے اور اسی کے توسل سے عربی کے الفاظ لئے بعد ازاں ترکی کے الفاظ بھی قبول کئے ۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ لہجے کی کرختگی اور اصوات کی ثقالت دور ہو کر ایک نکھری ہوئی ارتقائی صورت سامنے آتی رہی لیکن اصول و

ضوابط اس کے اپنے رہے اور اب تک ہیں مسلمان دورِ حکومت کے بعد بھی الفاظ کے ادخال کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ فرانسیسی پرتگالی اور انگریزی کے دخیل الفاظ ہماری زبان میں موجود ہیں۔ بلکہ انگریزی کے الفاظ تو اب اس قدر دخیل ہیں کہ اس کا نمبر عربی و فارسی کے بعد آجاتا ہے۔ غرض زبان مخلوط کبھی نہیں ہوئی اور اگر مخلوط زبان کی کوشش کی بھی جائے تو وہ پروان نہیں چڑھ سکتی۔ چنانچہ ابتدائی ریختہ جس میں شعر کا ایک مصرع یا مصرعے کا کوئی حصہ فارسی اور باقی ہندی ہوتا تھا مقبول عام نہ ہو سکا امیر خسرو نے اسی طرح لکھنا چاہا۔

خوار شدم زار شدم لٹ گیا در غمِ ہجر تو کمر ٹوٹ ہے

زحالِ مسکیں مکن تغافل، درائے نیناں بنائے بتیاں کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

لیکن یہ زبان چل نہ سکی بہت جلد اس کو ترک کر دیا گیا۔ اس کو ہم صحیح معنی میں مخلوط کہہ سکتے ہیں لیکن مخلوط زبان کی سب سے اعلیٰ اور عمدہ مثال میر جعفر زٹلی کے کلام میں ملتی ہے۔

اے زٹلی تو ازیں شہر بزودی در بھاگ ورنہ ریش تو پکڑ ندے جھڑا جھٹکندے

ظاہر ہے کہ یہ زبان ہمارے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی اس لئے اس کو بھی فروغ نہ مل سکا اور زٹلی ہی تک محدود رہی۔ انھوں نے بھی اس کو مزاحاً اختیار کیا تھا لیکن فی الحقیقت مخلوط زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ یہی حال انگریزی کے فروغ اور عروج کے زمانے میں بھی ہوا لیکن وہ تحریر میں نہ آ سکی صرف مزاحاً بول چال تک رہی جس میں انگ (ING) لگا کر فعل بنا لیا جاتا تھا غرض مخلوط زبان کے نمونے امیر خسرو اور جعفر زٹلی وغیرہ کے ہاں ملتے ہیں اور یہ زبان نہ اس زمانے میں چل سکی اور نہ اب باقی ہے۔ خود امیر خسرو اور جعفر زٹلی وغیرہ کا کلام اردو میں بھی ہے جو خود مخلوط زبان کی نفی کرتا ہے۔ البتہ مخلوط بولی کا تو امکان ہے کیونکہ وہ ایک غیر تہذیب یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ہوتی ہے اس کے بولنے والوں میں کوئی لسانی شعور نہیں ہوتا اور نہ حفاظت کا خیال اور نہ بگڑنے کا احساس۔ لیکن ایسی مثال بھی شاذ و نادر ہی مل سکے گی۔ ایک جگہ خود مولوی عبدالحق نے میرے خیال کی تائید اس انداز میں کی ہے۔

"یہ بھی مسلم قاعدہ ہے کہ غیر زبان کے لفظ جو کسی زبان میں داخل ہوتے ہیں یا کسی زبان کو مخلوط کرتے ہیں۔ تو وہ اصل زبان کی صرف و نحو کو ہاتھ نہیں لگاتے" (افکار عبدالحق ص۱۱)

پس لسانیات میں "مخلوط زبان" ایسی زبان کو کہتے ہیں جس میں دو یا زیادہ زبانوں کی آمیزش سے ایک نئی زبان وجود پذیر ہو اور اس پر کسی ایک زبان کا اطلاق نہ ہو سکے۔ لیکن ایسا ہونا مستبعد ہے، کیونکہ زبان بنیادی طور پر اس وقت ہی مخلوط کہلائے گی جب اس کے صرفی و نحوی اصول بھی کسی غیر زبان کے صرفی و نحوی اصولوں کے زیر اثر آ جائیں گے، ورنہ صرف الفاظ کے داخل ہونے سے زبان مخلوط نہیں ہوگی بلکہ متاثر ہوگی۔ اس کے لئے کہا جائے گا کہ اس زبان میں فلاں زبان کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال سے اس کی وضاحت کافی ہے کہ ہم

دوسری زبانوں کے اسما سے مصدر بنا کر انھیں گردانتے ہیں۔ اسم غیر زبان کا اصول ہماری اپنی زبان کا ہے مثلاً قلم سے ہم نے قلمانا اور فرمان سے فرمانا۔ فلم سے فلمانا، مقناطیس سے مقیانا، برق سے برقانا، گرم سے گرمانا، اپنے قاعدے کے مطابق بنایا اور اس کی گردان کی۔ تو یہ بنیادی طور پر اردو کا تصرف کہلائے گا، لیکن جعفر زٹلی نے زبان کو مخلوط بنانے کے لئے پکڑنا اور جھٹکنا سے فارسی مصدر پکڑدن اور جھٹکدن بنا کر انھیں گردانا اور ہندی میں استعمال کیا پہلی مثال یعنی قلمانا، فرمانا وغیرہ میں اردو کا اصول عمل پیرا ہے اس لئے یہ مخلوط کی تعریف میں نہیں آتا اور دوسری مثال میں پکڑدن، جھٹکدن اور دو مصدروں کو فارسی مصدروں میں ڈھال کر ان کی گردان بھی فارسی قاعدے سے کی اور ان کو اردو میں استعمال کیا یہ مخلوط زبان ہوگی۔ ایسی زبان کے نمونے تو مل سکتے ہیں۔ مگر وہ زبان نہ زندہ ہے اور نہ زندگانی کا ساتھ دے سکتی ہے۔

یوں تو مولوی صاحب نے اردو زبان کے متعلق بہت سے اصول و ضوابط بیان فرمائے ہیں جو نہایت کارآمد اور مفید ہیں، لیکن ایک بات جس کی آج بھی بہت زیادہ اہمیت ہے 'دخیل الفاظ کا مسئلہ ہے اور اپنی زبان میں غیر زبان کے انداز کو اپنانا ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"بات یہ ہے کہ جب کبھی ہم غیر زبان کے سیکھنے یا بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ہماری اپنی زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے ہماری کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو صحیح اور فصیح زبان بولیں اور اس بات کی سخت احتیاط کرتے ہیں کہ ہماری گفتگو یا تحریر میں ہماری زبان کے الفاظ یا طرز ادا کا شائبہ نہ پایا جائے۔ غیر زبانوں کے بولنے یا لکھنے میں ہم جس بات سے اس قدر پرہیز کرتے ہیں اس کا ہم اپنی زبان میں مطلق خیال نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جب کوئی ہندوستانی، انگریزی بولتا ہے یا لکھتا ہے تو تا امکان اپنی گفتگو یا تحریر میں اپنی زبان کا لفظ یا اسلوب بیان نہیں آنے دیتا اور جہاں تک ہو سکتا ہے اہل زبان کی تقلید کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انگریزی لب ولہجے کی نقل اتارنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ شروع شروع میں تو بعض ہندوستانی جنھیں انگریزی بہت چڑھ گئی تھی اپنی زبان بھی انگریزی لہجے میں بولنے لگے تھے۔ برخلاف اس کے اپنی زبان میں بیسیوں انگریزی لفظ بلا تکلف استعمال کرجاتا ہے۔ یا تو اس سے اپنی مشیخت یا علمی فضیلت جتانی مقصود ہوتی ہے یا پھر ناواقفیت اور کاہلی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ ناواقفیت اس لئے کہ اپنی زبان سے پوری طرح واقف نہیں اور کاہلی اس معنی میں کہ اسے اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنی زبان میں ان کے مترادف تلاش کرے۔ اس میں وہ کسی قدر مجبور بھی ہے۔ فاتح قوم کی زبان کے مطالعے، لکھنے، بولنے اور سننے سے معمولی اور عام ضروریات کے لفظ بھی اس کی زبان پر اس طرح چڑھ جاتے ہیں کہ بلا ارادہ بھی اپنی زبان میں بول جاتا ہے۔" (افکار عبدالحق ص۱۵۷)

اردو کی مظلومیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ نہ اس کی صحت کا خیال ہے اور نہ تہذیب و شائستگی کا جس

کا دل جس طرح چاہتا ہے لکھنے اور بولنے لگتا ہے۔ آج اگرچہ ہم انگریز کی غلامی سے سیاسی طور پر آزاد ہیں لیکن ذہنی طور پر ہم تا حال انگریز کے غلام ہیں۔ اپنی زبان کو کم مایہ اور تہی دامن سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے ہم نہ اپنی زبان کو حاصل کرتے ہیں اور نہ اس کے ذخیرے پر نظر ڈالتے ہیں۔ گنے چنے چند سو الفاظ جن میں سے بیشتر ہمارے روزمرہ کے کاروبار میں استعمال ہوتے ہیں ہماری زبان کا کل سرمایہ خیال کر لیا گیا ہے۔ اس میں اضافے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی اگر ہوتی بھی ہے تو وہ بھی انگریزی الفاظ کا اضافہ کرنے تک محدود ہے اور یہ بھی سہل پسندی کی وجہ سے، کیونکہ انگریزی کے الفاظ پہلے سے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اسی امر کا اعادہ ایک اور جگہ کیا ہے۔

"جب ہم کسی غیر زبان کے بولنے یا سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو اس میں ہماری اپنی زبان کا لفظ نہ آئے اور کسی حال میں اپنی زبان کے اسلوب یا طرز بیان کی چھینٹ تک نہ پڑنے پائے۔ برخلاف اس کے ہم اپنی زبان میں اس غیر زبان کے الفاظ بلا تکلف بول جاتے ہیں جیسا کہ ہم انگریزی تعلیم یافتہ گروہ میں دیکھتے ہیں کہ وہ بات چیت میں بغیر خیال و ارادہ کے بھی انگریزی لفظ بولتے چلے جاتے ہیں پہلے اس کی نوبت خبط تک پہنچ چکی تھی، اب اس میں بہت کمی ہو گئی ہے اس کی کئی وجوہ ہیں بعض اوقات یہ بات فیشن میں داخل ہو جاتی ہے اور لوگ "فیشن ایبل" بننے کے خیال سے ایسا کرتے ہیں۔ کبھی علمی مشیخت جتانے کو بھی ایسا کیا جاتا ہے۔ ایک وجہ کاہلی بھی ہے کہ ہم خیال ظاہر کرتے وقت اپنی زبان کا لفظ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور غیر زبان کا لفظ استعمال کر جاتے ہیں" (افکار عبدالحق ص۱۱)

اس بیان میں زبان کی طرف سے بے پروائی برتنے کے تین سبب بیان ہوئے ہیں جن میں ایک سبب تو کاہلی پہلے بھی بتایا تھا باقی دو یعنی فیشن پرستی اور علمی مشیخت۔ میرے نزدیک ان سب کے پس منظر میں احساس کمتری کا جذبہ کار فرما ہے۔ آج بھی ہم اس احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اپنی قومی زبان کو حقیر، بے مایہ اور ناکارہ خیال کرتے ہیں۔ آج بھی انگریزی بولنے اور اس کے الفاظ استعمال کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر المناک بات یہ ہے کہ اپنے ادب کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ غالب، انیس، اقبال کے کلام میں اس طبقے کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ یہ وہ بلند پایہ شاعر ہیں کہ ہم انھیں دنیا کے ممتاز اور اہم شعرا کے بالمقابل پیش کر سکتے۔

رہا زبان کا معاملہ تو ہماری زبان میں ہر طرح کے مطالب ادا کرنے کی صلاحیت ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمیں خود زبان پر عبور نہیں، اور عبور حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے مگر چیختے چلاتے ہیں کہ زبان میں یہ نہیں وہ نہیں اور جو نہیں ہے اس کے پیدا کرنے میں محنت نہیں کرتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ سب کچھ بنا بنایا مل جائے، بلکہ وہ تو یاد رکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرماتے ان کا خیال ہے کہ بس ذہن میں از خود موجود ہو جائے۔

زبان اور اس کے ساتھ ہی ادب کا ایک المناک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم بہت سے امور جن میں اصناف سخن ہئیت طرزادا، حتیٰ کہ خیالات تک درآمد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور جب ہم ان کو درآمد کر لیتے ہیں تو زبان کی کم مائگی کا رونا روتے ہیں حالانکہ درآمدی امور کے متعلق ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ ہماری زبان اور تہذیب سے ہم آہنگ بھی ہیں یا نہیں اور پھر ان کی ادائیگی میں جو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ پر بھی غور نہیں کرتے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم ان کو ہضم نہیں کر پاتے اور جوں کا توں اگل دینا چاہتے ہیں۔ اور جب ہضم نہیں کرتے تو زبان کہاں سے ادا کرے کیونکہ زبان تو دل کی ترجمان ہوتی ہے۔ اور جب کوئی چیز دل کی گہرائیوں سے تعلق نہ رکھتی ہو تو اس کو زبان کہاں سے ملے۔

اردو بڑی مظلوم ہے۔ سرسید احمد نے اس کی حمایت کی، مولوی عبدالحق نے اس کی خدمت کی اور اب اس لحاظ سے اردو زبان کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے۔ مولوی عبدالحق کے بعد مولانا صلاح الدین نے اردو کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا، یقیناً وہ پُرخلوص اور بلند حوصلہ مرد میدان تھے۔ وہ بھی ہم سے جلد ہی جدا ہو گئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اردو کی خدمت کے میدان میں قدم رکھا، لیکن وہ عزم و حوصلہ اور وہ جرات رندانہ جو ان بزرگوں کے لئے مقدر تھی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ میں مفقود ہے۔ اور ان کے حالیہ بیان نے کہ اردو میں ابھی اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ ابھی سرکاری زبان بنائی جاسکے۔ رہی سہی توقع بھی خاک میں ملادی۔ ضرورت ہے کہ اب پھر کوئی عبدالحق اٹھے اور اردو کے لئے سہارا بنے۔

بابائے اردو کی قدیم ترین تصویر ۱۹۱۸ء



دائیں سے بائیں۔ میجر فروسٹ۔ ڈاکٹر غلام یزدانی۔ مسز فروسٹ۔ بابائے اردو۔ پروفیسر محمود احمد خاں۔

کوثر چاند پوری

ایک یادداشت

بابائے اردو مولانا عبدالحق مرحوم اردو کے ساتھ اپنے معصومانہ عشق اور اپنی لسانی اور تحقیقی سرگرمیوں کے باعث حیات ابدی حاصل کر چکے ہیں یہ شعر ان پر جتنا صادق آتا ہے۔ شاید ہی اور کسی پر آتا ہو۔

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریده عالم دوام ما

درحقیقت وہ مجسم اوصاف تھے وہ اپنی وضعداری لباس گفتگو اور طرز گفتگو کے اعتبار سے بھی انفرادیت کے مالک تھے میں نے سب سے پہلے ۱۹۴۳ء میں انہیں دیکھا تھا۔ شدید سردی کا زمانہ تھا اور میں حکیم محمد سعید صاحب دہلوی (حال کراچی) کی شادی میں دہلی آیا تھا قیام دریا گنج والی کوٹھی میں تھا جو دریائے جمنا کے کنارے واقع تھی اور اس وقت حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ دہلی اسکے مالک تھے۔ پہلے دن مجھے برانڈے میں جگہ ملی جہاں سرد ہوا کے جھونکے آزادی سے آسکتے تھے سامنے قنات ضرور لگی ہوئی تھی لیکن ہوائیں اسے پھلانگ کر اندر آرہی تھیں۔ رات کو تیز برفیلی ہوا چلتی رہی اور مجھے کئی سیر روئی کے لحاف میں بھی سردی محسوس ہوتی رہی اگلے روز میرا بستر ایک بند کمرے میں لگا دیا گیا۔ وہاں بجلی کی روشنی اور رات کے سناٹے میں حکیم محمد تقی ایڈیٹر مشہور کی دی ہوئی ایک تصویر پر میں نے افسانہ لکھا جو رسالہ مشہور کے سالنامے میں شائع ہوا یہ کوٹھی ایک وسیع باغ کے اندر تھی اسی باغ میں شہر اور بیرون شہر کے مہمان کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دعوت ولیمہ کا نہایت شاندار انتظام تھا۔ مہمانوں میں ہر مذہب وملت کے افراد شامل تھے بابائے اردو بھی پنڈت دتاتریہ کیفی کے ساتھ تشریف لائے اور میرے سامنے والی قطار میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ پنڈت دتاتریہ گہرے رنگ کے گرم سوٹ میں ملبوس تھے اور مولانا نے شیروانی پہن رکھی تھی۔ جس کا رنگ غالباً نیلا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں بیت تھا۔ ٹوپی کا پھندنا کان کی جانب تھا جہاں تک مجھے یاد ہے داڑھی اس زمانے میں بالکل سفید ہو ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد میں نے چاہا کہ مولانا سے نیاز حاصل کروں۔ میں نے قاضی مشرف علی صاحب مرحوم مینیجر ہمدرد دواخانہ سے کہا انہوں نے کرسی کے سامنے کھڑے ہو کر ہمارا تعارف کرایا مولانا دستانے پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پنڈت دتاتریہ سے بھی ٹیک بینٹھ ہوا۔ مولانا نے بڑی دلفریب مسکراہٹ کے کے ساتھ چند جملے کہے زیادہ باتیں نہ ہو سکیں اور لوگ بھی اشتیاق ملاقات سے بے چین تھے۔ اس کے بعد بابائے اردو ایک بار بھوپال

تشریف لائے وہاں ان کے چھوٹے بھائی احمد حسن صاحب اسسٹنٹ انجینئر تھے۔ اور مدار رڈولنی والی مسجد کے سامنے ایک دو منزلہ مکان میں رہتے تھے جس کے عین محاذ میں آجکل روزنامہ افکار کا دفتر ہے میں ملنے گیا۔ بابائے اردو دوسری منزل کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو مغرب رویہ تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھے تھے میں بھی قریب بیٹھ گیا۔ یہ بابائے اردو سے میری دوسری ملاقات تھی جس میں اردو کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں جو مجھے یاد نہیں۔ گرمیوں کا موسم تھا اور میں اس زمانے میں شاہجہاں آباد کے شفاخانے میں متعین تھا اسی روز شام کو آصف شاہمیری نے بطور خاص مجھے بابائے اردو کے ساتھ فوٹو گروپ میں شریک ہونے کے لیے بلایا مولانا ایک صوفے کے وسط میں بیٹھ گئے۔ ایک جانب میں بیٹھ گیا دوسری طرف آصف شاہمیری کی تصویر بہت اچھی آئی ایک کاپی میرے پاس تھی لیکن افسوس ہے اس وقت موجود نہیں آصف شاہمیری کو میں نے کئی بار متوجہ کیا کہ اس تاریخی تصویر کو تلاش کریں مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی میں نہیں کہہ سکتا کہ اب بھوپال میں کسی کے پاس یہ تصویر مل سکتی ہے یا نہیں مولانا کی داڑھی بالکل اسی وضع قطع کی تھی جو دہلی میں نظر آتی تھی۔ اس مرتبہ داڑھی تقریباً سفید تھی بابائے اردو شیروانی کے بٹن گلے تک لگائے ہوئے تھے تیسری ملاقات کی نوبت نہ آسکی۔ بابائے اردو انجمن کا دفتر دہلی لے آئے اور یہیں سے کراچی چلے گئے۔ ان دو ملاقاتوں نے میرے ذہن پر نہایت گہرے نقوش مرتسم کئے۔ اور ان کی پاکیزہ شخصیت کا اثر اب تک موجود ہے ۱۹۵۷ء میں میرا قیام آرام باغ روڈ کراچی پر ہمدرد دواخانے میں تھا اور جس روز مولانا کی رہنمائی میں اردو کے سلسلے میں بہت بڑا جلوس نکالا گیا ہے میں دوسری منزل سے اس کا نظارہ کر رہا تھا۔ لیکن مولانا کو اسکی قیادت کرتے نہیں دیکھ سکا۔

" بابائے اُردو عمر بھر اُردو کی فکر میں جاگتے اور اُردو کی جنگیں لڑتے رہے۔ تہذیب اور ترقی کا جو چراغ انھوں نے سرِ راہ روشن کیا تھا ہم اس کے اجالے میں آگے بڑھیں گے۔

مولانا صلاح الدین احمد

" ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا شمار اُردو کے بڑے سے بڑے محسنوں میں ہمیشہ کیا جائے گا۔ اُردو کی پوری تاریخ میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس نے اتنی دشواریوں کے باوجود اتنی طویل مدت تک ہر دوسرے تعلق سے منہ موڑ کر اس خلوص، قابلیت اور پامردی سے اُردو کی اتنی گراں قدر اور مختلف النوع خدمات انجام دی ہوں، جیسی کہ مولوی عبدالحق نے۔ ان خدمات کا گنانا بھی آسان نہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

" مولوی عبدالحق نے اس وقت اپنے آپ کو اُردو کی خدمت کے لیے وقف کیا جب دوسرے دائروں میں ان کے سامنے ترقی و سربلندی، مال و ثروت، جاہ و منصب اور عزت و شہرت کے بہترین سامان موجود تھے اور وہ جلد سے جلد اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ فارغ البالی کا حاصل کر سکتے تھے۔ زبان یا علم و ادب کے دائرے میں اس وقت کوئی کشش اور کسی نوع کی گہرائی نظر نہ آتی تھی۔

مولانا غلام رسول مہر

نفضل احمد صدیقی

بابائے اردو
بمبئی سے بلدیہ کراچی تک

بابائے اردو اور میں بمصداق راجا بھوج اور گنگا تیلی ہم ضلع اور ہم وطن تھے. موصوف عرصہ ہوا وہاں سے ہجرت کر کے دکن میں جا مقیم ہوئے تھے. ہمیں ہجرت کے مقدر ہونے کا خواب وخیال بھی نہ تھا لیکن موصوف سے میرے اس تعلق کا علم ۱۹۳۲ء میں ہوا جب میں میرٹھ کالج میں قانون کا طالب علم تھا. ایک شام ایک گرانڈیل بزرگ ہمارے یہاں میرے عم زاد سلطان الحق صاحب سلطان سے ملنے آئے. آنے والے سر پر استرا پھرا ہوا تھا بلکہ چار ابرو کا صفایا، اس پر فیض کیپ گٹھا ہوا بدن. گھٹا ہوا رنگ، ڈھیلا ڈھالا ململ کا سا سوٹ. میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون بزرگ ہیں جن سے سلطان صاحب اس عقیدت و احترام کے ساتھ مصروف گفتگو ہیں. جب وہ بزرگ چلے گئے تو میں نے ازراہِ تمسخر ان حضرت کا حدود اربعہ دریافت کرنا چاہا. سلطان صاحب نے چمک کر کہا: میاں اتنا بھی نہیں جانتے. یہ تھے شیخ ضیاء الحق ہاپوڑی." شیخ صاحب کی شہرت ان سے بہت آگے آگے چلتی تھی. پگڑیاں اچھالنے میں ان کا نام خاصا اونچا تھا اور وہ اونچوں اونچوں ہی کی خبر لیتے تھے. مرحوم مولینا محمد علی جوہر اور خواجہ حسن نظامی میں جو ہم چخ رہی اس سلسلے میں بھی ہاپوڑی صاحب محتاج تعارف نہ تھے. ایک ہاپوڑ کیا ان سے رجواڑے تک پناہ مانگتے تھے اس لئے کہ شیخ صاحب کا ہر شہر میں بغیر ڈیکلریشن کا چھاپہ خانہ تھا اور وہ جہاں سے چاہتے اپنے اپنے عجب عجیب دستخط شدہ پمفلٹ بڑے بڑے طرم بازوں کے خلاف بے دھڑک شائع کرا دیتے تھے. یہ سب میں سن چکا تھا اس لئے ان سے رسمی تعارف نہ ہونے کا ملال رہا. لیکن سلطان صاحب نے بتایا کہ ان تمام امور کے باوجود شیخ ضیاء الحق دوستی اور دشمنی دونوں میں حد درجہ وضعدار قسم کے انسان ہیں اور ہمسایوں اور ضرورت مندوں سے مسلوک ہونے اور آڑے وقت میں کام آنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے. اس تفصیل کے بعد موصوف ٹیپ کے بند پر آئے کہ "یہ مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کے سگے بھائی ہیں!" میں ششدر و حیران رہ گیا کہ ہائیں! ایک بھائی ایسا اور ایک ویسا' دو انتہائیں بیانِ قوسین: بہر حال اس وقت تک مولوی صاحب بابائے اردو نہیں بنے تھے البتہ ان کی اردو دوستی اور کدو کاوش سے سبھی واقف تھے.

لسلسلہ ملازمت میں ۱۹۳۸ء میں میرٹھ سے بمبئی منتقل ہوا اور پھر پورے دس سال یعنی ۱۹۴۸ء تک وہیں مقیم رہا. یہی دس سال تحریک پاکستان کے آغاز و عروج کے تھے اور قائداعظم علیہ الرحمتہ کے اس نعرے پر کہ "ہم دس کروڑ نفوس مستقل بالذات ایک قوم ہیں، ہر لحاظ سے ممتاز ہماری تہذیب و تمدن' ہمارا ادب و زبان. آرٹ و فن تعمیر' نام اور قدریں، قوانین و اخلاق' تاریخ و روایات' مذاق و عزائم مختصر یہ کہ زندگی کے

اصول و نظریات سب جداگانہ ہیں۔" زبان کا مسئلہ سیاسیات کا جزو لازم بن گیا تھا۔ اب سیاست کے مرد میدان تو بہتیرے تھے اور قیادت محمد علی جناح جیسے صاحب بصیرت کے ہاتھ میں لیکن زبان کا کھڑاگ کون اٹھاتا؟ یہ خلا مرحوم و مغفور مولوی عبدالحق صاحب نے پُر کیا اور اس زور کی لسانی جنگ تنِ تنہا لڑی کہ ارباب حیدرآباد کو انہیں 'اردو یار جنگ' کا خطاب دینے کی توفیق تو کب ہوتی ساری قوم نے انہیں بابائے اردو کا لازوال لقب دے دیا۔

مولوی صاحب نے لسانی جنگ کا مورچہ اور مضبوط کرنے کے لئے اورنگ آباد سے دہلی ہجرت کی اور نمبر ایک دریا گنج میں کل ہند انجمن ترقی اردو کا دفتر قائم کیا۔ جریدہ 'قومی زبان' کا اجرا بھی وہیں سے ہوا۔ میں نے انھی دنوں 'یہ بمبئی ہے' کے عنوان سے ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے نشر کی تھی۔ کچھ دن بعد رخصت لے کر میرٹھ گیا تو راستے میں دہلی اترا اور کوچہ چیلان میں ایک دن ٹھہرا کہ بابائے اردو کی زیارت تو ہو جائے۔

نمبر ایک دریا گنج میں سہ پہر کا وقت تھا۔ ایک کمرے میں ہمارے صحافی دوست رفیق الدین صاحب جو آج کل کراچی کے ایک انگریزی روزنامے سے متعلق ہیں، قومی زبان کے مدیر تھے، انہوں نے بڑے نستعلیق انداز میں ملاقات کی، میں نے حوصلہ پا کر اپنا وہ نشری مقالہ ان کے حوالے کر دیا۔ اس وقت رفیق صاحب کا انداز نستعلیق سے نسخ یعنی خالص مدیرانہ یا کاروباری سا ہو گیا۔ میں نے تیور دیکھ کر عرض کیا کہ پسند خاطر ہو تو چھاپئے ورنہ واپس کر دیجئے لیکن حاضری کا مقصد بابائے اردو سے نیاز حاصل کرنا تھا۔ فرمانے لگے: "یہ وقت نہ مقرر ہے نہ مناسب، تاہم برابر والے کمرے میں بیٹھ جایئے شاید ادھر آنکلیں۔" میں برابر والے کمرے میں جس میں بجز ایک تپائی کے کچھ نہ تھا بیٹھ گیا۔ اور سامنے لان کی خوبی اور خوبصورتی کا لطف لینے لگا۔ اتنے میں ایک مرد سپید ریش جس کے سر پر بھی تباشیر سحر بکھری تھی، معمولی کرتے پاجامے اور کلکتیا سلیپر میں ادھر سے گزرے میں نے دل میں سوچا ہوں گے کوئی انجمن کے منشی متصدی! کہ اتنے میں رفیق صاحب تیزی سے بڑھے اور ان بزرگ کو وہیں روک کر بطور تعارف فرمایا کہ یہ صاحب آپ سے ملنے بمبئی سے تشریف لائے ہیں! تب مجھے معلوم ہوا کہ بابائے اردو یہی ہیں! بمبئی سے صرف ملاقات کے لئے دلّی آنے والا یقیناً مستحق توجہ تھا۔ مولوی صاحب بڑے تپاک سے ملے، مصافحے کے بعد دریافت فرمایا "کیا آپ واقعی بمبئی کے رہنے والے ہیں؟" میں نے عرض کیا کہ بمبئی سکریٹریٹ میں ملازم ہوں مگر رہنے والا میرٹھ کا ہوں، فلاں ابن فلاں میرے بزرگ ہیں جن سے مولوی صاحب بخوبی واقف تھے۔ بہت خوش ہوئے اور کہا آیئے۔ ان کے مطالعے کے کمرے میں ایک اور بزرگ احمق پھپھوندوی بھی تشریف فرما تھے۔ ان سے بھی میرے خاندان کی نسبت سے میرا تعارف کرایا۔ مولوی صاحب فرمانے لگے: "بھئی میرٹھ والوں نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے اور ابھی تک وہاں زبان کا بھاؤ گرنے نہیں دیا ورنہ دلّی میں تو کارخنداری انداز زوروں پر ہے۔" میں نے موصوف کو بتایا کہ ایک مقالہ بطور حقیر کوشش بغرض اشاعت چھوڑے جاتا ہوں۔ پسند خاطر ہو تو شائع فرما دیا جائے، ورنہ واپس کر دیا جائے۔ غرض یہ اولین ملاقات کھڑا کھیل فرخ آبادی کچھ کھڑے کھڑے کچھ بیٹھے بیٹھے ہوئی اور جلد ہی ختم ہو گئی۔

میرا وہ مقالہ اگلے ماہ "ہماری زبان" میں شائع ہوا اور اس کے کچھ روز بعد ہی خود بابائے اردو اور پنڈت دتاتریہ کیفی گجرات کے دورے پر بمبئی تشریف لائے۔ بمبئی میں ان دنوں اردو دوستوں کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ مرحوم سعادت حسن منٹو، جناب ضیاء الدین برنی، ذوالفقار علی صاحب بخاری، پروفیسر سراج حسین نقوی، ڈاکٹر نذیر الرحمن، پروفیسر ندوی، مولانا عرفان، محمد انور حارث، ہمارے موجودہ وزیر خارجہ سید شریف الدین پیرزادہ دن بھر میرے دفتری ساتھیوں میں تھے اور شام کو قائد اعظم کے بنگلے پر بطور اعزازی سکریٹری کام کرنے جاتے تھے۔ وہ بھی اردو کے بڑے رسیا تھے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے دونوں بزرگ مہمانوں کے اعزاز میں محبان اردو سے تعارف کے لئے اپنے بنگلے پر عصرانہ اور ڈاکٹر نذیر الرحمان نے اپنی قیامگاہ

پر عشائیہ دیا۔ انجمن اسلام میں ڈاکٹر محی الدین زور اور مولوی صاحب کی تقریریں ہوئیں۔ اور اردو کی ہمہ گیریت پر زور دیا گیا۔ میں سب محفلوں میں شریک تھا۔ مولوی صاحب نے مجھے فوراً پہچان لیا اور میرے مقالے کی داد دیتے ہوئے کہنے لگے کہ "میاں بمبئی سے بمبئی کی زندگی پر ایسا تند و تیز طنزیہ تم نے کیسے نشر کر دیا؟" یہ سن کر کیفی صاحب نے آخا کہا اور اٹھ کر معانقہ کیا اور فرمایا "عزیزم تمہارے مقالے کی تعریف ہر جگہ کرتا آ رہا ہوں۔ ملنے کا اشتیاق تھا سو آج پورا ہو گیا۔ ماشاءاللہ، مشق جاری رکھو۔" مولوی صاحب نے ہنس کر کہا کہ "کیفی صاحب! کیوں نہ ہو یہ میرے ہم وطن ہیں اور مثل عزیزوں کے ہیں!"

مولوی عبدالحق صاحب نے جو کچھ ازراہ شفقت بمبئی میں فرمایا تھا اسے آخر دم تک نباہا، اس کی مختصر داستان یہی ہے کہ فروری سنہ ۱۹۴۸ء میں بمبئی سے کراچی پہنچا تو مولوی صاحب کی خدمت میں اسی عمارت میں حاضر ہوا جہاں وہ مدفون ہیں اور ان سے کتابوں اور انسانوں کی ہجرت کی داستان سنی اور یہ ہولناک اشارہ بھی کہ کس طرح نظام دکن کو بقول ان کے قاسم رضوی اور رضاکار تحریک والے دبوچے بیٹھے تھے اور کوئی بھروسا نہیں تھا کہ کس وقت حضور نظام ڈبکی لگا جائیں۔" آگے چل کر حیدرآباد میں جو کچھ ہوا سب کو خبر ہے اور بابا کی بصیرت پر دال۔ اپریل ۱۹۴۹ء سے ڈان اردو روزنامے کا اجرا ہوا تو جملہ ابتدائی مراحل میں موصوف کا مشورہ شامل حال رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسانوں کی طرح زبان بھی نگھری تھی۔ موصوف بڑے دلی رنج سے فرمایا کرتے تھے کہ اس نئی مملکت میں اردو کے لئے جگہ دیکھئے کب تک اور کیونکر بنے گی؟ جوں توں اردو کالج قائم ہوا تو ہزار موانع درپیش تھے۔ ایک روز میں نے ڈان اردو میں اپنے ایک شذرے میں کچھ لکھا تھا، اس سے اس وقت کے ناساعد حالات کا اندازہ فرمائیے۔

عنوان تھا "خدا کھیے"۔ عبارت یہ تھی۔

"ارباب سندھ یونیورسٹی کو انجمن ترقی اردو کالج سے کچھ للہی سی ہو گئی ہے بلکہ ہم تو کہیں گے کہ اردو شاید ان کی چڑ بن کر رہ گئی ہے۔ اردو کالج کے الحاق کے معاملے میں سنڈیکیٹ نے وہ ڈھیٹ پن دکھایا ہے کہ یاید و شاید۔ پہلے کالج کی درخواست سرے سے مسترد کر دی گئی کہ سندھ میں اردو کا چلن نہیں۔ اس پر کالج نے یہ کہا کہ امتحانات کے پرچے انگریزی میں سہی صرف جواب اردو میں قبول فرما لیئے جائیں تو اس کا جواب بھی وہی نفی میں بلکہ اس ایزاد کے ساتھ کہ ابھی پانچ سال تک ایسا ممکن نہ ہوگا۔ پنجاب یونیورسٹی سے الحاق پہلے ہی قانون سازی کے ایک نکتے پر حصر کر دیا گیا تھا جس کا حل مرکز کے نکتہ وروں کی بات نہیں۔ اب سندھ نے بھی ٹکا سا جواب دے دیا۔ ہماری ناقص رائے میں بابائے اردو اپنے اردو کالج کو باحسرت دیاس اب کسی یتیم خانے سے ملحق فرما دیں کہ اردو کو اب اس ملک میں یتامیٰ و مساکین ہی کا درجہ حاصل ہے۔ رہی یہ امید کہ ایسا کرنے سے خداوندان تعلیم و تعلّم کو بھی کچھ شرم آئے گی سو،

این خیال است و محال است و جنوں!"

بابائے اردو کراچی کے صحافیوں سے نہایت مشفقانہ طور پر پیش آتے تھے اور اکثر یہ محفلیں موصوف کی بذلہ سنجی سے زعفران زار بنی رہتی تھیں۔ اگر ہم میں سے کوئی کبھار اردو کے بارے میں لکھتا تھا تو بہت خوش ہوتے تھے۔ لیکن ایک قسم کی مایوسی کا اظہار یہاں کے انگریزیت زدہ ماحول اور اس وقت کے ارباب اقتدار کی سہل انگاری سے متاثر ہو کر اکثر فرماتے رہتے تھے اور جو کچھ موصوف کو کہنا ہوتا تھا بہت کھل کر کہتے تھے۔ جون سنہ ۱۹۵۰ء میں روزنامہ

ڈان (اردو) پہلی بار اردو ٹائپ پر چھپا تو اس رسم میں بابائے اردو اور اتفاق سے خواجہ حسن نظامی مرحوم بھی شریک تھے۔ مولوی صاحب نے اس موقع پر فرمایا تھا۔

"یہ میری ایک دیرینہ آرزو تھی کہ اردو لائنو ٹائپ میں کوئی اخبار نکلے، ڈان (اردو) نے یہ آرزو پوری کر دی" افسوس ہے کہ وہ لائنو ٹائپ ہی اس روزنامے کو بند کرانے کا سب سے بڑا جواز بنا، حالانکہ کچھ ہی روز پیشتر خان لیاقت علی خان نے مجھ سے اردو ٹائپ کی نسبتہً نامقبولیت پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میاں صاحبزادے تم نے تو پہل کی ہے، دوسرے تمہارے تتبع پر مجبور ہوں گے۔ اس لئے کہ ہماری تمام سرکاری مشنری اب عنقریب اردو ہی کو اپنا رہی ہے۔ گھبراؤ مت۔ ڈٹے رہو" ہیہات کہ چند ہی روز بعد "آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند"! اور ڈان (اردو) بند کرنے والوں نے بند کر دیا۔ بابائے اردو کو اس کا بڑا قلق ہوا اس لئے اور بھی کہ ڈان (گجراتی) بدستور قائم رہا اور ماشاء اللہ آج تک ہے۔

بابائے اردو نے خواتین کے لئے بھی علیحدہ اردو کالج قائم کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ کشتی نامعلوم بھنور میں پھنس کر جلد ہی غرقاب ہو گئی۔ اس زمانے میں موصوف ناظم آباد میں خواتین کالج کے لئے مناسب مکان کی تلاش میں تھے۔ میرا مکان بھی دنوں مکمل ہوا تھا۔ میں نے پیشکش کی اور خالد حسن قادری صاحب کی وساطت سے مولوی صاحب میرا وہ مکان ملاحظہ فرمانے خود پہنچے لیکن ۴ اپریل ۵۶ء کو انہوں نے مجھے جو مراسلہ بھیجا وہ محفوظ ہے۔ اس کا متن آپ اپنی دلدوز کہانی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"مکرمی فضل احمد صاحب سلمہ۔ آپ کا مکان اور اس کا مقام وقوع مجھے پسند تھا لیکن کالج کی مالی حالت نے اس کی اجازت نہ دی کہ اسے کرائے پر لیں۔ اگرچہ میں نے خالد صاحب کی زبانی کہلا بھیجا تھا لیکن اس کے بعد بھی یہ کوشش کرتا رہا کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ ہم آپ کے مکان کو خواتین کالج کے لئے لے لیں۔ مگر مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ خیر طلب۔

عبدالحق"

ڈان اردو کے بعد ایک سال ریڈیو پاکستان میں بسر کر کے اپریل ۱۹۵۲ء سے یہ بندۂ عاجز بلدیہ کراچی سے متعلق ہے۔ میرا تقرر میونسپل کمشنر مسٹر ہارڈ راٹنڈ نے کیا تھا۔ وہ اردو کے کچھ خود دلدادہ تھے کچھ میں نے انہیں اس کی چاٹ پر ڈالا۔ چنانچہ میں نے اس مرد فرنگی سے پہلی بار اردو زبان میں کراچی ریڈیو اسٹیشن سے شہری مسائل پر تقریر نشر کرائی جس کی داد بابائے اردو سے مجھے ملی۔ اسی زمانے میں بابا کے بتائے ہوئے ترجمے اپناتے ہوئے ہم نے اپنے افسران کے بورڈ وغیرہ اردو میں لکھوائے، چیف انجینیر کو انجینیرِ اعلیٰ، اور ایگزیکیٹو انجینیر کو منتظم انجینیر وغیرہ وغیرہ موصوف ہی کے مشورے سے لکھا گیا۔ میونسپل بیت الخلاؤں پر "جائے ضرور" کا جامع نام موصوف ہی کا دیا ہوا ہے۔ آپ ہی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ پورب کے بعض دیہات میں اصطلاح "جاجرور" جو عام طور پر رائج ہے وہ جائے ضرور ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۵۵ء سے ہم نے ماہنامہ "کراچی میونسپل ریویو" اردو انگریزی میں جاری کیا تو بابائے اردو کا پیغام شریک اشاعت تھا اور افتتاحی نمبر ملنے کے بعد جو فراخدلانہ تبصرہ بلکہ شاباش نامہ موصوف نے ہمارے اس وقت کے میونسپل کمشنر جناب شمس الحق قریشی سی ایس پی کو جو آج کل ممبر فیڈرل پبلک سروس کمیشن ہیں، اپنے قلم سے لکھ کر بھیجا وہ انتہائی حوصلہ افزا تھا۔ اس حد تک کہ اس پر میونسپل کمشنر نے یہ نوٹ لکھ کر میرے پاس بھیجا۔

"This is a good chit for the Information Officer"

مولوی صاحب کے تدین اور صدق و صفا کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ اردو کالج کے لئے حصول امداد کے لئے میں انہیں لے کر بلدیہ میں گیا۔ میونسپل کمشنر نے انتہائی احترام سے بتایا کہ آڈٹ کا اصول یہ ہے کہ آپ اپنا سالانہ چٹھا ہمیں بنا کر دیں، اس میں جو خسارہ ہوگا اسی قدر رقم ہم بطور گرانٹ منظور کرا دیں گے۔ مولوی صاحب برہم ہو گئے اور فرمایا کہ "اس وقت آمد و خرچ برابر ہے صرف مزید منصوبے کے لئے رقم درکار ہے، تو میں جھوٹا حساب برابر سرابر کر کے کیسے لے آؤں؟ یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا آپ امداد دیں یا نہ دیں۔" یہ کہہ کر طیش میں کھڑے ہو گئے اور باہر چلے آئے میں نے بہت سمجھایا کہ آپ اس عالم دگر سے ہی کام لیں تو ہاتھوں ہاتھ خسارے کی رقم دلانا ہمارا کام ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا "لاحول ولاقوۃ مجھ سے جھوٹ بلواتے ہو، یہ ہرگز نہیں ہوگا۔" اور مجھ پہ کچھ ناراض سے ہوئے۔ کہ گویا میں نے فضول ان سے اتنی مسافت طے کرائی۔ میں خجالت سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ مگر بلدیہ نے آگے چل کر تلافی مافات کر دی۔

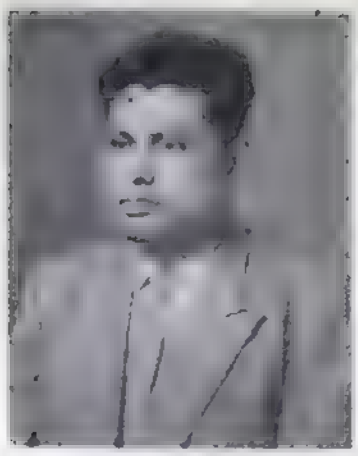
بابائے اردو کو عزت نفس کا کس درجہ پاس تھا اس کا اندازہ ایک اور واقعے سے کر لیجئے اور اسی پہ یہ داستان ختم ہے۔ آخری ایام علالت میں میں جناح اسپتال جب بھی گیا، باوجود معالجوں کی ممانعت کے، مجھے موصوف نے برابر بلا کر بٹھایا اور پہچانا۔ آخری بار جب یہاں سے لغرض علاج روانگی ہونے والی تھی تو میں گیا اور اپنے ایک انتہائی مخیر محسن کا یہ پیغام بھی دیا کہ منظور فرمائیں تو سفر اور معالجے کے مزید مصارف کے لئے اتنے ہزار روپے حاضر کر دیے جائیں۔ مولوی صاحب زیادہ بول نہیں سکتے تھے، لیکن اسی نقاہت میں نہایت برافروختہ ہو کر فرمایا کہ ان صاحب کا شکریہ ادا کر دیجئے ان کی دولت انہیں مبارک ہو۔ مجھے اللہ نے اتنا تو دے رکھا ہے کہ میں محتاج نہیں، ضرورت مند نہیں۔ البتہ صدر مملکت کی پیشکش ٹھکرا نہیں سکتا تھا اس لئے جا رہا ہوں۔ میں دم بخود رہ گیا۔

بابائے اردو کی مرمریں قبر چیئرمین بلدیہ بریگیڈیئر مرزا حامد حسین نے اپنے انجنیئروں کی مدد سے خود کھڑے ہو کر تیار کرائی۔ قریبی سڑک کا نام "بابائے اردو روڈ" رکھ دیا اور بلدیہ کی ایک قرارداد کی رو سے مزار بابا پہ ہر سال پھولوں کی چادر کا چڑھایا جانا وائس چیئرمین کے لئے لازم ہے۔ لیکن ان سب رسوم سے کہیں زیادہ قابل ذکر یہ امر ہے کہ بلدیہ کراچی کا سالانہ میزانیہ اردو میں دو سال سے پیش ہو رہا ہے، جو کلیتاً روح بابائے اردو ہی کا تصرف ہے۔ اور یہ تسکین کیا کم ہے کہ بابا ہم اور آپ جیسے لاکھوں "بابوان اردو" ایسے چھوڑ گئے ہیں کہ اب اردو کو کم از کم خادموں کی کمی کبھی محسوس نہ ہوگی۔ انشاءاللہ۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے جو اس وقت تک اردو زبان کی خدمت کی ہے اس کے بار احسان سے ہم سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ان کے ایسے اعتدال پسند اور منصف مزاج ادیب فی زمانہ ہندوستان میں بہت کم ہیں۔

سر تیج بہادر سپرو

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین



مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج اور بابائے اردو

مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت سے بابائے اردو کو ہمیشہ گہری دلچسپی رہی۔ قیام پاکستان سے قبل بھی اور قیام پاکستان کے بعد بھی وہ اس مقصد کے لئے وقتاً فوقتاً یہاں کا سفر کرتے رہے یا خط و کتابت کے ذریعے اردو داں اصحاب یا اردو سے ہمدردی رکھنے والے لوگوں سے برابر ربط ضبط بڑھا کر تجویزیں بناتے رہے اور دوسروں کی تجاویز پر مستعدی سے غور کرتے رہے۔

اس سلسلے میں وہ ہمارے علم کے مطابق پہلی مرتبہ ۲ مارچ ۱۹۴۳ء کو بنگال آئے۔ اردو کے بہی خواہوں اور بابائے اردو کے قدردانوں نے دیناج پور، شمالی بنگال میں ایک اردو کانفرنس بلائی تھی۔ وہ اسی کانفرنس میں شرکت کرنے آئے تھے۔ اس میں انہوں نے اپنا وہ بصیرت افروز خطبۂ صدارت پڑھا تھا۔ جو خطبات عبدالحق میں شامل ہے۔ اس کانفرنس کی روداد تو ہمیں نہیں ملی۔ البتہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بنگال میں اردو کو فروغ دینے کے لئے یہ ایک اہم کوشش تھی۔ جن لوگوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی سب کے دلوں پر اردو کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور مرتب ہوا ہوگا۔

بابائے اردو نے بنگال کا دوسرا سفر ۱۹۴۶ء میں قیام پاکستان سے پہلے پہلے جبکہ تحریک پاکستان عروج پر تھی۔ قائد اعظم کے بلاوے پر اختیار کیا تھا۔ اس وقت وہ شملے سے سراج گنج آئے تھے۔ وہاں جدوجہد آزادی کے سلسلے میں ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اتنی بڑی کانفرنس سراج گنج کی تاریخ میں شاید وہی پہلی اور آخری تھی۔ لوگوں کے دلوں میں آزادی کا جذبہ موجزن تھا۔ دو صد سالہ غلامی کا جوا کندھوں پر سے اتار پھینکنے کے لئے لوگ بے قرار تھے۔ ان میں جوش و خروش اس قدر شدت اختیار کر گیا تھا کہ وہ قائد اعظم کے ایک اشارے پر اپنی جان مال سب کچھ قربان کر دینے پر آمادہ تھے۔ اپنے قائد سے انہیں اس قدر عقیدت تھی کہ انکی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک بے پناہ ہجوم تھا۔ یہ وہی کانفرنس تھی جس میں قائد اعظم نے غالباً اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اردو میں تقریر کی تھی۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، قائد اعظم کی زبان اردو نہ تھی۔ اس لئے وہ اردو ٹھیک سے بول نہیں سکتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ عنقریب ایک نئی مملکت کی بنیاد ڈالنے والے تھے اور اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے اختیار کرنا تھا۔ اس لئے انہوں نے اردو ہی میں عوام سے خطاب کیا۔ اپنے بے مدیل قائد کی اردو تقریر سن کر بابائے اردو کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا تھا۔ ایک طرف بابائے قوم اور ان کی وہ اردو تقریر اور دوسری طرف بابائے اردو اور اردو کے لئے ان کی وہ دیوانگی ــــ کسے کیا پتا، کیا گنگا جمنی پیدا ہو گئی تھی۔ بابائے قوم کی وہ ایک اردو تقریر گویا

بابائے اردو کی زندگی کے ایک سچے خواب کی سچی تعبیر تھی۔ اس میں بابائے اردو کو پاکستان میں اپنے عظیم مشن کی کامیابی کا آغاز نظر آیا۔

بابائے اردو تیسری مرتبہ اپریل ۱۹۴۹ء میں ڈھاکا تشریف لائے پاکستان بنے ہوئے اب دو سال ہو چکے تھے، اور وہ دہلی سے انجمن سمیت ہجرت کرکے کراچی آچکے تھے۔ وہاں انجمن کا بھی باضابطہ قیام عمل میں آچکا تھا۔ اب انہیں مشرقی پاکستان میں اس سلسلے میں جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا، کام شروع کرنا تھا۔ ڈھاکا تشریف لاکر انہوں نے اردو داں حضرات سے رابطہ پیدا کیا۔ اردو کے نامور ادیب اور شاعر فضل احمد کریم فضلی ان دنوں ڈھاکا میں تھے۔ انہی کے مکان پر قیام کیا۔ مقامی ادیبوں اور شاعروں کو شرف ملاقات بخشا۔ ان سے درخواست کی گئی کہ پاکستان کے اس بازو میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی جائے۔ انہوں نے بہ طیب خاطر اس درخواست کو منظور کیا۔ اس مقصد کے لئے ضروری کارروائی شروع ہوئی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان کا پہلا اجلاس بابائے اردو کی صدارت میں ہوا۔ اس طرح انکی سرپرستی میں اپریل ۱۹۴۹ء میں مشرقی پاکستان میں انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ وجود میں آئی جس کا مقصد مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت تھا۔

ڈھاکا سے پھر آپ سلہٹ تشریف لے گئے اور غالباً چاٹگام کا بھی دورہ کیا اور مقامی اردو دوست حضرات سے مل کر اردو کو مشرقی پاکستان میں زیادہ سے زیادہ رواج دینے کے سلسلے میں گفتگو کی۔ چنانچہ انہی کے فیض و برکت سے ان دونوں مقامات پر انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں۔ یہ معلوم نہیں، ان شاخوں کا مرکزی انجمن ترقی اردو سے شروع میں کیا رابطہ رہا اور اب صورت حال کیا ہے۔ بہرحال دونوں جگہ انجمنیں قائم ہیں۔ اور اردو کو فروغ دینے کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ سرگرمیاں جاری ہیں۔

۱۹۵۰ء میں انجمن ترقی اردو، ڈھاکا کے زیر اہتمام یوم اقبال اور یوم اردو منایا گیا تو مولوی صاحب چوتھی مرتبہ مشرقی پاکستان آئے۔ اور جلسے کی صدارت کی۔ ہمارا وہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ہم نے انہیں پہلی مرتبہ اسی موقع پر دیکھا تھا۔ ڈھاکا کے ایک مقامی سینما ہال میں جلسے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈھاکا کے تمام ادب نواز اور بہی خواہان اردو جمع تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ منتظمین انتظامات کو آخری شکل دینے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ رضاکار اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ان سب کی رفتار و گفتار سے بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک بہت بڑی شخصیت کی آمد کا انتظار تھا۔ سب گویا چشم براہ تھے۔ جلسہ شروع ہونے میں ابھی چند ہی منٹ باقی تھے۔ دیکھا، یکایک تمام منتظمین صدر دروازے کی طرف لپکے، ایک پیر کہن سال کار سے اترے۔ سب نے خوش آمدید کہی۔ ساتھ لے کر اندر آئے اور چبوترے پر لے جاکر پورے ادب اور احترام کے ساتھ بٹھایا۔ سفید بال اور سفید داڑھی والے صاحب لمبی شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس ایک خاص آن بان اور وضع و طمطراق کے ساتھ صدارت کی کرسی پر متمکن ہوئے۔ کسی سے پوچھا، وہ صاحب کون تھے بتایا گیا، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ــــ اردو کے سب سے بڑے خدمت گزار۔ نام سے تو پہلے ہی سے تھوڑی بہت واقفیت تھی دیکھ کر اور ان کی بصیرت افروز تقریر سن کر دل پر بڑا رعب بیٹھا۔

مولوی صاحب پانچویں اور آخری مرتبہ ۱۹۵۱ء میں ڈھاکا تشریف لائے۔ انجمن ترقی اردو کی کارکردگی کے بارے میں جائزہ لیا۔ مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کرکے اردو کی ترقی کے بارے میں بات چیت کی۔ ریڈیو پر تقریریں نشر کیں ایک سرسید احمد خاں پر اور

دوسری مولانا حالیؔ پر۔

جہاں تک ہمیں علم ہے، مولوی صاحب نے صرف پانچ ہی مرتبہ، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، مشرقی پاکستان کا سفر کیا۔ بعد میں بھی انہوں نے بار با آنے کا عزم کیا، لیکن نہ آسکے۔ مختلف وجوہ مانع ہوئیں۔ ان میں سے ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان میں اب طویل سفر کرنے کا وہ اگلا سا دم خم باقی نہ رہا تھا۔ قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خود کراچی ہی میں وہ انجمن کے معاملات میں بے بس ہو چکے تھے۔ انکی جان مال سب پر اغیار کا قبضہ تھا۔ ان کو بلکہ ایک طرح کی قید تنہائی میں ڈال دیا گیا تھا۔ پاؤں میں گویا بیڑی پڑ چکی تھی۔ جنبش کی اجازت نہ تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود مولوی صاحب برابر مشرقی پاکستان آنے کے لئے تڑپتے رہے۔ مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی وہ پھر کبھی یہاں نہ آسکے۔ دل کی تمنا دل ہی میں رہ گئی، اور وہ خاک میں مل گئے۔ آج کہاں ہیں، بابائے اردو! کہاں ہیں وہ سرفروش! ان کی طرح لگن، ان کی طرح شوق، انکی طرح آرزو آج کس کو ہے، جو مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے اس قدر دلچسپی کا اظہار کرے۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کی نوعیت الگ اور جداگانہ ہے۔ مغربی پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے اغراض و مقاصد کچھ اور ہیں اور مشرقی پاکستان میں کچھ اور۔ کراچی میں انجمن کا کام اردو زبان و ادب کو زیادہ سے زیادہ علمی سانچے میں ڈھالنا ہے اور امہات الکتب کی طباعت و اشاعت ہے۔ لیکن اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں انجمن کا واحد مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اردو کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے۔ یہاں کی عام زبان بنگلا ہے، لوگ بنگلا زبان بولتے پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ گو کہ اردو سے یکسر نابلد نہیں ہیں۔

مشرقی پاکستان میں یوں اردو کا رواج صدیوں سے ہے۔ یہاں کے دینی مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم ہمیشہ اردو ہی رہا ہے۔ چنانچہ یہاں چھوٹے بڑے مدرسوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان مدرسوں سے جو طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اور دینی امور میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔ وہ اپنا ماخذ بالخصوص اردو میں لکھی ہوئی کتابوں کو بناتے ہیں۔ اور پند و نصائح، وعظ و خطاب میں بنگلا کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بناتے ہیں۔ سال کے بارہ ماہ خصوصاً ربیع الاول اور رمضان المبارک میں یہاں میلاد کی محفلیں منعقد کرنے کا گھر گھر رواج ہے۔ ان میں اکثر اردو ہی میں تقریریں ہوتی ہیں یعنی آنحضرت صلعم کا ذکر ولادت ہمیشہ اردو ہی میں کیا جاتا ہے۔ بلکہ اِدھر علمائے دین اگر اردو میں میلاد پڑھنے سے قاصر ہیں تو وہ مذہبی امور میں اپنی پختگی اور مہارت کا دعویٰ نہیں کر سکتے، بلکہ ان کی علمیت کا پایہ ذرا کم سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اردو اچھی طرح آئے یا نہ آئے یہ حضرات میلاد ہمیشہ اردو ہی میں پڑھتے ہیں۔ کیونکہ لوگ اسے اردو میں بخوبی سمجھتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میلاد کی کتابوں سے دیکھ کر پڑھنے میں بھی وہ کوئی خاص دقت محسوس نہیں کرتے۔ چاہیں تو لکھ بھی سکتے ہیں، لیکن کچھ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ خاص کر روزمرہ اور محاورات کے استعمال میں ظاہر ہے، جب تک کہ اردو ادب کا کثرت سے مطالعہ نہ کیا جائے۔ اہل زبان کی صحبت میں برسوں تک نہ بیٹھا جائے۔ اس وقت تک یہ کمی پوری نہیں ہو سکتی۔

تقسیم سے قبل بنگال سے ہر سال کثیر تعداد میں طلبہ دینی تعلیم حاصل کرنے یا اس کے اعلیٰ مدارج طے کرنے کی غرض سے دیو بند، سہارن پور، بنارس دہلی، آگرہ، لکھنؤ اور یوپی، سی پی اور بہار کے دوسرے مقامات پر جایا کرتے تھے۔ چند سال تک زیر تعلیم رہ کر فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اچھی اردو بولتے اور پڑھنے میں کافی دستگاہ حاصل کر لیتے تھے۔ یہ حضرات بنگال واپس آ کر دینی فرائض انجام دینے اور تبلیغ و اشاعت کے کام میں اردو ہی زیادہ استعمال

کرتے تھے۔ اس طرح ان کی صحبت میں اکثر عام لوگوں میں بھی اردو کا مذاق پیدا ہو جاتا تھا۔ ان عوامل سے ناخواندہ لوگوں نے کم مگر پڑھے لکھے لوگوں نے اردو سے کافی شناسائی پیدا کر لی۔

بنگال میں اردو کی ترویج واشاعت میں علی گڑھ یونیورسٹی کا بھی کافی دخل رہا ہے۔ بنگال سے جو طلبہ وہاں پڑھنے جاتے تھے وہ بقول بابائے اردو "تھوڑے ہی دنوں میں ایسی اچھی اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے لگتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی"۔ یہ طالب علم اپنے وطن پہنچ کر اردو کے گن گاتے تھے۔ اور اس کو رواج دینے میں معاون ثابت ہوتے تھے۔

آزادی سے پہلے بنگال کی قدیم درس گاہ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے بھی بنگال میں اردو کو رواج دینے میں بڑی مدد دی۔ اس مدرسے میں ہر سال ایک معقول تعداد میں طلبہ مشرقی پاکستان کے مختلف اضلاع سے پڑھنے کے لئے جاتے تھے۔ چند سال میں فارغ التحصیل ہو کر جب وہ وہاں سے نکلتے تو وہ علم کے سرچشموں سے سیراب ہونے کے بعد زبانِ اردو سے بھی خوب واقفیت حاصل کر لیتے اور اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ کر اردو کی مٹھاس وہاں بھی پہنچاتے۔ گو خالص مشرقی پاکستان کے ہونے کی بنا پر بنگلا سے بھی ان کا تعلق قدرتی ہوتا۔ مگر اردو بولنا، اردو پڑھنا اور اردو لکھنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس سے ان کے مخاطب ہم نشیں اور جلیسوں کا اردو زبان سے اثر پذیر ہونا ناگزیر تھا۔ آزادی کے بعد یہ کام مدرسۂ عالیہ، ڈھاکا سے سر انجام پا رہا ہے۔ اس مدرسے کے بیشتر مدرسین اردو داں ہیں۔ وہ بات چیت اردو میں کرتے ہیں۔ اور درس و تدریس کا کام بھی اردو ہی میں انجام دیتے ہیں۔ اس ماحول سے طالب علموں کا اردو زبان سے متاثر ہونا قدرتی بات ہے۔

بنگال میں اردو زبان کو رواج دینے میں صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کا بڑا دخل رہا۔ یہ دس بیس سال کی بات نہیں، بلکہ صدیوں کی داستان ہے۔ یہ صحیح طور پر طے کرنا مشکل ہے کہ دینِ الٰہی کی تبلیغ کی غرض سے اولیاء اللہ بنگال کی سرزمین پر کب سے وارد ہونے شروع ہوئے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ نامعلوم ماضی سے ان کا فیض یہاں کے باشندوں تک برابر پہنچتا رہا ہے۔ انہی کے یمن قدم سے رفتہ رفتہ سینکڑوں، ہزاروں، بلکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اسلام لاتے رہے۔ اتفاق کی بات ہے ان بزرگانِ دین میں سے اکثر و بیشتر کی زبان اردو یا عربی فارسی تھی، خالص اردو بولنے والے حضرات تو خیر اردو ہی میں مذہب اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ مگر عربی یا فارسی بولنے والے بزرگ بھی جب مقامی لوگوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی غرض سے خود عوام کی زبان سے ناتا جوڑتے تو خواہ مخواہ اردو ہی بیچ میں آجاتی اس طرح لامحالہ اردو کا تھوڑا بہت چرچا لوگوں میں ہو ہی جاتا تھا۔ آج بھی مشرقی پاکستان میں جہاں جہاں خانقاہیں ہیں اور اہل طریقت کے مراکز ہیں۔ سب جگہ اردو کا استعمال عام ہے۔ مشرقی پاکستان میں پیروں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی بزرگ ایسے ہوں، جو اردو سے نابلد ہوں۔ وہ حضرات اردو ہی کے ذریعے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتے اور اپنے مریدوں کو ہدایات جاری کرتے ہیں۔ اس سے لوگوں پر غیر شعوری طور پر اردو کا اثر عام ہے یہی وجہ ہے کہ بنگلا زبان اور علاقائی بولیوں میں اردو، عربی اور فارسی کے ہزاروں لفظ اپنی اصلی یا بگڑی ہوئی شکل میں رائج ہیں۔

مسلمان بادشاہوں، نوابوں اور امیروں نے بھی بنگال میں اردو کی کم خدمات انجام نہیں دیں۔ یہاں کے لوگوں پر ایک طرف اگر اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کا اثر رہا ہے تو دوسری طرف ان فرماں رواؤں کے فیض و برکات بھی کافی رہے ہے۔ ان فرماں رواؤں کا تعلق عرصہ دراز تک دہلی کی مرکزی حکومت سے رہا۔ اور وہ بنگال میں دہلی کے تمدن و تہذیب کی پوری نمائندگی کرتے رہے۔ زبان بھی وہ دہلی ہی کی استعمال

کرتے تھے۔ چنانچہ دہلی کی طرح بنگال کے درباروں میں بھی فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کا رواج برابر ہوتا رہا۔

زمانے گزرے، حالات بدلے، دہلی کا بادشاہ اب برائے نام بادشاہ رہ گیا تھا۔ بنگال کے فرماں رواؤں نے اپنے اپنے علاقوں میں خود مختاری قائم کرلی۔ آگے چل کر آپس میں خانہ جنگیاں بھی ہوئیں۔ اتحاد کی جگہ نفاق نے لے لی۔ امورِ مملکت میں جن لوگوں پر اعتماد تھا۔ انہوں نے صاف غداری کی۔ اس سے بنگال کے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ یہ غیر ملکیوں کی کارستانی تھی۔ ان لوگوں نے گوناگوں جتن تراشے۔ رفتہ رفتہ مسلمان فرماں رواؤں کو زیر کر کے حکومت پر قبضہ کرلیا وہ لوگ۔ جو کچھ ہی دن پہلے محض تجارتی اغراض سے بنگال آئے تھے اب پوری شان و شوکت اور تزک و احتشام سے حکومت کرنے لگے۔ مسلمانوں کو بہت برے دن دیکھنے پڑے۔

ان انقلابات کی وجہ سے زبان و ادب کو بڑا نقصان پہنچا۔ فارسی تو رفتہ رفتہ اپنا اثر کھوتی گئی۔ البتہ اردو بہت سخت جان نکلی وہ کسی نہ کسی طرح رہی اور پاکستان بننے کے بعد پھر سے اس کی قدر ہوئی۔

عرصہ دراز سے پنجاب، یوپی اور بہار سے تجارت پیشہ لوگ بنگال آتے رہے۔ وہ یہاں اپنے کاروباری معاملات میں اردو بے تکلف استعمال کرتے تھے، اور یہاں کے لوگ بھی ان لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے کی وجہ سے اردو ہی میں باتیں کیا کرتے تھے۔

ان چند موٹی موٹی باتوں کے علاوہ، جن کا ذکر اوپر ہوا، اور بھی کچھ عوامل تھے، جن سے بنگال میں اردو کا رواج ہوا۔ مگر اس وقت یہاں سب کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

پاکستان بننے کے بعد مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کے امکانات کافی بڑھ گئے۔ لیکن سن پچاس، اکیاون میں حالات نے یکایک پلٹا کھایا۔ زبان کے مسئلے نے اچانک سیاسی رنگ اختیار کرلیا۔ فضا مکدر ہو گئی۔ یہ مسئلہ ایک عرصے تک ایک نزاعی مسئلہ بنا رہا۔ اس معاملے میں حکومت نے اپنی حکمت عملی سے کام لے کر جو فیصلہ کیا۔ وہ بہر حال سب کو قبول ہے۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ دو قومی زبانیں اختیار کی جائیں ایک ملک اور ایک قوم کے لئے ایک زبان بے شک اتحاد و یگانگت کا زبردست وسیلہ ہے مگر جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کا وجود کچھ اس طرح عمل میں آیا کہ وہ کلیہ اس پر صادق نہ آسکا۔ بصیرت رکھنے والے لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستانی قوم کے لئے دو قومی زبانیں ہی ٹھیک ہیں۔ چنانچہ دونوں زبانیں اب برابر ترقی کر رہی ہیں۔

اردو میں قدرتاً پھلنے پھولنے اور بڑھنے کی عجیب صلاحیت ہے کیونکہ وہ اپنے خمیر میں ہمہ گیر بھی ہے اور صلح کل بھی۔ وہ کسی بھی زبان کی دشمن نہیں، بلکہ سب کی دوست ہی ہے۔ سخت سے سخت مخالف بھی اس کو اپنانے اور اس سے کام لینے پر مجبور ہے۔ اردو میں ہر کوئی تھوڑی سی توجہ اور کوشش سے اپنا ما فی الضمیر ادا کر سکتا ہے۔ اس زبان میں ایک خاص کشش ہے جو آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس میں آفاقیت ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں اس کے قدر دان موجود ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے ممالک میں اس کے بولنے اور پڑھنے والے پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے اور ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو بڑے ذوق و شوق سے اس کا چرچا کرتے ہیں۔ حالانکہ اردو سے ان کا تعلق یا رشتہ دُور کا ہوتا ہے۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ تلاش معاش میں مغربی پاکستان جاتے ہیں تو ان میں سے ان پڑھ سے ان پڑھ آدمی بھی چند روز کے اندر اردو میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا تو خیر پوچھنا ہی کیا ہے۔ البتہ یہ بات اور ہے کہ یہ لوگ کیسی

اردو بولتے ہیں۔ یہ توقع کرنا کہ مشرقی پاکستان کا ہر باشندہ اہل زبان کی طرح اردو بولنے لگے۔ ایک فضول سی بات ہے۔ آخر اہل زبان اور غیر اہل زبان کا فرق تو ہر زبان کے ساتھ ہے۔ اس لئے مذاق اڑانے کے بجائے ہر اردو بولنے والے اور لکھنے والے کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ متحدہ ہندوستان میں اردو ہندو مسلمان اور ہر علاقے کے لوگوں کی مشترکہ زبان رہی ہے۔ اور اب آزادی کے بعد پاکستان کے تمام باشندوں کی یہ اپنی قومی زبان ہے۔

ہمارے خیال میں قیام پاکستان کے بعد، باوجود بعض عوامل کے مشرقی پاکستان میں اردو کو روز بروز فروغ حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں یہاں اردو داں لوگوں کا کثیر تعداد میں، ہجرت کر کے آنا اور ہمیشہ کے لئے یہیں بود و باش اختیار کرنا اور مقامی لوگوں سے راہ و رسم پیدا کرنا اردو کے حق میں بڑا مفید ثابت ہوا۔ اب تو لوگ آپس میں شادی بیاہ بھی کرنے لگے ہیں اور اس طرح ایک نئی پود جنم لے رہی ہے جو دونوں زبانوں سے یکساں تعلق رکھتی ہے دل سے دل مل گیا تو زبانوں کا کیا فرق، ذات پات کا کیا جھگڑا اور رنگ و نسل کا کیا اختلاف! محبت کی زبان تو ایک ہی ہوتی ہے۔ اس قسم کے رشتوں سے اردو کا رواج بڑھتا ہے۔ ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے، جب اردو بولنے والے اور بنگلا بولنے والے آپس میں ملتے ہیں تو اردو کا استعمال کافی ہوتا ہے بعض اوقات آپس کی بات چیت میں انگریزی کا سہارا ضرور لیا جاتا ہے۔ مگر یہ بدیسی زبان کچھ کم مشکل نہیں۔ انگریزی کتنی ہی پڑھ لیں، مسلسل بولتے رہنے سے ہمارے جبڑے میں درد ہونے لگتا ہے۔ اس لئے بعد میں اپنی ہی زبان کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اردو چونکہ زیادہ آسانی سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے سب عموماً اردو ہی میں بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ اردو کی خوش نصیبی ہے۔

مشرقی پاکستان میں ہماری فوجیں ہیں اور ان میں اردو بولنے والے افراد بھی بہت سے ہیں۔ ان کا صبح و شام بنگلا بولنے والے افراد سے سابقہ پڑتا ہے۔ انکی آپس کی بات چیت سے بھی اردو کی ترویج و اشاعت میں بہت مدد ملتی ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اردو بولتے ہیں، وہ دفاتر کے کاموں کے سلسلے میں خود بھی اردو بولتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان سے ترغیب ملتی ہے۔ آزادی سے قبل اردو کے فروغ کے لئے اتنے وسائل بنگال کے اس حصے میں کہاں تھے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے تمام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس سے روز بروز اردو پڑھنے والوں، بولنے والوں اور لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے خیال میں جوں جوں وقت گزرتا جائیگا، مشرقی پاکستان کے لوگ اردو سے زیادہ مانوس ہوتے جائیں گے۔ یوں پاکستان کے لوگوں کو ایک سے زائد زبانیں پڑھنے اور لکھنے کی عادت تو ہمیشہ سے ہے۔ اس بنا پر مشرقی پاکستان کے لوگ اگر بنگلا کے ساتھ اردو اور مغربی پاکستان کے لوگ اردو کیساتھ بنگلا پڑھیں تو اچھا ہوگا۔

اردو زبان و ادب کے اثر سے بنگلا زبان و ادب میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی جب سے پاکستان وجود میں آیا، بنگلا کے شاعر اور ادیب اپنی نگارشات میں کثرت سے عربی فارسی اور اردو الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ بعض اوقات تو ان کی زبان اردو سے بہت قریب ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسم الخط کا فرق اگر نہ رہے تو وہ اردو ہی کہلائی جاسکتی ہے۔ بنگلا زبان و ادب میں یہ روایت نمایاں طور پر مشہور باغی شاعر نذرالاسلام نے قائم کی تھی۔ بعد میں بعض دوسرے شعرا نے بھی زبان کی حد تک ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ کوی غلام مصطفیٰ اس معاملے میں زیادہ کامیاب رہے۔ مگر یہ الگ موضوع ہے۔ اس پر پھر کبھی لکھوں گا۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اردو کا اثر بنگلا زبان و ادب پر کافی پڑ رہا ہے۔ آج مشرقی پاکستان کے شاعر اور ادیب جو زبان لکھتے ہیں وہ کلکتے کے شاعر اور ادیب کی بنگلا سے یقیناً مختلف ہے۔ آج مشرقی پاکستان کی نئی نسل جو نئی زبان سے زیادہ مانوس ہو رہی ہے۔ آیندہ چل کر شاید مغربی بنگال کی بنگلا کو اتنا

سمجھ بھی نہ سکے۔ آج ڈھاکا کے بنگلا اخباروں اور رسالوں میں جو زبان لکھی جاتی ہے، وہ کلکتے کے بنگلا روزناموں اور جریدوں کی زبان سے جدا ہے ایک میں اسلامی تہذیب و تمدن کا عکس جھلکتا ہے اور دوسری میں ہندو دیو مالا اور روایات کا پرتو نظر آتا ہے۔ جو زبان اسلامی تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتی ہے، وہ اردو سے قریب ہے۔

ڈھاکا ہو یا چاٹگام، سلہٹ ہو یا کومیلا، کھلنا ہو یا راج شاہی ہر جگہ اردو بولنے والے، اردو پڑھنے والے اور اردو سمجھنے والے موجود ہیں۔ کچھ نوکر پیشہ ہیں تو کچھ تجارت پیشہ، کچھ مزدور پیشہ ہیں تو کچھ صنعت کار، سبھی اردو بولتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو اردو بولنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ آپس میں دوستانہ بات چیت کرتے ہیں تو اردو میں بلکہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں تو بھی اردو میں۔ ایک آدمی سے پوچھا گیا کہ "یوں تو تم عام طور پر بات چیت بنگلا میں کرتے ہو مگر جب کسی کو گالیاں دینے پر اترتے ہو تو اردو کچھ زیادہ ہی استعمال کرتے ہو۔ یہ کیوں؟" جواب دیا "یار، سچ پوچھو تو گالی دینے کا مزہ اردو ہی میں آتا ہے"۔

جب سے پاکستان بنا ہے، مشرقی پاکستان میں نہ جانے کتنے مشاعرے ہو چکے ہیں اور آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اردو کو مقبول بنانے میں مشاعرہ بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔ ان مشاعروں میں بنگلا بولنے والے حضرات بھی جو ذوق رکھتے ہیں۔ بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ اور بڑی دلچسپی سے سنتے رہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اردو مشاعروں میں بنگلا بولنے والے باذوق حضرات کو زیادہ سے زیادہ شرکت کا موقع دینا چاہیئے۔ اردو شاعری کی یہ روایت انکے لئے نئی ہے۔ اس لئے وہ اردو مشاعرہ سن کر بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ اور اردو سے انہیں ایک قسم کا انس پیدا ہو جاتا ہے۔

اردو فلمیں بھی مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ لوگ اردو فلمیں بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہاں جتنی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ان میں اردو فلموں کا تناسب چالیس پچاس فیصد سے کم نہ ہوگا۔ ڈھاکا شہر کا تو کوئی سوال ہی نہیں، صوبے کے دوسرے شہروں میں بھی اردو فلموں کی نمائش ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں سے قطع نظر عام لوگوں کو بھی اردو مکالمے اور گانے سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ لوگ اردو گانے یاد کر لیتے ہیں اور بعد میں اپنے گھروں میں یا کھیتوں میں کام کرنے کے دوران بڑے مزے سے گاتے ہیں۔ اگر وہ اردو مطلق نہ سمجھتے تو اردو فلمیں اتنی دلچسپی سے ہرگز نہ دیکھتے۔

اسی پس منظر کے ماتحت بابائے اردو کی دلی تمنا تھی کہ مشرقی پاکستان میں اردو کو مزید فروغ دینے کے لئے منظم طور پر کام کیا جائے اس سلسلے میں وہ کیا کیا عملی تدابیر اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہاں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہاں کے مختلف اردو داں اور اردو نواز حضرات کے نام ان کے خطوط سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ اردو کی ترویج و اشاعت کے منصوبوں کو جو وقتاً فوقتاً طے ہوں، عملی جامہ پہنانے کے لئے جہاں جہاں مناسب معلوم ہو، انجمن ترقی اردو کی شاخیں کھولی جائیں۔ تاکہ حسب منشا موثر اقدامات کئے جاسکیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے ماتحت ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی اردو، ڈھاکا وجود میں آئی مولانا محمد اکرم خاں اس کے پہلے صدر، خواجہ نورالدین پہلے جنرل سکریٹری، ڈاکٹر عندلیب شادانی پہلے جوائنٹ سکریٹری اور وحید قیصر ندوی اسسٹنٹ سکریٹری چنے گئے۔ اس کے بعد اس کی کئی کمیٹیاں بنیں اور اپنی اپنی مقررہ معیادیں پوری کر کے اپنے کچھ

نقوش یا یادیں چھوڑ کر ختم ہو گئیں ۔ موجودہ کمیٹی کے صدر مملکت کے مایۂ ناز دانشور جسٹس سید محبوب مرشد اور جنرل سیکرٹری مجیب انصاری ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن کی اور بھی شاخیں ہیں جو اپنے اپنے طور پر اردو کو فروغ دینے کے لئے کچھ نہ کچھ کام کر رہی ہیں ۔

۲۔ انجمن کی ان شاخوں کی وساطت سے بالغوں کے لئے جگہ جگہ شبینہ مدارس قائم کرنے پر بھی بابائے اردو برابر زور دیتے رہے ۔ تاکہ جو لوگ اردو نہ پڑھ سکے تھے، انہیں رات کے فارغ اوقات میں اردو سیکھنے کا موقع میسر آ جائے ۔

۳۔ صوبے کے صدر مقامات پر کتب خانے اور دارالمطالعے قائم کرکے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اردو پڑھنے کا موقع فراہم کرنا بابائے اردو کے عمل منصوبے کا ایک اہم جزو تھا۔ ان میں اردو کی اچھی اچھی اور معیاری کتابیں ، رسالے اور اخبار رکھے جائیں تاکہ جو اردو پڑھ سکتے ہوں وہ اپنا شوق پورا کر سکیں ۔

۴۔ اسکولوں میں اردو کی ابتدائی تعلیم کے لئے آسان زبان میں اردو ریڈریں تیار کرنے کی بھی وہ ایک وقت بڑی کوشش کرتے رہے۔ لیکن چند ناگزیر اسباب کی بنا پر بابائے اردو کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کا انہیں ہمیشہ بڑا افسوس رہا۔ ان مجوزہ ریڈروں میں وہ ان عربی فارسی اور اردو الفاظ کی زیادہ سے زیادہ شمولیت کے حق میں تھے، جو برسوں کے استعمال سے بنگلا زبان کے جزو بن چکے تھے اور بنگلا بولنے والے بچے انہیں بڑی آسانی سے سمجھ سکتے تھے ۔

۵ ۔ بابائے اردو کی ایک تمنا یہ بھی رہی کہ حکومت کی سرپرستی میں بنگلا زبان کا رسم الخط بتدریج عربی رسم الخط میں تبدیل کر دیا جائے ۔ لیکن اس مقصد کے لئے حالات سازگار نہیں ہوتے اور انکی وہ تمنا پوری نہ ہو سکی ۔

۶ ۔ بابائے اردو ذاتی طور پر مشاعروں کے زیادہ قائل نہ تھے ۔ اسی لئے جہاں ممکن ہو سکتا تھا ۔ ان سے اپنا دامن بچا کر چلنے کی کوشش کی ۔ لیکن بالخصوص مشرقی پاکستان کے حق میں وہ مشاعروں کو بہت حد تک مفید سمجھتے تھے ۔ ان کے خیال میں یہاں مشاعرے سن کر اردو کی طرف لوگوں کا رجحان پیدا ہو سکتا تھا ۔ مشاعروں کے ساتھ دیگر ادبی اجتماعات بھی فائدے سے خالی نہ ہوتے ۔

مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بابائے اردو کے یہ چند خیالات حقائق پر مبنی تھے ۔ ان پر انجمن کی سرگرمیوں میں اگر صحیح طور پر عمل کیا جاتا تو اردو کو مزید فروغ حاصل ہونے میں بڑی مدد ملتی ہے ۔ بہر حال ، ہمارے خیال میں مشرقی پاکستان میں اردو کا مستقبل یقیناً نہایت روشن اور تابناک ہے ۔

اسی سلسلے میں یہ بات واضح کر دینی چاہیئے کہ مشرقی پاکستان میں اردو کی ترقی سے بنگلا زبان و ادب کی ترقی پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا ۔ بلکہ رفتہ رفتہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں گی اردو اور بنگلا دونوں قومی زبانیں ہیں ۔ دونوں کی ترقی کے لئے حکومت کا پورا پورا تعاون حاصل ہے ۔ دونوں زبانیں ترقی کرکے ایک دوسرے کے قریب تر ہو جائیں تو ہماری قومی یکجہتی اور زیادہ مستحکم ہوگی ۔ دونوں قومی زبانوں کا اپنی اپنی جگہ پھولنا پھلنا اور پنپنا خیر و برکت کا باعث ہے ۔ کیا اچھا ہو اگر پاکستان کے سب لوگ دونوں زبانیں پڑھنے اور سیکھنے کی کوشش کریں ۔

پروفیسر سید شبیر علی کاظمی



فرد فرید

مولوی صاحب مرحوم کی عظمت کا صحیح اندازہ لگانے اور ان کی لسانی و ادبی کارگزاریوں کا بھرپور جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اردو زبان کی سماجی ثقافتی اور عالمانہ حقیقت پیش نظر رکھیں۔ عام مفروضے کی رو سے اردو زبان مسلمانوں کی ساختہ پرداختہ ہے۔ اس لئے پاک و ہند کے مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی نظریات اور عملی کاوشوں کی آئینہ دار ہے۔ اس نے مسلمانوں کا عروج اور زوال دیکھا ہے اور موجودہ حالات بھی اسکے روبرو ہیں۔ اگر ہم اسکے ارتقا پر غایر نظر ڈالیں تو ہمارے سامنے وہ تمام نشیب و فراز آجائیں گے جن سے مسلمانوں کا ہندی قافلہ گزر کر اس جگہ پہنچا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہم ان واقعات سے بھی دوچار ہوں گے۔ جنہوں نے مولوی عبدالحق کو اردو کا بابا بنا کر حیات ابدی کا تاج انکے سر پر رکھ دیا ہے۔

زبان کی تار و پود میں اس کے بولنے والوں کا ذہن پوشیدہ ہوتا ہے۔ اردو جدید زبانوں میں ایک ہونہار زبان ہے مسلمان جو اسکے جنم داتا اور محافظ ہیں۔ بین الاقوامی نہیں بلکہ بین العالمی نظریۂ حیات رکھتے ہیں۔ اسلام ہمیں دنیا و مافیہا کی تعلیم دیتا ہے اور قرآن پاک اور احادیث نبوی ہمارے لئے قدم قدم پر مشعل راہ ہیں جو عربی زبان میں ہیں اور عربی اپنی جگہ ہر لحاظ سے ایک جامع زبان ہے۔ ایمان اور عقیدے کی رو سے عربی ہمارے لئے لازمی ہے اور اس کا قرار واقعی احترام جزو ایمان ہے لہٰذا دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی دوسری زبانیں خواہ مادری ہوں یا غیر مادری ثانوی حیثیت کی مالک ہیں۔ ہم ابھی تک عالم اسی شخص کو کہتے ہیں جو عربی زبان اور ادب کا ماہر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اردو کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ مسلمان جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو تین زبانیں ہمراہ لائے۔ عربی۔ ترکی اور فارسی۔ عربی تو دین کی زبان ہو گئی اور ابھی تک وہ اپنی جگہ سنبھالے ہوئے ہے اور ہمیشہ اسی حیثیت کی مالک رہیگی۔ ترکی البتہ محلات کی زبان رہی۔ دوسری مقامی زبانوں پر اثر انداز ہوئی لیکن زیادہ نہ پھیلی۔ البتہ ہماری قومی زبان کا نام اسی کا مرہون منت ہے۔ البتہ ناواقف لوگ اس نام کی مناسبت سے ایک ذم کا پہلو بھی نکالتے ہیں۔ فارسی زبان درباری زبان بن گئی۔ سلطنت کے تمام کاروبار اسی زبان میں ہونے لگے صاحبان اقتدار نے لسانی تفوق ضروری سمجھا۔ ہندوستانی فارسی ہرگز ایرانی نہیں تھی۔ بلکہ بقول غالب یہ بھی مسلمانوں کا ساختہ "اردو" تھا۔ اور اس کے مس سے بھی عربی شعاعیں نکلتی تھیں۔ عربی کے مقابلے میں یہ کم علم تھی مگر ہندوستان میں بالخصوص مسلم معاشرے کی ثانوی زبان تھی۔ علما و شرفا عربی و فارسی کو سر چڑھاتے مگر ضرورتوں کے تحت مقامی بولیوں کو بھی منہ لگاتے تھے۔ ان میں سب سے چہیتی ریختہ تھی جو بعدہٗ اردو کہلائی۔ اس طرح مسلم معاشرے میں ہماری قومی زبان تیسرے درجے پر تھی۔ وہ مقامی بولیوں کے زمرے میں تھی اور

پنجابی ۔ برج ۔ کھڑی رادھی ۔ ماگدھی وغیرہ کے ساتھ شاہی نظروں کو تکتی رہتی تھی ۔ بقول ہندی یہ کل کی چھوکری تھی ۔ چھوکری سے رانی بننے کی داستان خاصی طویل ہے ۔ البتہ اس داستان کا ایک اہم اور نمایاں کردار عبدالحق ہے جو عام طور سے بابائے اردو کے نام سے موسوم ہے ۔

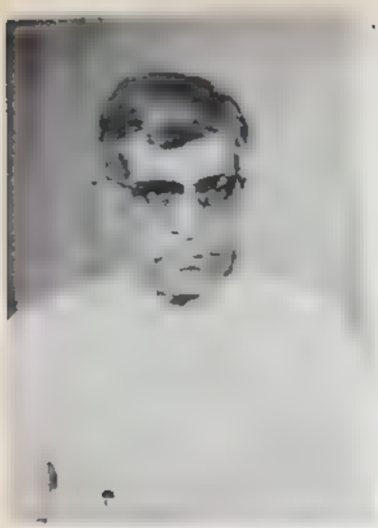
حالات نے پلٹا کھایا ۔ سیاست بدلی ۔ معاشی حالات تبدیل ہوئے چاروناچار لوگوں نے ذہنیت بدلی ۔ سیاسی زوال نے عہد اقتدار کی قدروں کو منھ کے بل گرادیا ۔ غیر مسلم طبقے نے وفاداری کا طوق گلے سے نکال پھینکا ۔ اور اپنی قومیت سنبھالنے کیلئے غیر ہندوستانی اثرات کو معاشرے کے تانے بانے سے باہر نکالنے کی ٹھانی اور اس زبان کو بھی اپنانے سے انکار کردیا جو متفقہ کوششوں کا نتیجہ تھی ۔ اردو میں حسن اتفاق سے مسلمانوں کی ادبی کاوشوں اور ثقافتی رجحانات کی زیادہ ترجمانی تھی ورنہ یوں تو پاک و ہند کی تمام زبانیں اپنے عروج کے لئے مسلمانوں کی نوازشوں کی مرہون منت رہی ہیں ۔ اس طرح فارسی ہوا ہوئی اور اردو معتوب ٹھہری ۔ ادھر انگریزی حکومت مسلمانوں کو ثقافتی طور پر مجروح کرنیکی ٹھان چکی تھی ۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم کو درہم برہم کیا ۔ فارسی جو مسلم اقتدار کی علامت تھی یک قلم ختم ہوئی ۔ اسکی جگہ تو خیر چھوکری اردو کو لا بٹھایا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی سات سمندر پار سے لائی ہوئی زبان انگریزی کو مسلط کردیا ۔ انگریز کی اردو پروری مسلمانوں کی خوشنودی کیلئے نہیں تھی ۔ بلکہ یہ تو ساحرالموط کی " شاخ نبات " تھی اردو بخت جان نے جب انگریزی کے ڈھنگ اختیار کرنے شروع کئے تو کمپنی بہادر کی ایک جنبش نگاہ نے اردو ہندی کا ڈھونگ رچادیا ۔ فورٹ ولیم سے اسکی ابتدا ہوئی اور ۱۸۶۷ء میں یوپی میں کاشی کے باسیوں نے اپنی قومی زبان کا مطالبہ کردیا ۔ یہ ہندی ایک بالکل نئی زبان تھی جو اردو کی شدھی کرکے تیار کی گئی تھی ۔ یہ دراصل ہندو قومیت کی تشکیل جدید کی آواز تھی ۔ مسلمانان ہند اس وقت لسانی یتیم تھے ۔ عربی اور فارسی رائج الوقت سکے نہ تھے ۔ ہندی کو مان نہیں سکتے تھے اور انگریزی کو دھتکار نہیں سکتے تھے ۔ چاروناچار اب پوری طرح اردو کو اپنایا اور اپنے معاشرے کی ثقافتی علامت سمجھ کر اس کو دل سے لگا یا اس کے تحفظ کے ذمہ دار بن بیٹھے ۔ گو عربی اور فارسی دماغوں پر چھائی ہوئی تھی ۔ ابھی دعوت نامہ اور نسخے فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے ۔ دبستان لکھنؤ کی کاوشیں غریب ہندی کے نثر اور اردو پر پیر تسمہ پا بن کر مسلط تھیں ۔ بابائے اردو اس دور کے آخر میں اردو کی دستگیری کے لئے اٹھتے ہیں ۔ سرسید اور علی گڑھ کی تیس سالہ مسلسل کوششوں سے مسلمانوں میں جدید قومیت کا احساس پیدا ہو چلا تھا ۔ مسلمانوں کا بورژوا طبقہ اپنی ثقافت کی سلامتی کے لئے اردو نوازی کا دعویدار بن چکا تھا اور مولوی عبدالحق ہندوستان کے اس طبقے کے نمائندے تھے ۔ انہوں نے اردو کو انگلی پکڑ کر پورے ہندوستان میں گھمایا ۔ ان کے پیر طریقت اس کو کاروباری زبان کی حیثیت سے پہلے ہی روشناس کرا چکے تھے لہذا لوگوں کو اس کے پہچاننے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی اور مسلمانان ہند متفقہ طور پر اردو کی سلامتی کے خواہاں ہو گئے ۔ لیکن شمالی ہند میں ایسے لوگ بھی تھے ۔ جو اپنی علاقائی زبانوں کو اردو کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کو تیار نہ تھے ۔ گو اس کا اظہار وہ لوگ خود کھلم کھلا نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ ثقافت کے تحت دوسرے ہموطنوں کے ہم نوا ہو جاتے تھے ۔ مولوی صاحب اپنے زعم میں اس گورکھ دھندے کو پورے طور پر نہ سمجھ سکے اور وہ بورژوا طبقے کے زور پر آگے بڑھتے چلے گئے ۔ مقامی زبانوں کے بولنے والوں نے اردو کی سلامتی کے محاذ کا ساتھ دیا اور اپنے دلوں کی بات صاف صاف نہیں بتائی ۔ اردو کے فدائی اور بابائے اردو خود خوش فہمی میں مبتلا رہے اور ان پر یہ حقیقت اس وقت روشن ہوئی جبکہ اردو پاکستان کو جنم دے چکی تھی ۔ اب پاکستان میں اس پر جو کچھ گزری یا آئندہ گزرنے کا امکان ہے اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں کیونکہ اس کو مصلحت کیلئے قربان کرنیکی رسم خاصی قدیم ہے ۔ اس سلسلے کی ایک کڑی محسن الملک کی ذات تھی ۔ اور باقی دوسری کڑیوں کا تعین فی الحال قبل از وقت ہے ۔ اس خرابی صورت کی تلاش زبان کے اندر کرنی ہے ۔ دراصل یہ

زبان ایک مخصوص تہذیب اور کلچر کی زبان ہے۔ کسی کلچر کو برقرار رکھنے کیلئے اقتدار اور مادی ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ان کا فقدان ہوگا تو کلچر کمزور اور اس کی پروردہ زبان بے آسرا ہوگی۔ اردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ کسی علاقے کی زبان نہیں۔ اس کے جو گڑھ تھے وہ اب مملکت پاکستان سے باہر ہیں۔ اس صورت حال میں اس کی بقا اسکی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اس میں جذب و تسخیر کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ لیکن اپنے سہارے کھڑے ہونے کی علمی سکت نہیں اور اس لئے اکثر اپنے شیدائیوں کی مصیبت بینی اسے بھگتنی پڑتی ہے اسکے لئے ضروری ہے کہ اس کی جڑیں گہری ہوں اور مقامی اثرات اس کی تنومندی کے ضامن ہوں۔ اس کا اپرائونپن ختم ہوکر اس میں وہ بھاری بھرکم پن پیدا ہوجائے۔ کہ یہ پھر اکھاڑے سے نہ اکھڑ سکے۔ بابائے اردو کو اس کا احساس تھا۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں مقامی الفاظ کو نہایت حسن کے ساتھ استعمال کیاہے وہ ان کی علمیت کی کمی سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"اعلاترین پائے تک پہنچنے کے لئے ہمارے ادب میں جو کمی ہے اسے پورا کیا جائیگا جو خامیاں ہیں ان کی اصلاح کیجائیگی۔ دائرہ تحقیق وسیع ترکیا جائیگا۔ ہر شعبے کو جہاں تک ممکن ہوگا قوی بنانیکی کوشش کیجائیگی اور ہم اپنی ساری ذہنی دماغی اور اخلاقی قوتیں اس عظیم نصب العین کے حصول میں صرف کرینگے جسے ہم اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔"

اردو سماج میں فی الحال ایک خاص قسم کا انتشار ہے، پرانی قدریں بتدریج غائب ہورہی ہیں اور نئی قدروں نے پوری طرح اپنا تسلط نہیں جمایا ہے۔ اس لئے ہمارے معاشرے میں کہیں اوچھاپن اور کہیں نودولتیاپن نمایاں ہے۔ اس صورت میں ہم میں کچھ ذاتی مصلحتوں کی خاطر اپنی ثقافت اور زبان کو غیر ملکی چمک پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہ چیز اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ کم ہوگی جب معاشرے میں ٹھہراؤ پیدا ہوجائیگا تو اس قسم کا انتشار بھی ختم ہوجائیگا۔ اردو داں طبقے پر بقائے اردو کے لئے دوگونہ فرائض عائد ہوگئے ہیں۔ اول تو زبان کی ترویج واشاعت، اور دوم تخلیق ادب، ان دونوں کے لئے صبر و تحمل کے ساتھ امن اور چین کی بھی ضرورت ہے۔ ترویج واشاعت کیلئے ہمیں مقامی رنگ اپنانا ہوگا اور علمیت کی کمی کے لئے علم کی مختلف شاخوں کو اردو میں منتقل کرنا ہوگا۔ اور ایسے عالم پیدا کرنے ہونگے جو مختلف علوم پر اپنے نظریات پیش کرسکیں۔ ترجمے ہماری زیادہ دستگیری نہیں کرسکتے اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے بابائے اردو نے اردو یونیورسٹی کا ڈول ڈالا تھا۔

غرضکہ مولوی صاحب نے سرسید کے مشن کو آگے بڑھایا اور اردو کو صحیح معنوں میں پاک وہند کی لنگوا فرینکا بناکر پیش کیا۔ ان کی کوششوں سے انجمن اور اردو اہل علم اور اہل سیاست کے مرجع اور ماویٰ بن گئے۔ اور وہ خود پاک وہند کے زعما میں شریک ہوگئے۔ مگر انہیں ذاتی شان وشوکت اور نام ونمود سے لگاؤ نہ تھا۔ وہ سب کچھ اردو کی خاطر کرتے اور جو کچھ ہوتا اردو پر لٹا دیتے۔ اس پچاس سال کی بھاگ دوڑ میں ان سے لغزشیں ہوئی ہیں لیکن انکی نیت ہمیشہ نیک تھی۔ انھوں نے دراصل زبان کو اس قابل بنادیا کہ ہم اب اس کی خدمت کرکے شہرت حاصل کرسکتے ہیں یہ چھوٹی کہی۔ اس کو رانی بناکر روشناس کرانے والا کون تھا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں تو بے ساختہ ہمارے منھ سے نکلے گا کہ ——
"بابائے اردو۔"



محی الدین احمد

مشاہدات

رسالہ قومی زبان کے بابائے اُردو نمبر بابت ماہ اگست ۱۹۶۶ء میں مولوی محمد اسماعیل صاحب پانی پتی کا ایک مضمون "مشاہدات" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مولوی عبدالحق صاحب کی ادبی خدمات اور انجمن ترقی اُردو کے رسالے "اُردو" کے بارے میں فاضل مضمون نگار نے جو باتیں تحریر کی ہیں ان کو موصوف کی غلط فہمی پر محمول کرتے ہوئے، ایڈیٹر قومی زبان نے اپنے فٹ نوٹ میں بوجہ احسن جواب دے دیا ہے۔ البتہ ایک معاملہ ایسا ہے جس کی وضاحت میں کرنا چاہتا ہوں۔

محمد اسماعیل صاحب پانی پتی نے جب وہ خواجہ سجاد حسین کے ساتھ چندا لینے کے لیے حیدرآباد آئے تھے، اس موقع کے تاثرات و مشاہدات پیش کیے ہیں۔ لیکن ان کے بیانات حد درجہ گمراہ کن ہیں۔ مضمون نگار کی غلط بیانیوں کا اندازہ مندرجہ ذیل امور سے ہو سکتا ہے۔

جب موصوف بھوپال میں تھے، مولوی صاحب نے انھیں بذریعہ تار اطلاع دی کہ "کرنل ٹرنچ وزیر مالیات کے نام وائسرائے یا گورنر پنجاب کی چٹھی ہو تو حیدرآباد آئیں ورنہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں"۔ اس ضمن میں حسب ذیل امور لائق غور ہیں۔

(الف) کرنل ٹرنچ وزیر مالیات (فینانس) کبھی نہیں رہے۔ وہ وزیر مالگزاری (ریونیو) ضرور تھے۔ ان کے تحت صرف مالگزاری کے محکمے، اراضی، بندوبست، کروڑ گیری (کسٹم)، جنگلات وغیرہ تھے۔ سررشتۂ تعلیمات یا تعلیمی امور میں امداد اور مالیات کے کسی بھی شعبے سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

(ب) وائسرائے ہند کی سفارشی چٹھی کرنل ٹرنچ جیسے معمولی عہدے دار کے نام حاصل کرنا کوئی سمجھدار آدمی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس کے نام کسی کلکٹر کی چٹھی بھی کافی تھی۔ بشرطیکہ اُس کے اختیار میں یہ معاملہ ہوتا۔ مولوی سجاد حسین بیس ہزار روپے نقد اور ماہانہ امداد جاری کرانے آئے تھے۔ اتنی بڑی رقم کی منظوری وزیر مالیات تو کیا بجز ذات شاہانہ کے صدر اعظم کے اختیار میں بھی نہ تھی۔ اگر وائسرائے کی چٹھی اعلیٰ حضرت حضور نظام کے نام لانے کے لیے کہتے تو خیر ایک بات بھی تھی۔ فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں" نواب فخر یار جنگ مرحوم نے مشورہ دیا تھا کہ درخواست پیش کرنے سے قبل کرنل ٹرنچ سے ضرور مل لیں"۔ تعجب ہے کہ نواب فخر یار جنگ جو فینانس سکریٹری تھے، ایسا غلط مشورہ کیسے دیتے۔ کیا نواب صاحب یہ نہ جانتے تھے کہ ایک غیر متعلقہ عہدے دار کو درخواست دینا غیر مفید ہوگا۔

فاضل مضمون نگار نے تحریر فرمایا ہے "خواجہ سجاد حسین جب ڈائرکٹر تعلیمات تھے کرنل ٹریخ ان کے اسسٹنٹ تھے۔ اس سلسلے میں میری معلومات کا ذریعہ بجز کرنل ٹریخ کے سوانح ملازمت مرتبہ محکمہ فنانس کے کچھ اور نہیں۔ میرے خیال میں یہی ایک مستند ماخذ ہے۔ اس میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ وہ کبھی سررشتہ تعلیمات سے متعلق رہے ہیں۔ لکھا ہے کہ فوج میں ملازمت کا آغاز کیا۔ اس کے بعد بھوپال میں پولیٹیکل خدمات پر لیے گئے اور سندھ و بلوچستان میں گورنر جنرل کے پولیٹیکل ایجنٹ بھی رہے۔ بعدازاں مدراس میں ریونیو کمشنر بنائے گئے۔ وہاں سے گورنمنٹ نظام نے ان کی خدمات حاصل کیں۔

دوسرا واقعہ محمد اسماعیل صاحب نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ مہاراجا سرکشن پرشاد کی لڑکی کے انتقال پر وہ اور خواجہ سجاد حسین تعزیت ادا کرنے کے لیے گئے تھے، وہاں مولوی عبدالحق صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مہاراجا بہادر کے سامنے کسی مسلمان کے متعلق گفتگو کی۔ مضمون نگار یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مولوی عبدالحق نے اس موقع پر ایسی گفتگو چھیڑی جو ایک مسلمان کے شایان شان نہ تھی۔ اس طرح مولوی صاحب پر انھوں نے خوشامد کا الزام عاید کیا ہے۔

اس خصوص میں مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے، صرف اتنا عرض کروں گا کہ مولوی عبدالحق صاحب اور مہاراجا سرکشن پرشاد کے مزاج اور ان کے کردار سے جو شخص ناواقف ہے وہ تو اس بیان کو درست مان لے گا لیکن جو لوگ ان دونوں کو جانتے ہیں وہ اسے ایک مضحکہ خیز اتہام ہی کہیں گے۔

مہاراجا سرکشن پرشاد جو نہ ہندو تھے نہ مسلمان، نہ یہودی تھے نہ عیسائی، اُن کا مذہب انسانیت اور مسلک تصوف تھا۔ ان کے دربار میں کسی بڑے سے بڑے شخص کی مجال نہ تھی کہ کسی دوسرے مذہب پر حملہ کرے یا کسی پر تنقید کرے۔ وہ ایسی باتوں سے سخت ناخوش ہوتے تھے، بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ایسی حرکت کرنے والے کو اپنے دربار سے نکلوا دیا۔

دوسری طرف یہ کہ مولوی عبدالحق خوشامد کے فن سے قطعاً ناآشنا تھے چنانچہ میں اپنے ایک مضمون "مولوی عبدالحق کی چند کمزوریاں" میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ مضمون "قومی زبان" میں شائع ہو چکا ہے۔

ایک واقعہ سُنیے کہ حیدرآباد کے ایک بہت بڑے امیر جن کی جاگیر مہاراجا بہادر کی جاگیر سے کئی گنا بڑی تھی۔ وہ وائی پائیگاہ کہلاتے تھے وہ حضور نظام کے اقارب سے بھی تھے۔ جب وہ وزیر تعلیمات تھے اُس زمانے میں مولوی صاحب نے ایک معاملے میں انھیں بڑا سخت جواب دیا تھا۔ ان حالات میں کون یقین کرے گا کہ مولوی صاحب نے مہاراجا شاد کے دربار میں ایسا کہا ہوگا۔ میں اس کو ایک جھوٹ اور صریحاً بہتان تصور کرتا ہوں۔

بیان کرتے ہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب نے خواجہ سجاد حسین اور مولوی اسمٰعیل پانی پتی کی دعوت اپنے بنگلے واقع "بنجارہ ہلز" پر کی تھی۔ ایک مضحکہ خیز جھوٹ دیکھیے کہ یہ بنگلا کسی ڈاکوؤں کی پناہ گاہ تھا۔

میرا خاندان نواب آصف جاہ کے وقت سے یہاں آباد ہے۔ اور میرے مورث اعلیٰ نواب صاحب ممدوح کے ساتھ آئے تھے۔ گویا میں یہاں آٹھ پشتوں سے رہتا ہوں، لیکن میں نے یا میرے بزرگوں نے کبھی یہ نہ سُنا کہ شہر حیدرآباد کے مضافات میں کوئی ڈاکو بھی رہتا تھا۔ ہم باشندگان حیدرآباد کے لیے یہ ایک نئی اور انوکھی اطلاع ہے۔

اسماعیل صاحب فرماتے ہیں کہ نظام کی پولیس نے بڑی جدوجہد سے اس ڈاکو کو گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھا دیا۔

حیدرآباد کا ہر شخص جانتا ہے کہ جب سے اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں تخت نشین ہوئے کسی کو بھی سزائے موت نہیں دی گئی۔ ان سے پہلے اعلیٰ حضرت مرحوم نواب میر محبوب علی خاں کے زمانۂ حکومت میں صرف قاتلین کو سزائے موت دی جاتی تھی اور وہ بھی پھانسی کے ذریعہ نہیں بلکہ قصاص میں گردن ماری جاتی تھی۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں کے دورِ حکمرانی میں جب کبھی قتل کے ملزمین کو عدالت العالیہ سے سزائے موت سنائی جاتی تو مفتی عدالت العالیہ کے فتوے کے ساتھ کارروائی بغرض منظوری پیش گاہ سرکار میں پیش ہوتی اور اس پر اعلیٰ حضرت یہ تجویز کرکے واپس کرتے کہ "براحم خسروانہ سزائے موت کو سزائے حبس دوام میں تبدیل کرتے ہیں۔"

لہٰذا اس طرح بھی مولوی محمد اسماعیل کا بیان درست نہیں۔ فرماتے ہیں کہ "یہ بنگلا مولوی صاحب کو سرکار سے الاٹ کیا گیا تھا۔"

بالکل غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء/۲۵ء کے درمیانی زمانے میں مولوی سید محمد مہدی صاحب نے جو بعد میں نواب مہدی نواز جنگ کے خطاب سے ملقب ہوئے (انقلاب حیدرآباد کے بعد گورنر گجرات ہوئے۔ حال میں مرحوم ہوئے ہیں) اس پہاڑی پر ایک کالونی قائم فرمائی تھی اور اس جگہ چند متمول لوگ اور بڑے بڑے عہدے داروں نے اپنے اپنے بنگلے تعمیر کرائے۔ اس سے پہلے نہ کوئی آبادی تھی اور نہ کوئی مکان تھا۔ مولوی صاحب جس مکان میں فروکش تھے وہ ایک نامی گرامی تاجر کا تھا۔ مولوی صاحب سے پہلے اس میں مسٹر اسپیٹ پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ کرایہ سے رہتے تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد مولوی صاحب نے اسے کرایہ پر حاصل کیا۔ اس بنگلے تک جانے کے لیے ایک وسیع و کشادہ سڑک اس وقت بھی تھی اور اب بھی ہے۔ بنگلا نہایت پر فضا مقام پر پہاڑی کی سب سے اونچی چوٹی پر بنایا گیا ہے۔ اس کی اس خوش سوادی اور خوش منظری کی وجہ سے مولوی صاحب نے اسے اپنی سکونت کے لیے پسند کیا تھا۔ مولوی صاحب کے پاس موٹر تھی اور وہ اسی میں یہاں آتے جاتے تھے۔ اور موٹر بنگلے کے نہ صرف پھاٹک تک بلکہ سیڑھیوں تک بلا تکلف پہنچتی تھی۔ معلوم نہیں مضمون نگار صاحب نے یہ کیا لکھ دیا کہ ان کو وہاں پہنچنے میں خاردار جھاڑیوں کی وجہ سے بڑی تکلیف ہوتی۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مضمون میں میں نے ان واقعات کی تردید مناسب سمجھی ہے جو حیدرآباد سے متعلق غلط لکھے گئے ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لیے میں غالب کا ہم زبان ہو کر کہتا ہوں کہ :۔

"ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے"

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی ساری عمر اُردو ادب کی خدمت میں گزری ہے، جو اعلیٰ کام کیا ہے وہ کسی اُردو داں سے پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے جس دلیری اور جس سچے جذبۂ ایثار کے ساتھ زبان اُردو کی حمایت میں اپنے آپ کو سینہ سپر کیا ہے اس کے لیے جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کافی الفاظ نہیں مل سکتے۔

سر شیخ محمد عبدالقادر


بزم
عبدالحق

شمیم احمد



ڈاکٹر سیّد عابد حسین

انسان کے قول اور عمل میں تضاد ایک فطری خاصّہ بھی ہے اور انسانی زندگی کا سب سے کٹھن مرحلہ بھی۔ آدمی اور انسان کے درمیان یہی تفاوت مانا گیا ہے کہ آدمی مجموعۂ اضداد ہوتا ہے لیکن وہ انسان اسی وقت بنتا ہے جب اس کی تکمیل ہو جائے اور آدمی کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب تمام تضادات مٹ کر ایک اکائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ایک مکمل ہم آہنگی کے ساتھ جو کچھ سوچتا ہے اس پر عمل کرنے لگتا ہے۔ یہیں قول و فعل میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی انسانیت کا مفہوم ہے۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے دنیا کے تمام برگزیدہ انسانوں اور پیغمبروں نے بڑے بڑے دکھ جھیل کر اپنی ذات کو اس تصور کا عملی پیکر بنا کر دکھایا اور ابتدائے تاریخ سے ہمیں تمام بڑے اور عظیم انسانوں کی سب سے مشترک خصوصیت یہی نظر آتی ہے کہ ان میں قول و فعل کی مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہی وہ عظیم تر قوت ہے کہ جب کسی قوم میں نمو کرتی ہے تو وہ تمام اقوام عالم کے سر کا تاج بن جاتی ہے۔ اور اس کا زوال اسی وقت ہوتا ہے جب ان میں قول اور فعل کے تضاد کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی لئے تمام معاشروں میں تمام آدرش پرست انسانوں نے قول و فعل کی اس منزل کو "خیر" کا سب سے بڑا مظہر سمجھا۔

برصغیر کی آزادی کی تحریکوں کے زمانے میں جن افراد نے اس آدرش پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ ان میں ڈاکٹر عابد حسین کو خاص مقام حاصل رہا ہے۔ اُن کی علمی صلاحیتوں، ذکاوت، ترجمے کی اہلیت اور اِن سب سے زیادہ اُن کے بے پناہ خلوص اور شرافت نفسی نے اُن کی تحریریں جو جان ڈال دی تھی اس سے ایک نہیں کئی نسلوں نے فیض اٹھایا ہے۔ اور صرف جمالیاتی یا ادبی فیض ہی نہیں بلکہ اُن کے ترجموں، ان کی منتخب کردہ کتابوں اور اُن کی تحریک کے "صدق مقال" نے پڑھنے والوں کی شخصیت پر گہری چھاپ بھی لگائی ہے اور انھیں اندر سے بدلا بھی ہے۔

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے ڈاکٹر عابد حسین کو دیکھنے، اُن سے بات چیت کرنے اور اُن سے چند سوالات کرنے کا موقع پچھلے دنوں اتفاق سے مل گیا جب ڈاکٹر صاحب کسی بیرونی دورے سے واپسی پر پاکستان بھی ٹھہرے۔ ڈاکٹر

عابد حسین ایک نیشلسٹ مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان کی بڑی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مگر اُن سے نظریاتی اختلاف کے باوجود اُن کی وسعت نظر، خلوص، انسان دوستی، شرافت نفسی اور ہر آدمی سے محبت انھیں نظریاتی مخالف کی نظر میں ایک محبوب شخصیت بنا دیتی ہے جس کی عزت خود بخود دل میں گھر کرنے لگتی ہے۔

جو صاحب میرے سامنے بیٹھے ہیں ایک پستہ قد، متوسط بدن، سانولے رنگ کے ایک ایسے نستعلیق سے بزرگ صفت انسان ہیں جن میں دو باتیں نظر پڑتے ہی آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں۔ ایک تو سادگی اور دوسرے اُن کا سر جو اُن کے باقی جسم سے تناسب میں بڑا نظر آتا ہے۔ دماغ اور سادگی ہر بڑی شخصیت اور ہر انسان دوست ہستی کا سب سے نمایاں وصف رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زبان میں لکنت ہے جو اُن کی خارجی سادگی کو اُن کی باطنی سادگی سے ملانے کا غالباً مجھے سب سے موثر ذریعۂ اظہار محسوس ہوئی۔ اُن کے لہجے کا ٹھہراؤ چھوٹے چھوٹے مگر جامع جملے اور شائستگی یہ سب باتیں اب دور کی باتیں معلوم ہونے لگی ہیں۔

سب سے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب سے مولوی عبدالحق کے بارے میں سوالات کیے جن کے بارے میں انھوں نے بہت تفصیلی گفتگو تو نہیں کی مگر مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ جوابات کے اختصار میں جو بلاغت پوشیدہ ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب اپنے بارے میں کچھ کہنے سے گریز کرنا چاہ رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جب میں یورپ سے واپس آیا تو میرے لئے ہندوستان میں بہت سی ایسی شخصیتیں



تھیں جن سے میں اُن کے کردار، قول و عمل، ہم آہنگی، مقصد کے خلوص اور اُن کی قربانیوں کی بنا پر متاثر تھا مگر مولوی عبدالحق یقیناً میرے ذہن میں اُن گنی چنی شخصیتوں میں تھے اور بہت اہمیت رکھتے تھے جو تن تنہا پوری تحریک کے ہم پلّا اور ہم معنی تھے۔ جذبے کی صداقت اور دل و دماغ کا یہ خلوص صرف ایسے ہی افراد میں نظر آتا ہے جن کے لئے منزل اہم نہیں ہوتی بلکہ راہ منزل اہم ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب نے مولوی صاحب کی خواہش پر اپنی خدمات انھیں پیش کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میرے اور مولوی صاحب کے تعلقات اورنگ آباد سے لے کر دہلی تک مستقل رہے۔ میرے اور اُن کے درمیان خلوص کی جو حد و ابتدا سے موجود تھیں وہ آخر دم تک رہیں۔ حالانکہ اردو کے سلسلے میں ایک بار وہ مجھ سے برہم بھی ہو گئے۔ مگر یہ برہمی وقتی اور فروعی تھی۔ اس سے ایک لمحے کے لئے بھی نہ میرے دل میں اور نہ مولوی صاحب کے دل میں کوئی کدورت پیدا ہوئی، اور نہ بے اعتباری۔ یہ واقعہ یوں تھا کہ ناگپور کانفرنس میں مولوی صاحب نے گاندھی جی سے ایک ایسا قول منسوب کیا جو دراصل انھوں نے ادا نہیں کیا تھا۔ اور اس کی بنیاد پر ہندو اور کانگریس کی تنگ نظری کی ایک بہت بڑی تحریک چلا دی جس نے عام مسلمانوں کے اعتبار سے ہندو ذہنیت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اور اردو کے مسئلے کو دو قوموں کی جنگ بنا دیا تھا۔ جب کہ جیسا میں نے ابھی کہا ہے یہ بات گاندھی جی نے ایک میرے سے کبھی ہی نہیں تھی۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت میرے ایک ایسے ساتھی کی وہاں موجودگی تھی جو جامعہ ملیہ دہلی میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کی تقریر کے تمام جملے مجھے سنائے اور اس قول کی صحت سے انکار کیا۔ خود گاندھی جی بھی اس سے منکر تھے۔ میرا اپنا ذاتی خیال یہ تھا کہ چونکہ مولوی صاحب ذرا اونچا سنتے تھے۔ انھیں کسی جملے سے سہو ہوا۔ دوسرے یہ کہ مولوی صاحب اردو کے مسئلے پر اس قدر بھرے بیٹھے تھے اور اردو کے لئے اتنے بیتاب تھے کہ انھیں کوئی معمولی اشارہ بھی غلط فہمی میں مبتلا کر سکتا تھا۔ مولوی صاحب کو میرے خیالات کا علم تھا جب ان سے ملاقات ہوئی تو بہت برہمی سے انھوں نے کہا کہ تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو اور میرے ساتھی کے متعلق ایک غیظ کا جملہ کہہ کر مجھ سے پوچھا کہ اسے مجھ سے زیادہ راست گو سمجھتے ہو۔ میں نے نہایت ادب سے وہ معروضات پیش کر دیں جو ابھی بیان کی جا چکی ہیں۔ مگر مولوی صاحب کی برہمی اس وقت نہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے دوسرے مسائل پر پھر اسی طرح گفتگو کرنے لگے جیسے ہمیشہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے بہت اختصار سے کام لیتے ہوئے فرمایا کہ جس زمانے میں مولوی صاحب نے آکسفرڈ کنسائیز ڈکشنری کے ترجمے کا خیال کیا تھا انھوں نے مجھے بطور خاص اورنگ آباد بلایا اور مجھے اس کام پر مامور کیا۔ یہ کام میں کرتا رہا۔ اور دہلی سے انھیں بھیجتا رہا۔ کبھی خود بھی چلا جاتا تھا۔ اس ڈکشنری کا خاصا حصہ کرنے کے بعد بھی کافی کام باقی تھا۔ اور مولوی صاحب کو بہت جلدی تھی اور میں اُن کی توقع کے مطابق یہ کام مقررہ مدت میں کر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے انھوں نے بعد میں کئی افراد سے یہ کام لے کر اپنے منصوبے کو جلد از جلد تکمیل تک پہنچا دیا۔

ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے خیال میں مولوی صاحب کی تین خصوصیات ایسی ہیں جو اُن کے ہم عصروں میں ناپید تھیں۔ اور یہی اُن کی انفرادیت کا سب سے نمایاں عنصر ہیں۔ اردو سے ایسی محبت کہ اردو اور مولوی عبدالحق تقریباً ہم معنی ہو گئے ہیں۔ مقصد کے لئے سراپا عمل بن جانا۔ مولوی صاحب کی ساری زندگی صرف "عمل" رہی ہے۔ اردو کے لئے اُن کے عمل کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ تیسری اور آخری خصوصیت اُن کا وہ منفرد اسلوب اور طرز تحریر ہے جو اردو کے لئے نہ صرف ضروری ہے بلکہ اس کے

لئے منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلوب کے سلسلے میں میرے ایک سوال پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس بات کی وضاحت کر دی۔ اُن کا کہنا تھا کہ ایک انصاف پسند اور حقیقی معنوں میں اردو کے پرستار کی حیثیت سے ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ اردو دنیا کی بڑی زبانوں میں شامل ہو جانے کی باوجود ادبی لحاظ سے اور خصوصیت سے نثری اعتبار سے بہت کم مایہ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اور مشرقی زبانوں کی طرح اردو کا بنیادی مزاج شعری ہے۔ اور اس کا بہترین سرمایہ شاعری میں ہی ظہور میں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر میں مقفٰی عبارت کی طرف رجحان رہا ہے اور آج بھی یہ مزاج کسی نہ کسی طرح اکثریت کے اسلوب میں جھلک اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ رجحان اردو نثر کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جب تک کوئی زبان ہر قسم کے خیالات، محسوسات اور علوم کو وضاحت سے بیان کرنے پر قادر نہ ہو وہ ترقی کے عروج تک نہیں پہنچ سکتی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں بنیادی ضرورت اسلوب نہیں بلکہ زبان کی وسعت اور الفاظ کی تعداد ہے۔ جس کے ذریعے مافی الضمیر پوری طرح ادا کیا جا سکے۔ اور سادگی سے ادا کیا جا سکے۔ اسلوب کی منزل بہت بعد کی ہے۔ عابد صاحب نے کہا سرسید سے مولوی عبدالحق تک سب کے ذہنوں میں یہ بات رہی ہے اور اردو کو سب سے زیادہ فائدہ اسی سے پہنچا ہے۔ خصوصیت سے مولوی صاحب کی طرزِ تحریر اور اسلوب کو وہ اردو نثر کی معیاری ترین نثر قرار دیتے ہیں۔ میرے ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مجھے ذاتی طور پر شبلیؔ کی نثر بھی بہت پسند ہے اور اس میں اسلوب کی رنگینی سب سے زیادہ دلکش نظر آتی ہے۔ مگر یہ دل کشی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ وہ محض اسلوب نہیں۔ بلکہ اُن کے لئے بنیادی طور پر ہر خیال کو وضاحت اور سادگی کے ساتھ پیش کرنے کی سعی سب سے زیادہ اہم ہے' یہ بات الگ ہے کہ اس میں بھی رنگینیٔ عبارت نظر آ رہی ہو۔ نئے لکھنے والوں میں انھوں نے آل احمد سرور کی عبارت کو اسی شعری مزاج کا حاصل قرار دیا۔ اور کہا کہ اُن کے ہاں تنقید سے زیادہ خوبصورت عبارت لکھنے کی کوشش ملتی ہے۔

ہندوستان میں اردو کے سلسلے میں میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ اردو کو تقسیم ہند سے جو بظاہر نقصان پہنچا ہے وہ میرے نزدیک ایک تاریخی عمل ہے۔ جس کے لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ ہو جاتا' دراصل لسانی مسئلے کو معروضی طور پر دیکھنا چاہیئے۔ آج بھی اردو ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ رسم الخط سے قطع نظر عوامی سطح پر اردو ہی بولی جاتی ہے۔ جہاں تک مستقبل کا سوال ہے اردو کی یہ خصوصیت باقی رہے گی۔ رسم الخط بھی پوری طرح ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جب تک مسلمان ہندوستان میں موجود ہیں اردو کا اپنا رسم الخط بھی زندہ رہے گا۔ ہندی رسم الخط کے ساتھ وہ اپنی مادری زبان کو دونوں طرح لکھتے رہیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کو چند گھنٹوں بعد ہندوستان روانہ ہونا تھا۔ اور میں نے اُن کا خاصا وقت لے لیا تھا۔ اس لئے بہت سے سوالات کو نظر انداز کر کے میں نے اُن سے ذاتی سوالات کئے۔ اس پر انھوں نے بڑی سادگی سے کہا کہ میری ذاتی زندگی آپ کے کس کام کی۔ مگر میرے اصرار پر انھوں نے اپنی زندگی کے چند اہم نکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا " میں ۱۸۹۶ء میں بھوپال میں پیدا ہوا۔ میرے والد مرحوم سید حامد حسین ایک معمولی ملازمت پر فائز تھے۔ ہمارے گھر کی فضا خالصتاً مذہبی تھی۔ اسی لئے ابتداً

مذہبی تعلیم اور عربی فارسی کی تعلیم کی طرف رجحان ہوا۔ جس کی وجہ سے میری باقاعدہ تعلیم کافی دیر میں شروع ہوئی۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ میں ۱۹۱۱ء میں بھوپال کے جہانگیریہ ہائی اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں میٹرک درجہ اول میں پاس کیا تو وظیفہ مل گیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے میور سنٹرل کالج الہ آباد میں داخل ہوا۔ بی اے میں بھی فرسٹ کلاس آئی فلسفہ۔ فارسی اور انگریزی ادبیات میرے مضمون تھے۔ پھر ایم اے انگریزی میں داخلہ علی گڑھ میں لیا۔ مگر اس زمانے میں یہاں طلبہ میں عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس لئے ایک سال بیکار گیا پھر ریاست بھوپال کے وظیفے پر ۱۹۲۰ء میں انگلینڈ روانہ ہو گیا۔ یہاں آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کیا۔ مگر وظیفے کی رقم کم ہونے کی وجہ سے یہاں یکسوئی سے تعلیم حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ جرمنی یہاں کے مقابلے میں سستا تھا۔ اس لئے وہاں چلا گیا۔ یہاں سے ۱۹۲۵ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ اور یہیں ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب سے وہ تعلقات قائم ہوئے جن کو اب نصف صدی ہونے میں چند سال باقی ہیں۔ یہ بات بھولنے کی نہیں ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے یہ پاپڑ بیلنے کے بعد ان تینوں حضرات نے اپنی ساری زندگی قوم کے لئے وقف کر دی اور جامعہ ملیہ دہلی کو معمولی مشاہرے پر اپنی تمام خدمات پیش کر دیں۔

ڈاکٹر صاحب آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ اور بڑے بڑے علمی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ ڈاکٹر عابد حسین جنھوں نے اردو ادب کو بعض اعلیٰ اعلیٰ ترجموں سے نوازا ہے۔ جس نے اعلا ادب اُردو کی راہ دکھائی ہے۔ "مکالمات افلاطون" "نفسیات عنفوان شباب" "جگ بیتی" "مشرق و مغرب کی کشمکش" اور "فاوسٹ" کی افادیت اور ان کے اعلیٰ ادبی ترجمے سے کون ہے جو واقف نہیں۔ اور پھر ڈاکٹر صاحب کی عبارت جو ان کے اپنے نظریئے اور زندگی کی سب سے بڑی تفسیر ہے۔ خدا انھیں تادیر اردو ادب کی خدمت کے لئے زندہ رکھے۔



ڈاکٹر عابد حسین بابائے اردو کے مزار پر

پروفیسر عبدالقوی دسنوی

علامہ محوی صدیقی

جس زمانے میں مولوی عبدالحق صاحب اورنگ آباد میں صدر مہتمم تعلیمات کے عہدے پر فائز تھے۔ اسی دوران قیام میں انھوں نے انجمن ترقی اُردو کا دفتر وہاں قائم کیا تھا اور چند کتابوں کی اشاعت کا پروگرام تیار کیا تھا۔ مولوی صاحب کے مولانا ظفرالملک علوی کاکوری اڈیٹر "الناظر" سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ اُنھی کے مشورے سے لکھنؤ میں انجمن ترقی اُردو کا شعبۂ دارالاشاعت قائم کیا گیا تھا۔ علامہ محوی اس زمانے میں "الناظر" کے اسسٹنٹ اڈیٹر اور مینجر تھے اور مولوی ظفرالملک اڈیٹر اور مالک تھے۔ انھوں نے الناظر پریس اور بک ایجنسی بھی قائم کی تھی۔ انھوں نے ہی دارالاشاعت انجمن ترقی اُردو کے مہتمم کے فرائض محوی صاحب کے سپرد کیے تھے اور انجمن کی کتابوں کی اشاعت کی ذمے داری ان کے سپرد کی تھی۔ غالباً سب سے پہلی کتاب مولانا عبدالماجد دریابادی کی "فلسفہ جذبات" وہاں سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ طبقات الارض، مقدمات الطبیعیات (مشہور جرمنی مصنف پلوٹارک کی کتاب کا ترجمہ) مشاہیر یونان وروما، وغیرہ کتابیں شائع ہوئی تھیں۔

اس وقت تک مولوی عبدالحق صاحب سے محوی صاحب کی ملاقات نہیں ہوئی تھی بلکہ مولانا ظفرالملک اپنے خطوط میں ان کا تذکرہ کردیا کرتے تھے غالباً انھی دنوں سب سے پہلی کانفرنس قیصر باغ لکھنؤ میں منعقد ہونے کی تجویز مولوی صاحب نے رکھی۔ چنانچہ اس کی تیاری میں محوی صاحب مولانا ظفرالملک کے ساتھ ساتھ رہے۔ جب مولوی صاحب لکھنؤ تشریف لائے تو ظفرالملک صاحب نے ان کا تعارف کرایا اور ان کے عملی کاموں کا پرزور الفاظ میں تذکرہ کیا۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوتے اور یہیں سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔

چند سال بعد محوی صاحب بھوپال تشریف لے آئے اور سرکاری دفتر تصنیف وتالیف جس کا نام دفتر تاریخ تھا مترجم عربی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ بھوپال میں مولوی صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی احمد حسن انجینئر تھے، چنانچہ وہ تقریباً ہر تعطیل میں یہاں تشریف لاتے تھے اور ان کا قیام کبھی امین زبیری صاحب کے ہاں اور کبھی احمد حسن صاحب کے ہاں ہوتا تھا اس دوران محوی صاحب کے وقت کا زیادہ حصہ مولوی صاحب کی خدمت میں صرف ہوتا تھا لیکن اب تک خط وکتابت کا سلسلہ بہت کم رہا تھا۔

محوی صاحب کا تقریباً دو سال بھوپال میں قیام رہا۔ اس کے بعد وہ ملازمت ترک کر کے لکھنؤ چلے گئے، جہاں ایک ادارہ "ادارۂ ادبیہ" کے نام سے قائم کیا لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا اور وہ لکھنؤ سے کانپور چلے آئے اور مدرسہ "البنات" میں جو کانپور کا مشہور عربی مدرسہ تھا جس کے پرنسپل آزاد سبحانی تھے عربی کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ یہ زمانہ ہندوستان کے لیے بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور مولانا آزاد سبحانی کو اپنے سیاسی مسائل کی وجہ سے مدرسے سے الگ ہونا پڑا تھا۔ تقریباً ایک سال بعد محوی صاحب بھی ملازمت سے

الگ ہوکر بھوپال چلے آئے اور پھر یہاں کچھ دنوں قیام کے بعد پروفیسر حبیب صاحب کے بلانے پر جامعہ ملیہ علی گڑھ کے شعبۂ تصنیف وتالیف میں چلے گئے۔ پروفیسر حبیب اور پروفیسر ہادی حسن صاحب کی اسکیم تھی کہ ہندوستان کی تاریخ کے موضوع پر جو کتابیں فارسی کے مختلف مصنفین نے لکھی ہیں اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کی ہیں ان کے ترجمے جامعہ کی جانب سے شائع کیے جائیں۔ محوی صاحب کے ذمے ترجمے کا کام دیا گیا تھا۔ اسی زمانے میں شعبۂ تصنیف وتالیف کی زیرنگرانی ماہ نامہ "جامعہ" جاری کیا گیا تھا جس کے ادارے میں مولوی محوی صاحب بھی تھے۔ ان کے اکثر مضامین بھی اس رسالے میں شائع ہوئے۔

محوی صاحب کو دو کتابیں "طبقات ناصری" اور "تاریخ فیروز شاہی" ترجمے کے لیے دی گئی تھیں انھوں نے دونوں کے ترجمے کرکے پیش کر دیے تھے لیکن اتفاق سے پروفیسر حبیب اور پروفیسر ہادی حسن جامعہ سے نکل کر مسلم یونیورسٹی میں چلے گئے تھے مجبوراً یہ اسکیم جامعہ والوں کو ختم کردینی پڑی۔ چنانچہ محوی صاحب کو بھی علیحدہ ہونا پڑا۔ اس کے بعد وہ کچھ دنوں تک علی گڑھ ہی میں رہے۔ اس دوران میں انھوں نے مولوی عبدالحق صاحب کو خط کے ذریعے تمام حالات سے آگاہ کیا اور اپنی خدمات انجمن ترقی اردو کے لیے پیش کیں ساتھ ساتھ یہ بھی اطلاع دی کہ وہ جلد ہی بھوپال کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق بھوپال پہنچے تو جلد ہی مولوی صاحب کا انھیں خط ملا جس میں اورنگ آباد بلایا تھا۔ خط ملتے ہی وہ اورنگ آباد جانے کی تیاری کرنے لگے کہ عجیب اتفاق پیش آیا۔ انھی دنوں نواب عبیداللہ مرحوم نے جو نواب سلطان جہاں فرمانروائے بھوپال کے منجھلے بیٹے تھے ایک پرنٹنگ مشین منگائی تھی اور ہوا محل میں ایک پریس قائم کیا تھا اور عبیدیہ دارالاشاعت کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ مولوی امین الدین زبیری مرحوم اور مولوی سعیدالدین مرحوم سے نواب صاحب نے ایک ایسے آدمی کی ضرورت بتائی تھی جو تصنیف وتالیف کے کام بحسن وخوبی انجام دے سکے۔ انھوں نے ازراہ محبت نواب صاحب سے محوی صاحب کا نام تجویز کیا۔ محوی صاحب کو نواب صاحب نے پسند فرمایا اور ملنے کے لیے بلایا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن وہ ان دونوں حضرات کے ساتھ شملہ کوٹھی ملنے کے لیے گئے۔ نواب صاحب بہت اخلاق سے ملے اور محوی صاحب سے فرمایا کہ وہ کام شروع کردیں، اس لیے کہ ان پر ریاست کا حق بھی ہے اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ محوی صاحب کے والد بھی اسی ریاست میں زندگی بھر ملازم رہے تھے۔

محوی صاحب نے دوران گفتگو میں مولوی صاحب کے خط کا تذکرہ کیا، انھوں نے فرمایا کہ وہ مولوی صاحب کو اطلاع دے دیں گے کہ محوی صاحب کو انھوں نے روک لیا ہے کچھ دنوں بعد وہ جائیں گے۔ چنانچہ محوی صاحب کو کچھ دنوں بھوپال ٹھہرنا پڑا لیکن اس دوران میں کچھ تو بدنظمی کی وجہ سے انھیں تنخواہ نہیں مل سکی اور ادھر انھوں نے جو کچھ مسودے تیار کیے تھے وہ نواب صاحب تک نہیں پہنچ سکے اور نہ اس اسکیم کو ہی آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی جس کی وجہ سے محوی صاحب بے حد بددل ہوگئے۔ چنانچہ انھوں نے مولوی امین زبیری صاحب اور مولوی سعید صاحب سے اس کا تذکرہ کیا اور مولوی عبدالحق صاحب کے خطوط بھی دکھائے جس میں انھوں نے انھیں اورنگ آباد بلایا تھا۔ ان دونوں حضرات کو بھی محوی صاحب سے ہمدردی ہوگئی۔ چنانچہ ایک پروگرام کے مطابق محوی صاحب ان دونوں حضرات کے ساتھ نواب صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ مولوی سعیدالدین صاحب نے جو درباری آداب سے اچھی طرح واقف تھے نواب صاحب سے گفتگو شروع کی اور اس انداز سے بات چیت کی کہ آخر وہ بہ مشکل محوی صاحب کے اورنگ آباد جانے پر راضی ہوگئے۔ انھوں نے محوی صاحب کو ایک سرٹیفکیٹ بھی عنایت کیا اور تین ماہ کی تنخواہ بھی اسی وقت دلوا دی اور سکریٹری کو ملا کر سخت سست کہا۔

نواب صاحب کے ہاں سے واپس آکر محوی صاحب نے ایک خط مولوی صاحب کو لکھا جس میں اپنے اورنگ آباد آنے کی اطلاع دی اور وہ

پروگرام کے مطابق اورنگ آباد روانہ ہوگئے۔ اورنگ آباد اسٹیشن اگرچہ مولوی صاحب کے قیام گاہ سے دُور تھا لیکن مولوی صاحب خود اسٹیشن تشریف لائے اور بڑی مسرت و گرمجوشی سے ملے اور اپنے ساتھ انجمن کے دفتر لائے اور فرمایا کہ قیام کا انتظام یہیں کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب کا قیام شہر سے دُور مقبرہ رابعہ دورانی (بیگم عالمگیر) میں تھا۔ دفتر سے رخصت ہوتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ سرکاری کام سے وہ حیدرآباد جارہے ہیں واپسی پر تفصیل سے بات چیت ہوگی۔

اس وقت انجمن ترقی اُردو کے منیجر عبدالحلیم شرر کے چھوٹے صاحبزادے مولوی صدیق حسن صاحب تھے جن سے محوی صاحب کی ملاقات لکھنؤ سے بچپن کی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں ساتھ کھیلے ہوئے تھے وہ وہاں مع اہل و عیال مقیم تھے۔ محوی صاحب سے وہ نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ ملے اس لیے اگرچہ یہ سفر ان کا پہلا تھا لیکن وہاں انھوں نے کوئی اجنبیت محسوس نہیں کی۔ دوسرے صاحب فریدالزماں تھے جو صدیق حسن صاحب کے مددگار تھے، جن سے محوی صاحب کی ملاقات علی گڑھ کے قیام کے دوران کی تھی وہ زیدآباد کے رہنے والے تھے اور بڑے ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

اس زمانے میں حیدرآباد کے ہر ضلع میں ملکی اور غیر ملکی کا زور تھا۔ مولوی صاحب وغیرہ "غیر ملکی" میں شمار کیے جاتے تھے اتفاق سے اورنگ آباد میں اس زمانے میں کثرت سے غیر ملکی یعنی یو۔پی کے کافی حضرات جمع ہوگئے تھے جو مختلف قسم کے کاموں میں لگے ہوئے تھے ان میں بہت سے ممتاز وکیل تھے اور دوسرے بڑی بڑی سرکاری خدمات پر سرفراز تھے۔ ان تمام حضرات نے اپنے عہدے اور منصب کا خیال کیے بغیر محوی صاحب کے اورنگ آباد پہنچنے پر بڑی پُرجوش محبت کا اظہار کیا۔ ان تمام حضرات اور خصوصاً مولوی منظور محمد صاحب کی رفاقت، مشورے اور عنایتیں محوی صاحب کے لیے شمع راہ ثابت ہوئیں۔ موصوف قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ دیوبند کے مدرسے کے فارغ التحصیل تھے اُردو کے زبردست عالم اور بڑے سخن فہم تھے۔ حیدرآباد کے زمانہ قیام میں نواب فصیح الملک داغ دہلوی سے بہت زیادہ تعلقات تھے۔ اکثر داغ کے دولت کدے پر نشست رہتی تھی، پرانی وضع کے بزرگ تھے اور دلی اسکول کے زبردست حامی اور طرفدار تھے چنانچہ دہلوی شعرا سے متعلق کوئی بری رائے سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کی اگر کوئی گفتگو کرتا تو فوراً غصے میں آجاتے اور جنگ پر آمادہ ہوجاتے لیکن محوی صاحب کی یہ خوش نصیبی تھی کہ دبستان لکھنؤ سے تعلق رکھنے کے بعد بھی ان سے نہ صرف خوشگوار تعلقات تھے بلکہ وہ ان کے بہت بڑے حامی تھے کبھی کبھی اس مسئلے پر بحث اور جھڑپ ہوجاتی تھی، لیکن فوراً ہی اس کا اثر بھی دُور ہوجاتا۔

تین چار دن کے بعد مولوی صاحب حیدرآباد سے واپس آئے۔ مولوی صاحب کے غائبانے میں محوی صاحب نے صدیق حسن خاں صاحب سے دریافت کیا کہ انھیں کس کام سے بلایا گیا ہے لیکن انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ جب مولوی صاحب واپس آئے تو انھوں نے محوی صاحب کو اپنی قیام گاہ پر بلایا اور کہا کہ "میں نے یہاں تنہائی میں گفتگو کے لیے بلایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے ایک متوسط درجے کی لغت شائع کروں۔ آپ کو اسی کام کے لیے بلایا ہے۔ ہر ماہ آپ جتنا لکھیں اسے صاف کرکے دے دیں، میں اسے دیکھ کر اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ترمیم و اضافہ کردوں گا، اور اگر تبادلہ خیال کی ضرورت ہوئی تو آپ کو بلالوں گا۔ آپ کو کسی قسم کی ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف کہہ دیجیے گا" جس کے جواب میں محوی صاحب نے کہا کہ "میری تو خواہش ہے کہ روزانہ نہ سہی کم سے کم ایک دن بیچ کر برابر ملاقات کروں اور آپ کی ذات گرامی سے استفادہ

کرتا رہوں۔ چند روز کے بعد ایک خاکہ پیش کروں گا وہ اگر پسند فرما لیا تو اسی کے مطابق کام شروع کیا جائے گا۔ اُردو لغت کی جو کتابیں آپ کے پاس موجود ہیں انھیں میرے پاس بھجوا دیجئے۔ کچھ میرے پاس بھوپال اور لکھنؤ میں ہیں، میں منگوا لیتا ہوں۔ ان کے علاوہ اگر ضرورت ہوئی تو میں فہرست پیش کر دوں گا۔"

مولوی صاحب نے ایک خط صدیق حسن خاں کے نام لکھ دیا جس میں محوی صاحب کے لیے ضروری انتظامات کی تاکید کر دی۔

اورنگ آباد کی آب و ہوا بہت خوشگوار صحت بخش اور معتدل ہے جو کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ہے۔ چنانچہ محوی صاحب نے جلد ہی کام شروع کر دیا اور چار پانچ صفحے نمونے کے تیار کر کے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس دوران محوی صاحب کی مولوی صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہی اور مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ چار چھ دن بعد محوی صاحب نے نمونے کے سلسلے میں ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔ مولوی صاحب نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور بہت ہمت افزائی کی۔ اب محوی صاحب کو اطمینان ہوا اور وہ کام میں مصروف ہو گئے۔ مسودے کی صفائی کا کام فریدالرحمان صاحب کے سپرد کیا گیا، اور جس کے لیے الگ الاؤنس مقرر ہوا۔ اس کے علاوہ محوی صاحب دوسرے کاموں میں بھی مولوی صاحب سے تعاون کرنے لگے۔ مثلاً رسالہ "اُردو" میں تبصرے کے لیے جو کتابیں آتی تھیں ان میں سے شعری مجموعوں پر تبصرے کا کام محوی صاحب کے سپرد کیا جانے لگا۔ وہ تبصرے لکھ کر مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتے جن پر عام طور سے مولوی صاحب بہت کم اصلاح اور ترمیم کرتے۔ پہلے تبصرے کا سارا کام خود مولوی صاحب کرتے تھے لیکن اب اس طرح ان کا کام بہت کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ ان دنوں رسالہ "اُردو" میں تبصرہ نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے لیکن بعد میں مولوی صاحب کو خیال پیدا ہوا کہ تبصرے لکھنے والوں کے اشاراتی نام ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس کے بعد مولوی محوی صاحب کے جو تبصرے چھپے ان کے آخر میں "م۔ح" یا صرف "م" ہوتا تھا۔ تنقیدات عبدالحق میں کئی تبصروں کے آخر میں یہ اشاراتی نام درج ہے۔

اس زمانے میں اورنگ آباد میں دو اسکول تھے ایک ہائی اسکول اور دوسرا مدرسہ فوقانیہ۔ ہائی اسکول کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا اور فوقانیہ کا تعلق سلطنت آصفیہ کے ڈائرکٹر تعلیمات سے۔ حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قائم ہونے کے باوجود اسکولوں اور کالجوں کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے رہا۔ لیکن آخر میں سب عثمانیہ سے متعلق کر دیئے گئے۔ مولوی صاحب بہت دنوں سے کوشش میں تھے کہ اورنگ آباد میں کم سے کم ایک انٹر کالج قائم کیا جائے۔ آخر اُن کی کوششیں بار آور ہوئیں اور وہاں کے دونوں اسکول کو ملا کر ایک مڈل اسکول اور ایک انٹر کالج بنا دیا گیا اور اس کے سب سے پہلے پرنسپل مولوی عبدالحق صاحب بنائے گئے اور انھیں اختیار دیا گیا کہ کالج کے لیے جو اساتذہ ان دونوں اسکول میں مناسب ہوں وہ لے لیے جائیں اس کے باوجود اگر اساتذہ کی ضرورت ہو تو باہر سے لے لیے جائیں۔ مولوی صاحب یہ تمام کام نہایت خاموشی سے انجام دے رہے تھے، وہ اس زمانے میں اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات تھے اس خدمت سے الگ ہونے کے بعد کالج کا قیام عمل میں آیا تھا اور وہ پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ کالج کھلنے کی خبر سے سارے شہر میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی اور وہاں کے معزز حضرات مولوی صاحب کو مبارکباد دینے کے لیے آنے لگے۔

مولوی صاحب نے ایک روز اپنے خاص ملازم کو بھیج کر محوی صاحب کو بلایا۔ جب ملازم محوی صاحب کے گھر پہنچا تو انھیں بے حد پریشانی ہوئی کہ آخر بات کیا ہے کہ اس وقت خاص آدمی کو بھیج کر انھیں بلایا گیا ہے۔ بہر حال وہ مولوی صاحب کے گھر پہنچے ملازم نے اندر جا کر اُن کے

آنے کی اطلاع دی۔ انھوں نے خاص کمرے میں محوی صاحب کو بلایا اور بتایا کہ "یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کالج کھل گیا ہے اور کل سے تعلیم کا آغاز شروع ہوگا۔ فارسی کے استاد کے لیے آپ کا نام تجویز کیا ہے۔ آپ کل صبح یہاں آجائیے اور میرے ساتھ کالج تشریف لے چلیے۔" محوی صاحب کی دلی خواہش تھی کہ وہ کالج میں تعلیمی خدمت کے لیے مولوی صاحب سے اجازت حاصل کریں لیکن کبھی اس کے اظہار کی انھیں جرأت نہیں ہوئی تھی اب جو مولوی صاحب نے ان سے اس خدمت کے لیے کہا تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ وہاں سے چلتے وقت مولوی صاحب نے تاکید کردی کہ کالج پہنچنے سے پہلے اس بات کی اطلاع کسی کو نہ ملے۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر محوی صاحب مولوی صاحب کے بنگلے پر پہنچے اور ان کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوکر کالج پہنچے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر اساتذہ اور طلبہ خیر مقدم کے لیے آگے بڑھے۔ گاڑی سے اُترنے کے بعد مولوی صاحب نے محوی صاحب کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا چنانچہ وہ ان کے پیچھے پیچھے پرنسپل روم میں داخل ہوئے۔ مسٹر بکھتول ایک دیسی عیسائی اور انگریزی کے ماہر وائس پرنسپل مقرر ہوئے تھے ان سے مولوی صاحب نے ٹائم ٹیبل لانے کے لیے کہا۔ محوی صاحب نے دیکھا کہ اس میں فارسی استاد کی جگہ خالی تھی۔ دوسرے تمام مضامین کے اساتذہ مقرر ہوچکے تھے، مولوی صاحب نے اپنے ہاتھ سے اس پر محوی صاحب کا نام لکھا اور بکھتول صاحب سے کہا کہ انھیں فارسی کا کمرہ بتادیجیے اور تمام ضروری باتوں سے آگاہ کردیجیے۔ چنانچہ محوی صاحب کو لے کر وہ باہر آئے فارسی کا کمرہ بتایا۔ ٹائم ٹیبل لکھایا اور کتابوں کے نام بتائے۔ "انوار سہیلی" اور "دیوان حافظ" دونوں کتابیں نصاب میں داخل تھیں محوی صاحب کو بکھتول صاحب ہی سے معلوم ہوا کہ انھیں پچاس روپے بطور الاؤنس ملیں گے اور ایک سال بعد پچاس کی بجائے پچھتر ہوجائے گا۔ چنانچہ محوی صاحب نے اس ذمہ داری کو بڑی محنت اور دیانت داری سے نبھایا یہ سلسلہ تقریباً چار سال تک جاری رہا۔ کالج میں اُردو مولوی صاحب خود پڑھاتے تھے البتہ جب کبھی وہ باہر جاتے تو شعبۂ اُردو کی ذمے داری محوی صاحب کے سپرد کرجاتے۔

لغت کا کام بھی جاری تھا تقریباً سو صفحات فل اسکیپ سائز ہر ماہ تیار کرکے وہ مولوی صاحب کے حوالے کردیتے تھے۔ "ن" کی ردیف ختم ہونے تک یہ کام برابر جاری رہا۔ اس دوران مولوی صاحب حیدرآباد تشریف لے گئے جہاں احباب کے مشورے سے مجلس منتظمہ انجمن ترقی اُردو کی بنائی گئی جس میں ایک ہاشمی فرید آبادی بھی تھے۔ اس مجلس میں لغت کی بات آئی تو لوگوں کی رائے ہوئی کہ معمولی اور متوسط درجے کی لغت شائع کرنا مفید نہیں ہے۔ انجمن کی طرف سے اُردو کی جو لغت شائع ہو وہ انجمن کے شایان شان ہو۔ ہر لفظ کے متعلق تحقیق سے یہ بات معلوم کی جائے کہ وہ لفظ کس زبان کا ہے اور کس طرح اُردو میں آیا۔ اس تجویز کو عمل میں لانے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس میں ایک صاحب سید احتشام علی تھے۔

حیدرآباد سے واپسی پر مولوی صاحب نے لغت کا کام روک دیا اور محوی صاحب کو انجمن کے پریس میں پروف ریڈر کی حیثیت سے رکھنا چاہا جسے انھوں نے پسند نہیں کیا اور اس کا اظہار بھی کیا جس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ اس طرح پندرہ روز گزاریں وہ کوشش کرکے محکمہ تعلیمات میں ملازمت دلادیں گے۔ محوی صاحب کو مولوی صاحب کے مزاج کی یہ تبدیلی پسند نہیں آئی۔ انھوں نے کہا کہ وہ انجمن کی خدمت کے جذبے سے آئے ہیں گورنمنٹ کی ملازمت کے لیے نہیں۔ بہرحال محوی صاحب انجمن سے علیحدہ ہوگئے جس کا انھیں بے حد افسوس بھی تھا۔

محوی صاحب جہاں بھی رہے وہاں اُردو کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی بزم ضرور قائم کی، چنانچہ جب اورنگ آباد پہنچے تو وہاں بزم شعرا قائم کی جس کے سکریٹری رضی الحسن کاکوری منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں حسن اتفاق سے شمالی ہند کے تعلیم یافتہ اور شعر و شاعری سے دلچسپی

رکھنے والے حضرات وہاں کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان تمام حضرات نے محوی صاحب کا گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ بٹایا۔ کاکوری کے ایک بزرگ شاعر حافظ ساجد علی ساجدؔ امیر مینائی کے ممتاز شاگرد تھے۔ حسن اخلاق کے لیے مشہور تھے انھوں نے بڑی خوشی کے ساتھ بزم شعرا کی صدارت قبول کی۔ ولی الحسن اثر کے چچا نقی حیدر انوری، صدیق الزماں وفا وغیرہ صاحبان بزم شعرا کے ممبر ہوئے۔ یہ دونوں صاحبان حضرت جلیل جانشین حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ مقامی شعرا نے بھی بڑی دلچسپی لی۔ ان کے علاوہ حضرت جلیل کے دو صاحبزادے صدیق احمد، اور انیس احمد جو اس زمانے میں اورنگ آباد میں مقیم تھے بزم شعرا میں شریک ہوئے۔

"بزم شعرا" کا مشاعرہ ہر ماہ کسی نہ کسی ممبر کے ہاں منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس لیے نشستیں بڑی پُرتکلف اور اچھی ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں مولوی عبدالحق صاحب مشاعروں کے سخت مخالف تھے۔ محوی صاحب کا تعلق چونکہ انجمن سے تھا اس لیے انھوں نے مولوی صاحب سے اس کا تذکرہ کیا اور اس کی اجازت لے لی۔

جب اورنگ آباد صوبے کا مرکز قرار پایا اور نواب رضا نواز جنگ صوبے کے گورنر مقرر ہوئے تو ان کی خواہش ہوئی کہ صوبے کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے، چنانچہ وہ اس کوشش میں لگ گئے، بابائے اردو سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر انصاری بھی اسی زمانے میں اورنگ آباد تشریف لائے تھے اور وہاں چند روز قیام کیا تھا۔

"بزم شعرا" کے مشاعروں کی ادبی سرگرمیوں کی خبریں نواب صاحب تک پہنچ رہی تھیں۔ انھوں نے بے حد پسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن اب تک محوی صاحب سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اتفاق سے ایک دن نواب صاحب مولوی صاحب کے گھر تشریف لائے۔ دوران گفتگو میں انھوں نے محوی صاحب کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ "میں ان کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کچھ سنتا رہتا ہوں لیکن آپ نے اب تک ملایا نہیں اور نہ وہ خود مجھ سے ملے۔" مولوی صاحب نے فرمایا کہ "وہ میرے ساتھ ہی رہتے ہیں ابھی بلاتا ہوں"۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اسی وقت رستم (مولوی صاحب کا ملازم) کو بھیج کر محوی صاحب کو بلایا۔ محوی صاحب فوراً حاضر ہوئے۔ نواب صاحب ان سے بڑی خندہ پیشانی اور اخلاق سے ملے اور ان کی بڑی ہمت افزائی کی۔

مختصر یہ کہ اورنگ آباد کے مشاعرے بڑی کامیابی سے ہوتے رہے اور روز مرہ اس کی شہرت اور مقبولیت بڑھتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اورنگ آباد کے قرب وجوار میں بھی مشاعرے ہونے لگے۔ بابائے اردو بھی بہت خوش تھے، انھیں مشاعروں سے جو بد دلی تھی وہ بھی دور ہونے لگی تھی لیکن وہ اب تک مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے البتہ ہر مشاعرے کے بعد اس کی روداد ضرور سنتے تھے۔ اسی دوران "بزم خیال" کے نام سے رضی الحسن صاحب نے بزم شعرا کی طرف سے ایک طرحی ماہنامہ جاری کیا لیکن وہ کچھ سیاسی وجوہ کی بنا پر چند ہی ماہ کے بعد بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ طرحی گلدستہ سرشار کسمنڈوی کی ادارت میں سیوہر سے عرصے تک نکلتا رہا۔

اسی زمانے میں مہاراجا کشن پرشاد شاد تبدیلی آب وہوا کی غرض سے اورنگ آباد تشریف لائے مولوی صاحب نے محوی صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس موقع پر ایک یادگار مشاعرہ منعقد ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کا انتظام کیجیے۔ محوی صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ انشاء اللہ مشاعرہ کامیاب ہوگا مصرع طرح کی فرمائش کی۔ مولوی صاحب نے ذیل کا مصرعہ "مصرع طرح" تجویز کیا ع

؎ ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

مقامی شعرا کو دعوت نامے تقسیم ہوئے اور ساتھ ساتھ یہ اطلاع دی گئی کہ شعرا حضرات مشاعرے سے ایک دن پیشتر مولوی صاحب کو اپنا کلام سنا دیں اس لیے کہ وہی شاعر مشاعرے میں حصہ لے گا جس کا کلام منتخب ہوگا۔

" مقبرہ رابعہ دورانی" کے باغ میں ایک بڑا گول حوض ہے اس کے آس پاس تقریباً ڈیڑھ گز بلند چبوترہ ہے وہاں مشاعرہ ہونا قرار پایا گرمیوں کا موسم تھا اور رات بہت خوش گوار تھی۔ حوض کے پانی میں جگہ جگہ رنگین برقی قمقمے تیر رہے تھے۔ درختوں کے پھلنگ پر بڑی بڑی سرچ لائیٹ لگائی گئی تھی جس کی روشنی دور تک پہنچ رہی تھی۔ مقبرے کے دروازے سے تنلے کے حوض تک جابجا درختوں کی شاخوں میں بجلی کے بلب روشن تھے اور باغ کا وہ حصہ خصوصیت سے جگمگا رہا تھا جہاں مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا۔ مشاعرہ بھی بہت کامیاب ہوا۔ مہاراجا جی بہت لطف اندوز اور خوش ہوئے۔ چنانچہ بعد میں انھوں نے کچھ شعرا کے لیے ہمرو تھان لطور انعام مولوی صاحب کے ذریعے بھجوائے۔

اس مشاعرے کے کلام کا انتخاب مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کے ٹائپ پریس میں دو رنگوں میں شائع کیا جس میں محوی صاحب کی لکھی ہوئی رپورٹ بھی شائع ہوئی۔ یہ اورنگ آباد کا پہلا مشاعرہ تھا جس میں مولوی صاحب شریک ہوئے تھے۔

مولوی محوی صاحب کو انجمن سے علیحدہ ہوئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ اتفاق سے انھی دنوں محوی صاحب کے نام مدراس سے تار آیا جس میں ان کے ایک عزیز دوست نے انھیں مدراس بلایا تھا۔ چنانچہ وہ مدراس چلے گئے۔ جہاں انھیں معلوم ہوا کہ مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامی میں ایک جگہ خالی ہے ان کے دوست نے کہا کہ وہ اس جگہ کے لیے درخواست دے دیں۔ وہ کوشش کر کے اس جگہ پر ان کا تقرر کرا دیں گے۔ چنانچہ محوی صاحب نے درخواست دے دی اور کچھ دنوں وہاں قیام کے بعد اورنگ آباد واپس آ گئے۔ اور جب وہاں سے تقرری کا خط آیا تو مولوی صاحب کو اس کی اطلاع دی تو وہ بے حد خوش ہوئے کہنے لگے کہ "میں اس کوشش میں تھا کہ مدراس کسی ایسے شخص کو بھیجوں جو اس صوبے میں اردو کی نشر و اشاعت کا کام پورے طور سے کر سکے۔ آپ سے بہتر کوئی آدمی اس کام کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ آپ کا جب تک وہاں قیام رہے گا میں آپ سے ملنے وہاں ہر سال آیا کروں گا وہاں اردو کے کام کے لیے کسی مشورے اور ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ یقین ہے کہ منصبی کام کے علاوہ اردو کی ترویج و اشاعت کا کام ضرور کریں گے" بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی محوی صاحب بتاتے ہیں کہ مولوی صاحب کی آنکھیں اس وقت پرنم تھیں اور آواز بھرائی ہوئی تھی جب وہ ان سے رخصت ہوئے۔

مولوی صاحب کے جو تعلقات محوی صاحب سے تھے اس بنا پر دونوں میں خط و کتابت کا بھی کافی سلسلہ تھا۔ لیکن افسوس کافی خطوط ضائع ہو گئے البتہ تقریباً تیس پینتیس خطوط اب بھی محفوظ ہیں۔ ذیل میں مولوی عبدالحق صاحب کی محوی صاحب سے متعلق انگریزی میں رائے اور ایک خط جب وہ بھوپال میں مقیم تھے اور یہاں سے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے درج ہیں:-

Hyderabad Dn.
May 5th, 1930.

I have great pleasure in saying that Moulvi Mohammad Hussain Mehvi is a very good Urdu Scholar and a poet of recognised merit. He worked with me as a lecturer

of Urdu literature at the Intermediate College, Aurangabad and for sometime as an assistant in connection with the Anjuman-i-Taraqqi-e Urdu and I acknowledge that he was of great help to me in some of the literary activities of the Anjuman. Besides, his knowledge of Persian and Arabic is also very sound which is essential for an Urdu scholar I am sure that as a teacher or a lecturer of urdu language and literature he will be acquisition.

As a friend and companion he is simply charming. I have very high opinion of his character and abilities

Abdul Haq
Prof. Urdu Literature
Osmania University
Hyderabad Dn

حسن منزل - ابراہیم پورہ - بھوپال ۱۲ر جنوری ۴۹ء

مشفقی محوی صاحب السلام علیکم

کراچی سے دو خط لکھے ایک کا بھی جواب نہ ملا۔ معلوم نہیں وہ پہنچے بھی یا نہیں۔ آج کل چار روز سے بھوپال میں ہوں۔ تین مہینے سے دلی میں تھا۔ دلی سے یہاں آیا۔ یہاں سے بمبئی اور بمبئی سے پانی کے جہاز سے کراچی چلا جاؤں گا۔ میں کبھی کا چلا گیا ہوتا مگر جیب[1]... کے انتظار میں پڑا ہوں وہ میرے ساتھ جائے گا۔ وہ اکیلا کیا جائے گا سارے اہل و عیال کو لے کر جائے گا۔ پورا قافلہ ہے۔ سات بچے، ایک بیوی، ایک ماں ایک... بہن[2] اور ایک خود... لاحول ولاقوۃ۔ اتنے بچے، یہ خدا کی دین ہے یا قہر الٰہی... کہیں اثنائے سفر میں ایک دو کا اور اضافہ نہ ہو جائے۔ خیال یہ تھا کہ بمبئی میں پرمٹ مل جائے گا لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جب تک مقامی پولیس NO OBJECTION (یعنی کوئی اعتراض نہیں) کا سرٹیفکیٹ نہ دے اس وقت تک پرمٹ نہیں ملتا۔ اب دلی ہی میں سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ یہ مرحلہ طے ہو جائے تو پھر یہاں سے کوچ ہوگا۔

بھوپال میں یہ دن بہت بری طرح کٹ رہے ہیں۔ آپ بہت یاد آ رہے ہیں۔ اب نہ اس شخص بھری کھال خاموش کا ذکر ہے نہ حکیم جی کا۔ محمد امین بھی نہیں۔ دلی آئے تھے تین چار روز رہ کر علی گڑھ چلے گئے اور کہہ گئے تھے جلد واپس آ جاؤں گا۔ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ لکھ رہے ہیں، اس کا سامان جمع کرنے گئے تھے اس میں دیر لگ گئی۔ رہ گئے ایک ٹوٹروں ٹوں ڈاکٹر تیموری۔ وہ اسٹیشن پر بھی آئے اور مکان پر بھی۔ میں نے انھیں چائے پر بلایا انھوں نے مجھے کھانا کھلایا۔ وہ کلکتہ جا رہے ہیں کہتے تھے ۱۴ یا ۱۵ تک واپس آ جاؤں گا۔ اس وقت تک رہا تو ملاقات ہو جائے گی ورنہ خدا کے حوالے۔

صبح شام سیر کو حسب معمول جاتا ہوں، شام کے وقت مسعود ساتھ ہو لیتے تھے کل وہ بھی کانپور چلے گئے، اب میرے ساتھ صرف اللہ میاں رہ گئے ہیں، دیکھیں یہ کب تک ساتھ دیتے ہیں۔ آج کل کسی کا اعتبار نہیں۔

خیر طلب عبدالحق

---

[1] ایک ملازم کا نام

[2] کرم خوردہ

نرگس صادق



منیر بانو
(بنت نواب منظور جنگ)

جب میں نواب منظور جنگ کی صاحبزادی محترمہ منیر بانو صاحبہ سے ملنے جارہی تھی تو میرے ذہن میں ان کا جو تصور قائم ہوا وہ کم از کم میرے لئے ہیبت ناک سا تھا۔ پرشکن جبیں، چڑھے ہوئے ابرو اور آرائشِ حسن سے مزین چہرہ اور میری طبیعت ایسی خاتون سے ملتے ہوئے کچھ مکدر سی ہورہی تھی لیکن جب میرا تعارف ایک نہایت سادہ اور پُر وقار خاتون سے ہوا تو میں مسکرائی تھی.... سنتے تھے کہ تصورات جب حقیقتوں سے ٹکراتے ہیں تو بڑی تکلیف اور کرب محسوس ہوتا ہے لیکن آج نتیجہ بالکل برعکس نکلا حقیقت تصور سے کہیں زیادہ خوش گوار معلوم ہوئی۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا مسکراتا ہوا چہرہ، سادہ لباس، پروقار اور شگفتہ انداز گفتگو، میں اس مقناطیسی شخصیت کی طرف بے اختیار کھنچتی چلی گئی۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو منیر بانو صاحبہ نے نہایت محبت سے اپنے خاندان اور مولوی عبدالحق کے متعلق اپنے خیالات بیان فرمائے۔

"میرے والد نواب منظور جنگ نواب علاؤالدین خاں لوہارو کے نواسے اور مرزا امینڈھو کے (جو سرکار اودھ میں وزیر تھے) پوتے تھے، دادا کا نام مرزا وددو احمد خاں تھا والد کے علاوہ دو بھائی مرزا مقصود احمد خاں اور مرزا منصور احمد خاں تھے اور دو بہنیں۔ میرے والد کی تعلیم مدرسہ آصفیہ میں ہوئی اور یہیں ان کی ملاقات مولوی صاحب سے ہوئی لیکن یہ ملاقات کی حیثیت استاد اور شاگرد کی ملاقات کی تھی۔ مولوی صاحب نواب صاحب کے استاد تھے۔ ایک مرتبہ نواب منظور جنگ مولوی صاحب کو اپنے والد سے ملانے اپنے مکان لے گئے، مولوی صاحب کو اپنا یہ ذہین شاگرد کچھ اس طرح بھایا کہ آمد و رفت کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا اور بہت جلد استاد اور شاگرد نہایت مخلص دوست بن گئے۔ نواب منظور جنگ نے تعلیم ختم کرکے مالیات کے محکمے سے ملازمت کا آغاز کیا اور تعلقہ دار یعنی کلکٹری کے منصب سے پنشن پائی پنشن کے بعد حضور نظام نے انھیں اپنے خاص "اسٹاف" میں شامل کرلیا آپ نہایت سادہ طبیعت کے مالک تھے، باوجود اپنے منصب اور دولت کے کبھی شان و شوکت سے رہنے کی کوشش نہ کی، لباس ہمیشہ سادہ پہنا۔ گھر میں بنیان اور تہمد پہنتے۔ باہر جاتے تو وہی مخصوص وردی یا شیروانی پہنتے۔ گھر میں ہمیشہ کھری چارپائی پر بیٹھتے ان کے پاس ملنے جلنے والے آتے رہتے ان میں انگریز افسران بھی ہوتے اور اکثر ان کی کھری چارپائی پر بیٹھتے مولوی صاحب کے پاس

ایک تصویر تھی جس میں مولوی صاحب نواب صاحب اور ایک انگریز افسر اسی چارپائی پر بیٹھے تھے مولوی صاحب نے کہا کہ یہ یادگار تصویر لیتی جانا انھوں نے تلاش بھی کی لیکن وہ تصویر نہ مل سکی ۔ نواب منظور جنگ نہایت رحم دل اور ہمدرد تھے ۔ ان کا یہ عالم تھا کہ

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے اور یہ ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت تھی ۔ لٹریچر اور خصوصاً فارسی اور اردو ادب کے بڑے شائق تھے اور شاید یہی چیز مولوی صاحب کی دوستی کی بنا ہو ۔ مذہب کے معاملے میں بڑے سخت تھے نماز پابندی سے پڑھتے اور دیگر ارکان مذہب بھی پابندی سے ادا کرتے تھے لیکن مولوی صاحب کی صحبت سے اس پابندی میں کچھ کمی آ گئی تھی ۔ سیاسی نظریات کے اعتبار سے پکے کانگرسی تھے ۔ مولوی صاحب پاکستان آکر اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے "منظور کو کیا ہو گیا ہے تم لوگ سمجھاؤ اسے" نواب صاحب اور مولوی صاحب کے تعلقات تا عمر نہایت خوشگوار رہے نواب صاحب مولوی صاحب کی نہایت عزت و تکریم کرتے تھے جب بھی مولوی صاحب آتے آپ تعظیم کو کھڑے ہو جاتے اور "مولوی صاحب" مولوی صاحب، کہتے زبان خشک ہوتی آخر تھے تو وہ استاد اور یہ شاگرد ۔

میری دو بہنیں خورشید بانو، سعید بانو اور بھائی بابر مرزا جن کی شادی سر کشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد کی صاحبزادی سے ہوئی ہندوستان ہی میں ہیں بھائی اسی ماہ ہندوستان سے کنیڈا ہجرت کر گئے ہیں ۔ ہمارے والد ہم سے بہت محبت کرتے تھے عموماً یہ ہوتا کہ ہماری والدہ ہم لوگوں کو اسکول میں داخل کرائیں اور والد آکر ہمیں اپنے ساتھ لے جاتے اس طرح ہم سب کی تعلیم پابندی سے نہیں ہو سکی تھی ۔ میرے بھائی کی تعلیم حقیقت میں بارہ سال کی عمر سے شروع ہوئی وہ بھی میری والدہ اور خصوصاً مولوی صاحب کے سمجھانے بجھانے سے والد نے ان کو نظام کالج میں داخل کروایا ۔

مولوی صاحب سے ہمارے خاندان کے تعلقات میری پیدائش سے قبل ہی سے قائم تھے ہم لوگوں نے تو آنکھ کھول کر مولوی صاحب کو دیکھا مولوی صاحب ہمارے یہاں برابر آتے رہتے اور قیام کرتے تھے ہمارا مکان ایسی جگہ پر تھا جہاں آس پاس کھیت اور دور تک جنگل کا سلسلہ تھا مولوی صاحب ایسی جگہ کے عاشق تھے ۔ مناظر فطرت کے دل دادہ اس لئے ان کا یہاں خوب دل لگتا تھا مولوی صاحب جب آتے تو میری دادی اور والدہ ان کے لئے بڑے اہتمام سے ان کی پسند کے کھانے تیار کرتیں مولوی صاحب ہمیشہ سادہ نفیس اور مزیدار کھانا کھاتے ۔ پھلوں کے بہت شوقین تھے ۔ کھانے اور ناشتے پر ہمیشہ موسم کے پھل استعمال کرتے مولوی صاحب سے ملاقات ہم بھائی بہنوں کے لئے پرمسرت ہوتی، ہم سارے کھیل اور دلچسپیاں بھول جاتے اور مولوی صاحب کے ارد گرد جمع رہتے اور مولوی صاحب دنیا جہان کے نہایت دلچسپ اور مزیدار قصے سناتے اور ہم سب کو ہنساتے رہتے ۔

مولوی صاحب اکثر میرے چچا مقصود احمد کے پاس، باٹنا تنگارم جاتے یہ ایک پہاڑی مقام ہے یہاں ایک پہاڑی محراب کی شکل کی تھی ۔ مولوی صاحب اس محراب میں رہتے ان کے دوست مذاق میں اس کو مولوی کا مقبرہ کہتے تھے اکثر انگریز یہاں تیتر اور بٹیر کا شکار کھیلنے آتے، مولوی صاحب کہتے کہ مقصود کے جنگل میں تیتر بٹیر نہیں ہیں یہ بے چارہ تو خرید کر یہاں چھوڑ دیتا ہے اور پھر انگریز یہاں

کو شکار کھلواتا ہے۔

مولوی صاحب کے سیاسی نظریات کے متعلق منیر بانو صاحبہ نے کہا کہ "وہ شروع ہی سے بڑے آزاد خیال تھے انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کے بڑے خلاف تھے چنانچہ ایک زمانے میں مولوی صاحب اور ظفر علی خاں وغیرہ نے حیدرآباد میں حکومت یعنی انگریزوں کے خلاف آواز بلند کی اور اس بنا پر مولوی صاحب کو شہر بدر کر کے اورنگ آباد بھیج دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اورنگ آباد میں اورنگ آباد کالج قائم کیا۔ آخر حضور نظام نے عتاب ختم کر کے مولوی صاحب کو جامعۂ عثمانیہ میں پروفیسری کی خدمت پر بلا لیا۔

مولوی صاحب کی ہم لوگوں سے محبت اور ان کی شخصیت کی عظمت ان دو ایک واقعات سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

میں ۱۹۵۱ء میں پاکستان آئی تو مولوی صاحب سے نہیں ملی مجھے ان کا پتا بھی نہیں معلوم تھا خیر ان کا پتا معلوم کرنا مشکل نہ تھا بلکہ حقیقت میں مجھے یہ خیال تھا کہ مولوی صاحب کے اور میرے والد کے سیاسی نظریات میں بہت اختلاف ہے اور مولوی صاحب پاکستان آگئے ہیں اور مولوی صاحب نے پہلا سا برتاؤ نہ رکھا تو مجھ کو ناقابل برداشت صدمہ ہوگا۔ لیکن ایک دن دیکھتی کیا ہوں مولوی صاحب اپنی گاڑی میں میرے گھر تشریف لائے ہیں، ہم سب ان کے استقبال کے لئے نکل آئے۔ مولوی صاحب کی گاڑی میں میرے دھوبی کا لڑکا بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو بھی اتر کر آجا تو مولوی صاحب بولے بھئی یہ اس لئے نہیں اترتا کہ یہ تمہارے بچے کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے بتایا کہ اتفاق سے میرا دھوبی مولوی صاحب کے کپڑے بھی دھوتا تھا اور انھیں میرے متعلق بتایا تو مولوی صاحب اس کے سر ہوگئے کہ ابھی میرے ہاں ان کو لے کر چلے۔ آخر اس کا لڑکا مولوی صاحب کو لے کر آیا۔ اس کے بعد میں وقتاً فوقتاً مولوی صاحب کے پاس جاتی رہتی۔ جب بھی میرا کوئی بچہ امتحان میں کامیاب ہوتا میں اسے مولوی صاحب کے پاس لے کر جاتی مولوی صاحب بے حد خوش ہوتے اور ہمیشہ میری ہمت افزائی کرتے رہتے۔" منیر بانو صاحبہ حیدرآباد کی آرام دہ زندگی چھوڑ کر پاکستان آگئیں آپ کے شوہر نہایت متقی پرہیزگار شخص ہیں آپ نے پاکستان آکر دو سال تک ملازمت کی لیکن رشوت کی گرم بازاری اور بے ایمانی نے ان کو ملازمت سے متنفر کر دیا۔ منیر بانو صاحبہ نے خود ایک اسکول میں ملازمت کر لی اور اپنے بچوں کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے انھیں اعلیٰ تعلیم دلائی۔ منیر بانو صاحبہ کہتی ہیں "مجھ کو مولوی صاحب کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی نے سب سے زیادہ متاثر کیا مولوی صاحب کے پاس بیٹھ کر میں اپنی تمام پریشانیاں بھول جاتی تھی مولوی صاحب کی قربت میں تفکرات دم توڑ دیتے اور زندگی کی توانائی اور زندہ رہنے کا عزم پیدا ہوتا۔

مولوی صاحب کی عظمت اور محبت کا اندازہ کچھ انھی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو ان سے قریب رہے مولوی صاحب اپنی زندگی کے آخری وقت جب بیمار ہو کر جناح ہسپتال میں داخل ہوئے تو اسی زمانے میں میری والدہ بھی جناح ہسپتال میں داخل تھیں میں مولوی صاحب کے پاس ان کی مزاج پرسی کے لئے جاتی رہتی۔ ایک دن وہ مجھ کو پانچ سو روپے دینے لگے اور کہنے لگے کہ یہ اپنی والدہ کے علاج کے اخراجات کے لئے رکھ لو میں نے کہا مولوی صاحب یہ نہیں ہو سکتا آپ خود بیمار ہیں اور .... وہ میری بات کاٹ کر بولے کہ یہ میرے اپنے روپے ہیں میں نے اپنی ایک کتاب کے حقوق فروخت کر دیئے ہیں۔ لیکن میں نہ مانی۔ مولوی صاحب مری چلے گئے اور وہاں

سے انھوں نے حکیم اسرار احمد کریوی سے جناح ہسپتال کے ناظم کو خط لکھوایا کہ بیگم منظور جنگ کے علاج کے اخراجات وہ خود ادا کریں گے لیکن میں نہ مانی ۔ مرتے مرتے وہ دوسروں کا خیال کرتے رہے اور ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو اپنی خوشی اور ضروریات کو دوسروں کے لئے تج دیں ۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ مولوی صاحب اپنے مقصد حیات میں کس حد تک کامیاب رہے منیر بانو صاحبہ نے مولوی صاحب کا یہ شعر پڑھا ؎

دلوں پہ قبضہ خیالات پر حکومت ہے   اب اس سے بڑھ کے تمھیں اختیار کیا ہوگا

اور کہا کہ " میرے خیال میں تو مولوی صاحب اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے ۔ دراصل بات یہ ہے کہ جو شخص بھی کسی عظیم مقصد کو خلوص اور لگن سے لے کر بڑھا وہ باوجود مخالفتوں اور رکاوٹوں کے کامیاب ہی رہا ۔ مولوی صاحب نے اردو کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولوی صاحب حیدرآباد میں جب انجمن کے لئے چندا جمع کرنے اٹھے تو لوگوں میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر اس کار خیر میں حصہ لے عورتوں نے اپنے زیورات اتار اتار کر مولوی صاحب کو دے دیئے میں نے بھی اپنے ہاتھ کی طلائی چوڑیاں اتار کر مولوی صاحب کی نذر کر دی تھیں مولوی صاحب بے انتہا مسرور تھے کہنے لگے دیکھو۔ دیکھو یہ اپنے زیور دے رہی ہے ۔ عورتوں کو تو زیور بہت پیارا ہوتا ہے، دراصل یہ مولوی صاحب کے خلوص اور نیک نیتی کا ردعمل تھا مولوی صاحب نے محض اپنی محبت اور لگن سے انجمن کو ایک زندہ ادارہ بنا دیا اور اردو کو ایک عالمگیر نہ سہی ملک گیر زبان بنا دیا اردو ادب کا دامن انمول اور نایاب جواہر سے بھر دیا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ جس مقصد کو لے کر اٹھے اس کی خاطر انھوں نے تن من دھن سب کچھ لٹا دیا ۔



محترمہ منیر بانو اپنی بچیوں کے ساتھ

محمود الرحمٰن

پروفیسر اے بی اے حلیم

مدیر "قومی زبان" نے مجھے بتایا کہ "قومی زبان" کا بابائے اردو نمبر شائع ہو رہا ہے اور میں اس کے لئے پروفیسر حلیم صاحب سے ایک انٹرویو لوں۔ بھلا مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ اور پھر یہ سلسلہ بھی تو بے حد کارآمد ہے۔ اس طرح بابائے اردو مرحوم کی حیات کے مختلف اور متنوع گوشے دائرہ نور میں آجاتے ہیں۔ ان کے تعلقات بڑے ہمہ گیر تھے اور برصغیر کی لاتعداد ہستیوں نے انھیں قریب سے دیکھا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان بزرگوں سے مل کر بابائے اردو کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائی جائیں تاکہ مرحوم کی کتاب زیست کا ہر ہر ورق نمایاں ہو جائے۔ یہ انٹرویو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

میں نے پروفیسر صاحب کو فون کیا۔ وہ ان دنوں بے حد مصروف تھے۔ یوم آزادی کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر انھیں مختلف تقریبات میں شرکت کرنی تھی۔ متعدد مضامین لکھنے تھے۔ لیکن انھوں نے جیسے ہی بابائے اردو کا نام سنا، انٹرویو کے لئے وقت نکالنے پر فوراً تیار ہو گئے۔ اور مجھے اتوار، ۱۳ راگست کی صبح کو اپنی قیام گاہ پر بلا لیا۔

اس انٹرویو کا حال درج کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی شخصیت کا ایک جائزہ لے لیا جائے تاکہ قارئین ان کی علمی خدمات سے کماحقہٗ واقف ہو جائیں اور تعارف کی تشنگی باقی نہ رہے۔

پروفیسر حلیم صاحب تعلیمی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا تعلق صوبہ بہار کے اس مقام سے ہے جہاں بدھ مذہب کے بانی گوتم بدھ کو عرفان حاصل ہوا تھا۔ تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کر کے موصوف یورپ چلے گئے جہاں انھوں نے آکسفورڈ یونی ورسٹی سے تاریخ میں بی اے (آنرز) کی ڈگری لی۔ پھر لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں وطن واپس آئے اور مسلم یونی ورسٹی میں تاریخ کے ریڈر اور اس کے فوراً ہی بعد پروفیسر مقرر ہوئے۔ بایں ہمہ تاریخ و سیاسیات کے شعبے کی صدارت کے فرائض بھی انھیں تفویض ہوئے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۴ء تک یعنی پورے نو سال آپ علی گڑھ یونی ورسٹی کے پرو وائس چانسلر بھی رہے ہیں۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے علی گڑھ سے کراچی تشریف لائے اور سندھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

جون ۱۹۵۱ء میں آپ کا تقرر کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر ہوا۔ یہاں کامل دو ٹرم یعنی چھ سال پورے کرکے آپ جون ۱۹۵۷ء میں ریٹائر ہوئے۔

مزید برآں آپ حسب ذیل اداروں کی ذمہ داریاں بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔

۱۔ چیرمین آف کونسل پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز

۲۔ صدر، موتمر عالم اسلامی (پاکستان)

۳۔ رکن اسلامی مشاورتی کونسل

صدر مملکت نے سماجی برائیوں کے انسداد کا کمیشن قائم کیا تو پروفیسر حلیم صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ آپ کی سرکردگی میں اس کمیشن نے پورے ملک کا دورہ کیا اور نہایت جاں فشانی کے ساتھ مطلوبہ رپورٹ مرتب کرکے صدر مملکت کو پیش کردی گئی۔

جب میں انٹرویو کی غرض سے ان کی قیام گاہ پر پہنچا تو ڈرائنگ روم میں کسی سے مصروف گفتگو تھے۔ میں ان کی لائبریری میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تشریف لائے اور معذرت کرنے لگے۔ پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ میرے استفسار پر انھوں نے فرمایا کہ جب وہ ۱۹۲۲ء میں انگلستان سے فارغ التحصیل ہوکر علی گڑھ آئے تو پہلی مرتبہ مولوی صاحب کا نام وہیں سننے میں آیا یہیں موصوف کو بابائے اردو سے ملنے کے متعدد مواقع حاصل ہوئے۔ مولوی صاحب کے علی گڑھ سے تعلقات کے بارے میں حلیم صاحب نے بتایا:۔

> "بابائے اردو علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے اور علی گڑھ بار بار تشریف لاتے تھے۔ انھیں علی گڑھ سے خاص دلچسپی تھی۔ کچھ عرصے تک وہ کورٹ یعنی سینٹ کے ممبر بھی رہے۔"

جب میں نے اس قسم کی ملاقاتوں پر روشنی ڈالنے کی استدعا کی تو حلیم صاحب کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر مسکرا پڑے، جیسے انھیں ماضی کا حسین دور اور علی گڑھ کی پرکیف فضا یاد آگئی ہو۔ کہنے لگے:۔

> "دو ملاقاتیں مجھے خاص طور پر یاد ہیں۔ ایک ملاقات مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے ہاں ہوئی۔ مولانا سے اور ڈاکٹر صاحب سے کافی دوستی تھی۔ حالانکہ دونوں کے خیالات میں کافی اختلافات تھے دوسری ملاقات جو مجھے یاد ہے، اس زمانے میں ہوئی جب ڈاکٹر صاحب سر راس مسعود کی وائس چانسلری کے دور میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ سر راس مسعود اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے درمیان بہت گہرے

مراسم تھے۔"

علی گڑھ کا ذکر چل نکلا تو میں نے بابائے اردو کے مقصد حیات یعنی اردو زبان کے بارے میں بھی کچھ پوچھنا مناسب سمجھا۔ پروفیسر صاحب کامل پچیس سال تک علی گڑھ کی علمی فضا میں زندگی بسر کر چکے تھے۔ نو سال تک پرو وائس چانسلر بھی رہے تھے۔ لہذا میں نے ان سے علی گڑھ میں اردو کی حیثیت اور مرتبے کے متعلق سوال کر ہی ڈالا۔ موصوف نے جواب میں فرمایا:۔

"میرے پروفیسری یا پرو وائس چانسلری کے زمانے میں علی گڑھ میں اردو ایک لازمی مضمون تھا اور سب طلبہ کے لئے اس کا سیکھنا ضروری تھا۔ حتیٰ کہ غیر ممالک کے طلبہ بھی، جو تعلیم کی غرض سے یہاں آئے تھے، اردو پڑھتے تھے۔ ہوسٹلوں میں مختلف صوبوں کے لڑکے ایک ساتھ رہتے تھے۔ وہ سب اردو ہی میں بات چیت کرتے تھے۔ بہت سے لڑکے ایسے علاقوں سے آتے تھے، جہاں اردو مطلق نہیں بولی جاتی تھی لیکن وہ سب بھی علی گڑھ آکر اردو ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے ایسے لڑکے جب علی گڑھ میں چند سال رہ جاتے تھے، چاہے مدراس کے ہوں یا بنگال کے، سندھ کے ہوں یا بلوچستان کے، اتنی اچھی اردو بولتے تھے کہ یہ تمیز کرنا غیر ممکن ہو جاتا تھا کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں۔"

علی گڑھ کے اس ذکر کے بعد کراچی کا تذکرہ لازمی تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بار بار پیدا ہو رہا تھا کہ اردو کالج کے قیام کے سلسلے میں موصوف سے مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ اس لئے کہ وہ اس زمانے میں سندھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور اردو کالج کے قیام کے جملہ مراحل انھی کی سرکردگی میں طے ہوئے تھے۔ لہذا میں نے ان سے اس مسئلے پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی۔ حلیم صاحب نے نہایت متانت کے ساتھ فرمایا:۔

"جب بابائے اردو نے کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا تو مجھ سے ملے اور اس سلسلے میں کئی دفعہ تبادلۂ خیالات کئے۔ پاکستان نیا نیا وجود میں آیا تھا۔ سندھ یونیورسٹی قائم ہو چکی تھی۔ کراچی کا تعلق اسی یونی ورسٹی سے تھا۔ انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم تھی۔ اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز سندھ کے لئے بالکل نئی تھی۔ اس لئے مجھے اس سلسلے میں سنڈیکیٹ سے منظوری حاصل کرنے میں کافی کوشش کرنی پڑی۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کالج قائم کرنے میں مولوی صاحب کو مختلف دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور انھوں نے نہایت ہمت سے ان دقتوں

کا مقابلہ کیا ۔ اردو کالج اپنی نوعیت کا پہلا کالج تھا اور پاکستان میں
اس کی حیثیت ایک تجربے کی تھی ۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ۔ کردار کی بلندی، خیالات کی رفعت، عزم کی وسعت اور کام سے دلی لگاؤ کے سبب ان کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی ۔ جو بھی ان سے ملا، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا ۔ ہر ایک نے بابائے اردو سے اپنی ملاقات کو سرمایۂ جاں تصور کیا ۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ پروفیسر حلیم صاحب بھی متعدد بار بابائے اردو سے مل چکے ہیں ۔ وہ یقیناً ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلو سے متاثر ہوئے ہوں گے ۔ کیوں نہ اس سلسلے میں ان کی رائے دریافت کی جائے ۔

میرے استفسار پر موصوف مسکرائے ۔ ان کی آنکھوں میں بے پناہ چمک پیدا ہو گئی ۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بابائے اردو کا عظیم و جلیل پیکر ان کی نگاہوں کے سامنے آگیا ہو ۔ اور وہ اس کی خوبیاں گنانے لگے ۔

"بابائے اردو میں متعدد خوبیاں تھیں جنھوں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ۔ اوّل تو ان میں خلوص تھا ۔ دوسرے وہ اپنے اصول کے بڑے پکے تھے ۔ جس کام کو بھی وہ اپنے ہاتھ میں لیتے تھے اس کو پوری توجہ اور انتہائی محنت سے انجام دیتے تھے ۔ اور اپنے ذاتی آرام اور آسائش کا کچھ خیال نہیں کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ ان میں صاف گوئی تھی ۔"

پروفیسر حلیم صاحب کی زبان سے بابائے اردو کی یہ خوبیاں سن کر میں حد درجہ متاثر ہوا ۔ اور دل میں مرحوم کی عظمت سربلندی اور قدر و منزلت کا احساس لئے ہوئے وہاں سے رخصت ہوا ۔

مولوی عبدالحق نے سادہ نگاری کو ترقی دی، نقد و تبصرہ کی نئی راہ نکالی، اردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھا دی ۔ اردو قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا، اردو لغت، اردو تذکرے، اردو کے پرانے دیوان اور اردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں اور لکھوائیں اور انجمن ترقی اردو کو ہر حیثیت سے وہ ترقی دی کہ آج وہ ملک کا ایک زندہ ادارہ ہے ۔

مولانا سید سلیمان ندوی

شمیم احمد

غلام محمدؐ خاں

ادارۂ قومی زبان کے اراکین بابائے اردو نمبر کی تیاری میں مصروف تھے کہ ایک کارڈ موصول ہوا۔ یہ کارڈ غلام محمد خاں صاحب کا تھا جنہوں نے تحریر کیا تھا "میں نے سنا ہے کہ انجمن ترقی اردو بابائے اردو پہ کوئی کتاب ترتیب کر رہی ہے۔ اورنگ آباد اور حیدرآباد میں ملازمت کے دوران میں بھی مولوی عبدالحق صاحب سے واقف رہا ہوں اور انکی زندگی کے بعض پہلوؤں کا شناسا ہوں۔ اگر ضرورت سمجھیں تو مجھ سے مل لیں"۔ ہم لوگوں نے ذہن پر زور ڈالا کہ ان صاحب کا سراغ کہیں مل جاتا۔ مگر آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ باوجودیکہ مولوی صاحب کے ملنے والوں کا ایک زبردست ریکارڈ انجمن کے پاس محفوظ ہوگیا ہے۔ مگر خدا جانے ابھی کتنے ایسے لوگ ہونگے جن سے مولوی صاحب نے اپنی طویل عمر میں شناسائی حاصل کی اور جو اب گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خیر ہم کو تو یہ خط ایک نوید مسرت بن کر ملا اور اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں کے مصداق کان پر قلم رکھا اور چل دیئے۔

غلام محمد خاں صاحب کا وطن موضع رام گڑھ لدھیانہ ہے ۱۸۹۲ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کے والد جناب غلام نبی خاں صاحب انجینئر تھے۔ اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ ملازمت کی وجہ سے یوپی کے شہروں میں بسر ہوا۔ جہاں وہ ڈسٹرکٹ انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ غلام محمد خاں صاحب نے ۱۹۰۷ء میں جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ سے انٹرینس کیا اور فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے کی وجہ سے وظیفہ حاصل کیا اس کے بعد انہوں نے کیننگ کالج سے انٹر سائنس کیا۔ اسی دوران ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ جس کی وجہ سے وہ اس امتحان میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اب یہ سوال اٹھا کہ اب ان کو بی۔ ایس۔ سی میں کہاں داخلہ لینا چاہیئے۔ غلام محمد خاں صاحب کے چچا زاد جو لندن سے ریاضی میں ٹرائی پوس کر چکے تھے یہ مشورہ دیا کہ غلام محمد کو انگلینڈ بھیج دیا جائے۔ اس زمانے میں پاسپورٹ، ویزا اور فارن ایکسچینج کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ایک ایجنٹ کے ذریعے لندن میں تمام انتظامات ہو گئے اور غلام محمد خاں صاحب نے ۱۹۱۰ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی میں بی ایس سی انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا اور یہیں سے ۱۹۱۳ء میں ڈگری حاصل کی کئی مضامین میں امتیازی نمبر حاصل کئے اور پھر مزید ایک سال رہ کر ایم اے بھی کرلیا۔ مضامین میں منطق اور مابعد الطبیعیات بھی شامل تھے۔ اس زمانے میں کئی مضامین پاس کرنے کے بعد یہ ڈگری ملتی تھی۔

ستمبر ۱۹۱۴ء میں غلام محمد خاں صاحب ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے مگر جنگ عظیم چھڑ چکی تھی۔ اس لئے وہ اٹلی اور قاہرہ ہوتے ہی چھ ماہ میں وطن واپس پہنچ سکے۔ ابتداً کچھ عرصے کے لئے یوپی کے پی ڈبلیو ڈی کے محکمے میں اسسٹنٹ انجینئر ہوگئے مگر بعض دوستوں کے مشورے پر حیدرآباد دکن میں بھی ملازمت کے لئے درخواست دے دی تھی۔ جہاں سے ان کا بہت جلد محکمۂ تعمیرات میں اسسٹنٹ انجینئری کی پوسٹ پر تقرر کا پروانہ آگیا۔ غلام محمد خاں صاحب (جو جی ایم خان صاحب کے نام سے زیادہ مشہور ہیں) کا پہلا تقرر ۱۹۱۵ء میں اورنگ آباد میں ہوا۔ جی ایم خان صاحب

اورنگ آباد جانے کے لئے جب حیدرآباد اسٹیشن پر آئے تو چھوٹی لائن کے ایک ڈبے میں انہیں سب سے نمایاں، ممتاز اور پرکشش شخصیت ایک ایسے بزرگ کی نظر آئی جن کی سفید داڑھی، ترکی ٹوپی اور شیروانی خود بخود اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس وقت غلام محمد خاں صاحب کی عمر تیئس سال تھی۔ انہوں نے بے اختیار اُن بزرگ سے سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔ غلام محمد خاں صاحب کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا کہ یہ نورانی داڑھی والے بزرگ بھی اورنگ آباد جا رہے ہیں تو مجھے از خود بہت اطمینان محسوس ہوا کہ یہ ضرور میری مدد کریںگے۔ چنانچہ میں نے اپنے بارے میں ابتدائی معلومات انہیں دیں اور کہا کہ میں یہاں ایک اجنبی ہوں اگر آپ اورنگ آباد میں کسی اچھے ہوٹل کا پتا بتا سکیں تو مجھ پر بڑا کرم ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہاں وہاں ایک بہت اچھا ہوٹل ہے میں آپ کو وہاں لے چلوں گا۔ مجھے دلی اطمینان ہوگیا۔ اورنگ آباد آیا تو میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ میں تانگہ لئے لیتا ہوں۔ آپ کہاں جائیں گے اور میرا ہوٹل کہاں ہے وہ آپ تانگے والے کو بتا دیں۔ اس دوران میں وہ ایک تانگے میں بیٹھ چکے تھے، انہوں نے کہا کہ آپ بالکل بے فکر ہو کر میرے ساتھ چلیں۔ یہ تانگا مولوی صاحب ہی کا تھا۔ تانگا کئی میل چلتا گیا یہاں تک کہ شہر کے باہر آیا تو مجھے پریشانی ہوئی۔ میں نے پوچھا کیا ہوٹل جنگل میں واقع ہے۔ وہ سنجیدگی سے بولے نہیں تو مگر ہے ایسا کہ آپ دیکھ کر خوش ہوں گے۔ یہاں تک کہ ایک عمارت سامنے آئی پورا تاج محل کا نقشہ ذہن میں پھر گیا۔ مگر صفائی میں کمی سی محسوس ہوتی۔ تانگا یہاں ٹھہرا تو مولوی صاحب نے کہا کہ یہ ہوٹل کیسا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مقبرہ سا معلوم ہوتا ہے کہنے لگے "ہاں ہے تو مقبرہ۔ اورنگ زیب کی بیگم رابعہ درانی کا مقبرہ ہے۔" میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا "اور ہوٹل؟" فرمایا "ہوٹل بھی یہیں ہے۔" مقبرے کے قریب نظام کا شاہی باغ تھا اور وہیں ایک مکان تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ یہ کس کا مکان ہے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ یہ میرا غریب خانہ ہے۔ یہاں ہوٹل کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ آپ پریشان تھے۔ اس لئے اب اس مکان کو ہوٹل سمجھیے اور اطمینان سے رہیے۔ اس وقت نہ مولوی صاحب بابائے اردو تھے اور نہ اردو کے صاحب طرز ادیب، غلام محمد خاں صاحب کے لئے وہ تو صرف انسپکٹر تعلیمات تھے۔ وہ ان کے اس اعلیٰ اور بے غرض اخلاق پر لہلوٹ ہو گئے۔ گو انھوں نے مکان کی تلاش فوراً شروع کردی تھی پھر بھی ان کا قیام مولوی صاحب کے ساتھ تقریباً تین ہفتے رہا۔ کچھ ہی دن کے بعد مولوی صاحب دورے پر جانے لگے تو میں نے اپنی مساعی مکان کے لئے تیز کردیں۔ مولوی صاحب نے بھانپ لیا اور مجھ سے کہا بھئی آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ یہاں اطمینان سے رہیئے۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور واقعی مجھے ذرہ برابر تکلیف یا اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔" غلام محمد خاں صاحب کو پھر ایک مکان مل گیا۔ اور وہ اپنے مکان میں منتقل ہوگئے۔ مگر مولوی صاحب سے ویسے ہی مراسم رہے۔ غلام محمد خاں صاحب نے عادات و مزاج کا جو نقشہ کھینچا۔ اس میں ان کو دو باتیں بہت اہم نظر آئیں۔ ایک تو وہ نہایت سادگی پسند تھے اور دوسرے وقت کے بہت پابند تھے۔ غلام محمد خاں صاحب نے بتایا کہ مولوی صاحب بہت کم گو تھے۔ اور بہت ہی تلی گفتگو کرتے تھے اور اِدھر اُدھر کی یاوہ گوئی بالکل نہیں کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ مولوی صاحب کے مکان میں تھے ان کو ان کے ایک شغل کا پتا چلا اور وہ تھا حُقّہ۔ کبھی کبھی مولوی صاحب غلام محمد خاں صاحب کے ساتھ رابعہ درانی کے مقبرے کے قریب چاندنی میں بیٹھ کر گفتگو کرتے تھے سحر انگیز چاندنی میں تاج محل کی نقل بھی اس وقت اصل معلوم ہوتی تھی اور موتیے کے پھول! عجیب منظر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی قصے کہانیاں اور کبھی تعلیمی مسائل پر گفتگو بھی ہوتی۔" میں نے مولوی صاحب کی عظیم الشان لائبریری بھی دیکھی اور وہاں سے میں نے پہلی کتاب ڈارون کے تصور ارتقا پر پڑھی۔ مولوی صاحب سے جو اس کے بارے میں گفتگو کی تو، انہوں نے کہا بات تو سچ ہی ہے۔" میں اس وقت نوجوان تھا۔ مگر پھر بھی گنڈے دار نمازی تھا مجھے یہ بات ذرا ناگوار گزری۔ ایک دو جملے انہوں نے ذرا مذہب کے بارے میں بھی کڑے کہے۔ میں اپنی تربیت کی وجہ سے بالکل خاموش رہا اور مولوی صاحب کی بزرگی

کی وجہ سے دم بخود۔ ابھی میں نے کہیں پڑھا ہے کہ دو ایک حضرات اس کے گواہ ہیں کہ انہوں نے دوبار نماز بھی پڑھی تھی۔" اس موقع پر غلام محمد خاں صاحب کا ایک جملہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ انہوں نے کہا کہ میں کئی برس سے تقریباً روزانہ اپنے والد اور والدہ کو فاتحہ سے بخشتا ہوں اور اس میں مولوی صاحب کو ضرور شریک کر لیتا ہوں۔ میں مولوی صاحب کی جو خدمت کر سکتا ہوں وہ یہی ہے۔"

غلام محمد خاں صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب کی ایک صفت سے میں ہمیشہ مرعوب رہا۔ اور ہمیشہ وہ مجھے اس پہلو سے بہت بڑے انسان نظر آئے۔ وہ پہلو انسانی ہمدردی کا پہلو تھا۔ مولوی صاحب میں ہر انسان کے کام آنے کا جوہر پوشیدہ تھا۔ وہ لوگوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور ان کے اس مزاج کا اظہار طرح طرح سے ہوا کرتا تھا۔ اورنگ آباد کے زمانے کا ایک چشم دید واقعہ انھوں نے بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک مرہٹا ہندو ٹیچر تھا۔ جس کو کسی جرم کی وجہ سے سزا ہوگئی تھی۔ اور اس کو ضمانت کی ضرورت تھی۔ وہ مولوی صاحب کے پاس آیا اور انہوں نے بلا تکلف ضمانت دے دی۔ حالانکہ ہر آدمی نے ان سے کہا کہ یہ بہت خطرناک آدمی ہے بھاگ جائیگا اور آپ مشکل میں پڑینگے۔ مگر وہ برابر یہ کہتے رہے کہ میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے اور میں ضرور ضمانت دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں غلام محمد خاں صاحب کا تبادلہ ہوگیا۔ اور مولوی صاحب سے مراسم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مگر ۱۹۲۶ء میں یہ تعلق اسطرح پھر قائم ہوا کہ مولوی صاحب جب حیدرآباد آئے تو غلام محمد خاں صاحب کے مکان "سلطنت منزل" میں ایک سال تک رہے۔ انکے ساتھ مولوی ہاشمی فرید آبادی بھی تھے۔ اور وہ اپنی بیگم کے ساتھ تھے۔ یہاں بھی مولوی صاحب کے اسی انسانی پہلو کا مظاہرہ انہوں نے دیکھا۔ ہاشمی صاحب کی بیگم پردہ کرتی تھیں۔ اس لئے مولوی صاحب نے انہیں مکان کا اندرونی حصہ دیا اور خود باہر رہا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کو جب نہانے کی ضرورت ہوتی تو وہ باہر ٹاٹ کا پردہ لگا کر نہایا کرتے تھے۔ مگر اندر جانا انہیں گوارا نہ تھا۔ غلام محمد خاں صاحب سے ملاقات کا دوسرا دور ۱۹۲۷ء میں شروع ہوا۔ جب وہ حیدرآباد میں ایگزیکیٹو انجینئر ہوکر آئے۔ اس زمانے میں یہاں سر اکبر حیدری وزیر مالیات تھے اور ان کی توجہ سے یہاں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی۔ اس یونیورسٹی کا پورا منصوبہ مولوی صاحب کا تھا اور سر اکبر حیدری سے انکے مستحکم تعلقات کی بڑی دھوم تھی۔ مولوی صاحب نے ایک بار مجھ سے کہا "مجھے حیدرآباد سخت ناپسند ہے" میں نے کہا کیوں مولوی صاحب" کہنے لگے "حیدرآباد کی ملاقاتوں سے تنگ ہوں اور عام ملاقاتوں کے علاوہ خصوصیت سے ایک ملاقات سے تو بہت تنگ آگیا ہوں" میرے استفسار پر وہ گویا ہوئے۔ "دور دور سے لوگ آتے ہیں اور محض اس لئے آتے ہیں کہ سر اکبر حیدری سے سفارش کر دو۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ خود ساتھ چلنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ بلکہ مجھے اکیلا ہی بھیجنے پر اصرار کرتے ہیں۔" میں نے کہا کہ آپ انکار کر دیا کریں" بولے "یہی نہیں ہوتا۔" اکثر مولوی صاحب کو چندے والے بھی پکڑ لیا کرتے تھے۔ حیدرآباد میں ایک صاحب کرنل نظیر الاسلام تھے جو قاضی عبدالغفار کے دوست تھے قاضی صاحب وہاں سے پیام نامی اخبار نکالتے تھے۔ اس کی مالی حالت سقیم تھی۔ کرنل صاحب نے جھٹ مولوی صاحب کو پکڑا اور ان کے ساتھ چندا جمع کرنے کیلئے نکل گئے۔ مولوی صاحب ان لوگوں کو لے کر میرے پاس بھی آئے اور کہنے لگے لو بھئی جی۔ ایم خان آج جی بھر کے چندا دیدو۔ میں مولوی صاحب کا بہت احترام کرتا تھا۔ میں نے کہا مولوی صاحب جو فرمائیں۔ کہا نہیں چندا مرضی کا ہوتا ہے خود دو جو جی چاہے۔ میں نے سو روپے پیش کئے بہت خوش ہوئے۔

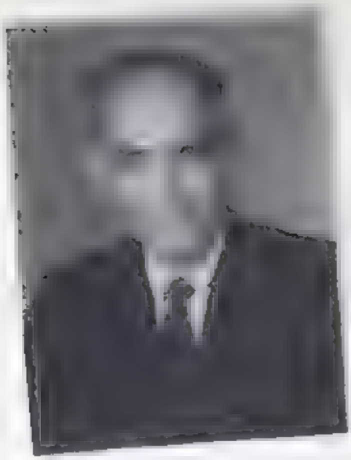
غلام محمد خاں صاحب نے مولوی صاحب کے اس پہلو کا بہت عقیدت سے ذکر کیا اور کہا کہ حیدرآباد سے تبادلہ ہوا تو پھر مولوی صاحب سے وہاں ملاقات ہی نہ ہوسکی۔ غلام محمد خاں صاحب کچھ دیر رکے اور کہا "میں ستمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آیا اور کراچی میں مقیم ہوا۔ یہاں میں جوائنٹ واٹر بورڈ میں چیف انجینئر ہوگیا تھا اور شکارپور کولونی میں ایک مکان میں کرایہ پر رہتا تھا۔ ایک روز اچانک ملازم نے آکر کہا کہ آپ سے ملنے کوئی صاحب آئے ہیں۔ میں نے

کہ کون صاحب ہیں۔ نام کیوں نہیں پوچھا۔ ملازم نے کہا کہ کوئی مولوی صاحب ہیں۔ سفید داڑھی ہے اور شیروانی پہنے ہوئے ہیں۔ میں سمجھا کسی مسجد یا یتیم خانے کے کارکن ہوں گے۔ مگر بیوی نے کہا کہ جا کر دیکھ تو پتا نہیں کون ہیں۔ اب جو باہر جا کر دیکھا تو مولوی صاحب کھڑے ہیں۔ میں بے اختیار ان سے لپٹ گیا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ کام سے آیا ہوں۔ میں نے کہا ارشاد۔ اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ اس کو اپنے ہاں نوکری دلا دو۔ میں نے تعمیل حکم میں اگلے روز اسے ملازم رکھ لیا۔ پھر مولوی صاحب سے کئی بار مختلف سرکاری تقریبات میں ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار غلام محمد صاحب مرحوم جب وزیر مالیات تھے۔ تب بھی ان کے ہاں ملاقات ہوئی۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں غلام محمد خاں صاحب ملازمت سے ریٹائر ہو کر حج کو چلے گئے وہاں مدینہ منورہ میں سعودیہ عربیہ کے وزیر تعمیرات سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مسجد نبوی کی تعمیر اور توسیع کے عملے میں مجھے بہ اصرار شریک کر لیا۔ مگر ایک سال بعد ہی میں بیمار ہو گیا۔ اور مجبوراً سنہ ۱۹۵۲ء میں واپس آ گیا۔ آجکل تنہائی اور یاد خدا میں وقت گزرتا ہے۔ کچھ ہومیوپیتھی سے بھی شفقت ہے اسے مشغلہ سمجھ لیجئے میرا۔ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد مولوی صاحب سے ملاقات ہی نہیں ہوئی سنہ ۱۹۶۰ء میں ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ نہیں ہیں۔ پھر دوسری بار معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ پھر ملنے گیا اور گھر کے اندر گیا۔ مگر ان کے نگراں نے مجھ سے کہا کہ وہ سو رہے ہیں۔ کیا اٹھاؤں۔ میں نے منع کر دیا ہرگز نہیں۔ انہیں آرام کرنے دیجئے اور جب وہ اٹھیں تو انہیں یہ نام اور وزیٹنگ کارڈ دیدیجئے گا۔ جس زمانے میں میری بیوی بیمار تھیں۔ اسی زمانے میں اچانک معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ جن کی ساری زندگی سراپا عمل تھی۔ اور ان کی یہی صفت پاکستانیوں کے لئے قابل تقلید ہے۔ ایک اعلیٰ مقصد اور اس کے لئے مسلسل جدوجہد اور انتھک محنت یہی مولوی صاحب کا سب سے بڑا وصف تھا اور ہر قوم کو اپنے مقاصد کے حصول تک پہنچنے اور اسے تکمیل تک پہنچانے میں اسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ انہوں نے ایک بات یاد کرتے ہوئے کہا کہ ہاں ایک صفت مولوی صاحب کی اور رہ گئی اور وہ یہ ہے کہ وہ خوشامد کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ایسے افراد کو کھری کھری سنا دیتے تھے۔ کاش ہماری قوم اسی بات کو اپنا وطیرہ بنا لے۔ میں نے غلام محمد صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے کبھی مولوی صاحب کی ادبی اور اردو کی خدمات میں بھی دلچسپی لی۔ انہوں نے مسکرا کر انکار کر دیا۔ جی نہیں صرف ایک بار انہوں نے مجھے اپنا ماہی رسالہ "اردو" بھیجا تھا۔ مگر میرے لئے وہ ایک بڑے انسان تھے صرف ادیب نہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب میرے قدیم اور عزیز دوست ہیں۔ وہ ایک مدت سے اردو اور اس کے خوشنما ادب کی نمایاں خدمت کر رہے ہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ جس زبان میں غالبؔ ذوقؔ اور سوداؔ نے اپنے لافانی شعر لکھے، اس کے چاہنے والے سب کے سب ان کی خدمت میں ہدیہ منت و تحسین پیش کریں۔

(مسز سروجنی نائیڈو)

شمیم احمد



شیخ چاند ابن حسین

شیخ چاند ابن حسین اُن معدودے چند سرکاری عہدیداروں میں سے ایک ہیں جو ساری عمر سرکاری خدمات انجام دیتے رہے اور اہم عہدوں پر فائز رہے مگر ہمیشہ دامنِ علم و ادب سے وابستہ رہے۔ اُن کی غیر سرکاری دلچسپیاں اور ذاتی مشاغل صرف کلب یا دعوتوں تک محدود نہیں رہے بلکہ فرصت کے لمحات اور نجی زندگی میں ادب، زبانوں کی تحصیل اور مطالعۂ ادب ہی سے کام رکھا۔ یہ بڑی بات ہے کہ سرکاری خدمات کے ساتھ انھوں نے ادب کی بعض گراں قدر کتابیں مرتب کیں۔ اور اب بھی اُن کا ایک وسیع پروگرام ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اردو کو دو شیخ چاند ملے اور دونوں کا تعلق انجمن اور مولوی عبدالحق سے بہت گہرا رہا۔ شیخ چاند ابن حسین صاحب کے تعلقات بابائے اردو سے تقریباً ۳۰ سال رہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد شیخ چاند ابن حسین نے پاکستانی ملازمت کو ترجیح دی۔ اور وہ جہاں بھی رہے مولوی صاحب سے تعلق قایم رکھا۔ اور بابائے اردو کی فرمائش پر انھوں نے "پھول بن" مرتب کی۔ مولوی صاحب کی رائے میں دکنی زبان پر جتنی قدرت شیخ چاند ابن حسین کو حاصل تھی اتنی بہت کم حضرات کو حاصل تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ برابر دکنی ادب کے اہم مخطوطات کی طرف شیخ صاحب کی توجہ مبذول کراتے رہتے تھے۔ خود شیخ صاحب کا یہ خیال ہے کہ جو دکنی نہیں جانتا وہ اردو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

شیخ چاند ابن حسین ۱۹۰۵ء میں احمد نگر میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے لئے پونا چلے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں بی۔اے فرسٹ ڈویژن میں کیا تو وظیفہ مل گیا۔ لندن یونی ورسٹی سے آنرز اور بیرسٹری پاس کی۔ شیخ صاحب کو ابتدا ہی سے عربی، فارسی اور تاریخ اسلام سے دلچسپی رہی تھی۔ خصوصیت سے عربی پر انھیں خاصا عبور حاصل ہے جس میں انھوں نے ڈی لٹ کیا ہے۔ ابتدا میں بمبئی میں قانون کی پریکٹس شروع کی۔ مگر بعد میں وہیں پروفیسری کو ترجیح دی۔ کچھ عرصے کے بعد دکن کالج ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف سمٹیک لنگویجز سے وابستہ ہوئے اور پھر سرکاری ملازمت میں آگئے۔ سرکاری ملازمت کے دوران شاید ہی کوئی وزارت ہو جس سے اُن کا تعلق نہ رہا ہو۔ تیرہ برس وزارت صنعت و حرفت، وزارت صحت، وزارت تجارت، وزارت زراعت اور پھر وزارتِ تعلیمات میں ڈپٹی سکریٹری رہے۔ پاکستان آنے کے بعد دکنی زبان سے دلچسپی شروع ہوئی جس میں بابائے اردو کا بڑا ہاتھ تھا۔

شیخ چاند ابن حسین نے سب سے پہلے جس کتاب کو مرتب کیا وہ خواجہ محمود گاواں کی تصنیف "ریاض الانشا" تھی۔ دکنی ادب کی سب سے پہلی کتاب "پھول بن" تھی جو مولوی صاحب کی فرمائش پر انھوں نے مرتب کی تھی۔ پھر "خاور نامہ" پر بھی مولوی صاحب ہی کی خواہش پر کام شروع کیا۔ تقریباً ساڑھے چار سال صرف کرنے کے بعد پچھلے دنوں اس کام کو ختم کیا ہے۔ صرف تعارف لکھنا باقی ہے۔ شیخ چاند ابن حسین صاحب نے بتایا کہ مولوی صاحب نے جن کتابوں کی طرف میری توجہ خاص طور سے مبذول کرائی تھی۔ ان میں دو کتابیں ابھی اور باقی ہیں۔ ایک "کدم راؤ پدم راؤ" اور دوسری اشرف کی مثنوی "نو سرہار"۔ ان کا عزم ہے "اپنی زندگی میں مولوی صاحب کی یہ فرمائشیں بھی ضرور پوری کروں گا۔"

شیخ چاند صاحب نے بابائے اردو سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "بابائے اردو سے میری ملاقات میرے چچازاد بھائی مولوی شمس الدین کے ذریعے ہوئی تھی جو اس زمانے میں حیدرآباد میں انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں اورنگ آباد میں ہوئی اس وقت میں طالب علم تھا۔ جس تعلق سے میں گیا تھا اس کی وجہ سے مولوی صاحب پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر شفقت فرمانے لگے اور بطور خاص طور سے چائے پلوائی۔ وہ مجھے چاند میاں کہتے تھے۔ مجھے ان سے جو عقیدت تھی وہ ملاقات کے بعد وہ چند ہوگئی تھی جب میں اورنگ آباد سے چلا آیا تب بھی جہاں رہا، ان سے خط و کتابت کرتا رہا۔ اور جب بھی موقع ملتا ان سے ملنے پہنچ جاتا۔ یہاں تک کہ جب بابائے اردو دہلی منتقل ہوئے تو میں نے بھی اپنا تبادلہ وہاں کرالیا۔ میرے ٹھہرنے کا انتظام بھی مولوی صاحب نے کرایا تھا۔ جہاں ہر اتوار کو میں ان کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔"

قیام پاکستان کے بعد مولوی صاحب کا تو قیام کراچی میں تھا۔ مگر شیخ صاحب ملازمت کے سلسلے میں مستقل کراچی نہیں رہ سکے ۱۹۵۱ء میں وہ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بلوچستان کی حیثیت سے کوئٹہ میں مقیم ہوئے تب مولوی صاحب ہر سال ان کے پاس کوئٹہ جاتے۔ جہاں ان کی قیام گاہ کے خصوصی انتظامات کئے جاتے اور ان کی فرمائش پر ایک خیمہ نصب کرادیا جاتا۔ چنار کے ایک بڑے اور خوبصورت درخت کے پس منظر میں مولوی صاحب کے خیمے کے سامنے کرسیاں ڈالی جاتیں جہاں کوئٹہ میں ان کے عقیدت مند ہر شام ضرور جمع ہوجاتے شیخ چاند صاحب نے اس قربت کی وجہ سے ان کی بعض عادتوں کی بڑی دلچسپ تصویر پیش کی۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ بابائے اردو ہمیشہ عید کے دن سفر کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بھیڑ بھڑکے سے بہت گھبراتے تھے اس لئے کہتے تھے کہ عید کے دن ریل محض میرے لئے چلائی جاتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے کھانوں کے بارے میں ان کا ایک قول سنایا کہ بابا کہتے تھے۔ گوشت درندوں کی غذا ہے۔ ترکاری چرندوں کی اور پھل انسان کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ خود پھل سے بے حد رغبت رکھتے تھے۔ اور گرما، سردا اور انار خصوصیت سے پسند کرتے تھے۔ شیخ چاند صاحب نے ان کی ایک عادت کو بہت خصوصیت سے بیان کیا اور کہا کہ وہ کسی کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے اور کسی کے ہاں کھانے سے گریز کرتے تھے۔ البتہ خود کھلاکر خوش ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ان کا ایک قول بھی سنایا کہ عموماً دعوت اس لئے دی جاتی ہے کہ اس سے کوئی صلہ حاصل کیا جائے۔ دعوت بلاغرض بہت کم لوگ دیتے ہیں۔ بابائے اردو عموماً کوئٹہ میں جون سے اگست تک رہتے تھے ۱۹۵۱ء میں کوئٹہ کے بعض حضرات کی تائید پر ایک اردو کانفرنس کا پروگرام بنا۔ چندا جمع کیا گیا معززین سے عطیہ حاصل کیا گیا۔ مگر بدقسمتی

سے سیاسی فضا اُن دنوں اتنی خراب ہو گئی کہ یہ خیال ملتوی کر دینا پڑا۔ اس سلسلے میں ان حضرات کو بلا کر جن سے عطیات حاصل ہوئے تھے۔ کانفرنس ملتوی کرنے پر اظہار خیال ہوا۔ سب نے اتفاق کیا۔ اب سوال یہ تھا کہ چندے کے روپے کا کیا کیا جائے۔ شیخ چاند صاحب کا کہنا ہے کہ ایک خان بہادر کے سوا جنھوں نے اپنے دیئے ہوئے ۵ سو روپے واپس لے لیے باقی نے ایک پیسہ واپس نہ لیا اور تقریباً ساڑھے تین ہزار روپے انجمن کو دے دیئے گئے۔ یہ کانفرنس شیخ صاحب کی ہی تجویز کردہ تھی۔ انھوں نے بتایا کہ مولوی صاحب صرف مجھ پر ہی انتہائی شفقت نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ میرے دوست ڈاکٹر بشیر قریشی اور ان کی بیگم مسز قریشی سے بھی بے حد محبت فرماتے تھے۔ قریشی صاحب بھی بابا کے پاس روز ہی آتے تھے۔

شیخ صاحب نے بابائے اردو کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اُن سے تین باتیں سیکھیں۔ وعدے کا پاس، صاف گوئی اور اصول پر اڑ جانا۔ انھوں نے کہا "اردو کے سلسلے میں بابا نے جو قربانیاں دی ہیں ان کے ذکر سے قلب روشن ہو جاتا ہے۔ خاندان اور رشتے داروں سے لے کر اپنی جائیداد تک سب کو انھوں نے انجمن پر قربان کر دیا۔" انھوں نے کہا کہ "ایک واقعے کا گواہ میں بھی ہوں کہ اُن کے پاس ایک کار تھی۔ ایک زمانے میں انجمن کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ ملازمین کو تنخواہ نہیں مل سکی۔ انھوں نے یہ کار بیچ کر عملے کی تنخواہ دی۔" شیخ صاحب کا کہنا ہے کہ بابا نے زندگی بھر کی کمائی انجمن میں لگا دی جو لاکھوں روپے ہوتی ہے۔ اپنی ساری زندگی اردو کی خدمت کے لئے وقف کر دینے والی ہستی یقیناً کوئی معمولی ہستی نہیں تھی۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ ایک دن یوم اقبال پر انھوں نے اپنی ان خدمات کا ذکر بھی کیا تھا۔ شیخ صاحب کا کہنا ہے کہ آپ کو اردو کے بارے میں جو کچھ عملی ترقی پاکستان میں نظر آ رہی ہے وہ سب مولوی صاحب کا کارنامہ ہے۔ شیخ صاحب کا اندازہ تھا کہ دس سال کے اندر پاکستان میں اردو عملاً رائج ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ پنجاب اور بلوچستان میں تو اب بھی اردو کو عملاً سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ فخر بلوچستان کو ہی حاصل ہے' میں نے بابائے اردو کے مشورے سے یہاں کی اردو کی نصابی کتابیں لکھوائیں۔ غرض کہ شیخ صاحب اُن مغتنم ہستیوں میں ہیں۔ جن کی عمر کا غالب حصہ مولوی صاحب کو دیکھتے، سنتے اور اُن سے مستفید ہوتے ہوئے گزرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو اردو کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ پچھلے دنوں شیخ صاحب پر بدنصیبی سے فالج کا حملہ ہو گیا تھا۔ جس کے اثرات کے وہ آج بھی شکار ہیں۔ مگر اُن کے عزائم بہت بلند ہیں اور وہ اردو سے بہت پر امید ہیں۔ خدا انھیں صحت کلی عطا فرمائے اور اس تحقیقی کام سے عہدہ برآ ہونے کا موقع بخشے جس کی خواہش بابائے اردو کو بھی تھی۔ بابائے اردو نے "پھول بن" کو دیکھ کر کہا تھا "یہ کام کیا ہے آپ نے۔"

"اس میں کچھ شک نہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔"

آنجہانی مہاتما گاندھی

سلیم تمنائی



محمد ابا سیٹھ

مدیر "قومی زبان" کا نوازش نامہ آیا اور یہ خواہش لایا کہ محسن الملک محمد ابا سیٹھ صاحب کے بارے میں کچھ تحریر کروں ۔ اور ان کے پاس بابائے اردو کے خطوط ۔ تصاویر وغیرہ ہوں تو حاصل کر کے روانہ کروں ۔ سیٹھ صاحب کے بنگلے پہنچا تو ان کے ایک عزیز محمود سیٹھ نے انھیں خبر دی اور میں اندر بلا لیا گیا ۔ ۸۱ سال کی عمر ، لانبا قد ، گندمی رنگ ، ستواں ناک اور نحیفی ، جو ان کی خوبصورتی کے لیے بظاہر عیب تھی ، مگر اس سے بزرگی کی خلعت عطا ہوئی تھی ۔ مجھے دیکھ کر خفا ہوئے ، کیونکہ میں اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے مل نہ سکا تھا ۔ آپ سے ملنے کی خواہش کے ساتھ وقت کا تعین ناممکن تھا ۔ کم سے کم دو چار گھنٹے ان کے پاس رہنا پڑتا ۔ ظاہر ہے مجھ جیسے آدمی کے لیے بہت کچھ سوچ بچار کرنا پڑتا تھا ۔

فرمایا "کیسے بھول پڑے ؟"

ان کے چاہنے کا یہ عالم تھا کہ مجھ جیسے کم مایہ سے کہنے لگے " آپ آجاتے ہیں تو قلب کو ایک گونہ اطمینان اور طمانیت مل جاتی ہے ۔"

میں نے اپنا مدعا بیان کیا ، کہا کہ "قومی زبان" کا عبدالحق نمبر شائع ہو رہا ہے ۔ اس کے لیے مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ آپ سے مل کر بابائے اردو کے خطوط ، کوئی تحریر اور تصاویر وغیرہ ہوں تو حاصل کر کے روانہ کروں ۔

"سلیم صاحب" آپ نے جواب دیا " اب کچھ یاد نہیں آتا جو کچھ یاد ہے لکھے دیتا ہوں ۔ مولوی صاحب کی کوئی تحریر خطوط یا تصاویر میرے پاس نہیں ۔ آپ کو خود اس کا علم ہے ۔ ۱۹۳۶ء میں مولوی صاحب میسور تشریف لائے ، میرے ساتھ یتیم خانہ ملاحظہ فرمایا ۔ بہت خوش ہوئے ۔ میں نے کہا مولوی صاحب اپنی رائے تو تحریر فرمایئے ۔ یہ رہی کتاب الرائے ۔ مولوی صاحب نے اپنی رائے لکھی ، آپ نے دیکھی ہے نہ وہ رائے ؟"

" جی ہاں ! میں نے جواب دیا ، حسنِ اتفاق سے وہ تحریر میرے ساتھ ہی تھی ۔ میں اپنی ریڈیائی تقریر کے ساتھ قومی زبان کو بھجوا رہا تھا ۔ میں نے وہ تحریر پڑھ کر سنائی ۔

" یتیم خانہ اسلامیہ میسور کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ۔ یتیموں کی تعلیم و تربیت کا بہت معقول انتظام ہے اور سب سے زیادہ مسرت اس بات سے ہوئی کہ انھیں عزتِ نفس اور خودداری سکھائی جاتی ہے اور بعض دیگر اسلامی یتیم خانوں کی طرح انھیں بھیک مانگنے یا دعوتیں کھانے کی ترغیب نہیں دی جاتی ہے ۔ سیٹھ محمد صاحب کی اسلامی ہمدردی اور مستعدی اس یتیم خانے اور دوسری اصلاحوں میں بہت کچھ کار فرما ہے ۔"

عبدالحق ۶ جون ۱۹۳۶ء

" ہاں ٹھیک ہے، سیٹھ صاحب نے کہا۔ مولوی صاحب کو دکنی کتابوں کی تلاش تھی، دھن تھی۔ ڈاکٹر اقبال کی آمد کے بعد میسور کے نوجوانوں میں دارالمطالعہ قائم کرنے کا جوش و ولولہ پیدا ہوگیا تھا۔ میں نے اُن کا بھرپور ساتھ دیا، اپنے استاد محترم قبلہ احمد علیؒ مرحوم کے کتب خانے کی اہم کتابیں بھی حاصل کیں۔ دارالمطالعہ کی بنا ڈالی۔ لیکن جب یہاں سے کتابیں کھسکنے لگیں تو یتیم خانہ اطفال منتقل کردی گئیں، پھر یہاں سے انجمن اتحاد اسلام میسور کی لائبریری کی یہ زینت بنیں۔ وہاں سے یار لوگوں نے اورینٹل لائبریری کو بیچ دیا۔

" مجھے پتا ہے"۔ میں نے جواب دیا خریدنے والے علم دوست حضرات نے مجھے بھی دھوکا دیا ہے سیٹھ صاحب۔

" ہاں مجھے اس کا علم ہے"، سیٹھ بولے، " ہاں تو مولوی صاحب نے یہ کتب خانہ دیکھا اور دکنی مخطوطات ہی میں سے کچھ مخطوطات مجھ سے مانگ لیے اور کہا کہ جتنی قیمت آپ ان مخطوطات کی لگا دیں ادا کردوں۔ میں نے کہا، واہ مولوی صاحب واہ! یہ آپ کی خدمت میں میسور کا تحفہ ہے، لے جائیے، اس پر وہ بے حد خوش ہوئے"۔

اکثر جو بھی معزز ادبی مہمان اور لیڈر میسور آتا وہ سیٹھ صاحب سے ملے بغیر نہ جاتا۔ آپ کی اچھی خاصی تجارت تھی۔ انسان بھی فانی ہے۔ تجارت اور پیسہ بھی چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ انھیں اس کا دُکھ نہیں تھا۔ مذہب انھیں بہت پیارا تھا۔ عاشق رسول تھے۔ میلاد کا جلسہ اعلیٰ پیمانے پر مناتے تھے۔ اس دن سارے شہر کی عید ہوتی۔ ریاست اور بیرونِ ریاست کے اچھے سے اچھے مقرر تشریف لاتے وہ لمبی تقریر کے قائل نہیں تھے۔ صاف کہتے مولوی صاحب کافی وقت لے لیا اب بخشیئے۔ اب بڑے سے بڑے مولوی کی کیا مجال کہ وقت خراب کرے۔

ایک دن مجھ سے فرمایا کہ وقت پر میلاد پانچ پہنچ جانا۔ پہلی تقریر آپ کی ہوگی۔ میں نے عرض کیا، سیٹھ صاحب محلے کا حق اوّل ہے۔ جناب فقیر محمدؐ صاحب کے مکان پر ہر سال دوپہر کے دو تا پانچ میلاد منایا جاتا ہے۔ جس میں اکثر پڑھا لکھا طبقہ ہوتا ہے اور اکثر غیر اقوام کے تعلیم یافتہ افراد وہاں مدعو ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ اپنی تقریر کے بعد ان سے اجازت لے کر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن وقت پر نہ پہنچ سکا۔ پانچ دس منٹ کی دیر ہوگئی، جیسے ہی داخل ہوا عوام سے پتا چلا کہ سیٹھ صاحب نے میکروفون پر اب تک پانچ دس مرتبہ یہ اعلان کردیا ہے کہ سلیم صاحب ابھی نہیں آئے۔ میں مسکرا کر آگے بڑھا۔

" کہاں ہیں آپ بھلے آدمی؟" سیٹھ صاحب نے پوچھا۔

میں نے مسکرا کر کہا " حاضر ہوں ـــ" مسکرا دیئے، خیر آؤ، مغرب کی نماز کے بعد آپ کی تقریر ہوگی۔

آپ کی دعوت پر ایک معزز وزیر تشریف لائے، تقریر کی۔ سیٹھ صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ کہا اچھے آدمی ہیں مسلمانوں کے بھی دوست ہیں۔ مسلمان بھی ان کی مدد کرتے رہے ہیں۔ میری دعوت قبول کرلی ـــ یہ وقت پر نہ سہی مگر بڑی بات ہے آ تو گئے۔ اگر نہ آتے تو مجھے حق تھا۔ ایک بزرگ کے ناتے سے کہ انھیں مارتا بھی، کیوں؟ ـــ بے چارے وزیر محترم نے کہا، یقیناً آپ کو حق ہے"۔

ؔ اچھے معلموں اور شاعروں میں شمار تھا۔ ان کا نعتیہ دیوان نول کشور پریس لکھنؤ سے چھپا تھا۔ کئی ایک نثری تصانیف بھی ہیں۔

ؔ انگریزی کے مشہور ادیب و شاعر

اس بات میں بڑی اصلیت تھی۔ بڑے دبدبے کے آدمی تھے۔ بڑے سے بڑے آدمی کو عوام کے سامنے کھری کھری سنا دیتے۔ وہ مسکرا مسکرا کر زہر کے گھونٹ پیتے جاتا۔

عوام اُن سے بڑی محبت کرتے تھے۔ بارش ہو کہ کڑی دھوپ۔ سیٹھ صاحب حکم لگاتے "بیٹھ جاؤ"، جیسے عوام کل کے گھوڑے تھے۔ بارش میں بھیگتے ہوئے ہنستے مسکراتے بیٹھ جاتے، یا کڑی دھوپ میں کھڑے نظر آتے۔ الیکشن جیتنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ساری عمر میونسپل کونسلر رہے۔ برسوں ایم ایل اے۔

جنوری ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر اقبال میسور تشریف لائے تو ان کے ساتھ رہے۔ سرنگا پٹم میں جب روضہ سلطانی میں ڈاکٹر اقبال نے مراقبہ کیا اور اندر سے چھلکتی چھلکتی آنکھیں لیے باہر آئے تو کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ حال دریافت کرے۔ آخر سیٹھ صاحب آگے بڑھے اور بڑی بے تکلفی سے دریافت فرمایا "ڈاکٹر صاحب! فرمائیے سلطان ٹیپو سے کچھ پیغام ملا؟" اس پر حضرت اقبال نے فرمایا، ہاں ملا ہے۔ مراقبے ہی میں یہ پیغام شعر کی صورت میں ڈھل گیا ہے ؎

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست

ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ مذہب انھیں پیارا تھا۔ اس سے حضرت اقبال جیسا شخص متاثر نہ ہو، ناممکن، محمد جمیل صاحب کے نام خط میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "ان تک میرا اسلام شوق پہنچا دیجئے۔ اور ان سے کہئے کہ اسلام کی خدمت کے لیے ان کے ذوق و شوق نے میرے دل پر ایک ایسا اثر پیدا کیا ہے جو کبھی محو نہ ہو گا۔"

حضرت اقبال کے اشعار سے میسور کے مسلم نوجوانوں اور خصوصاً سیٹھ محترم پر ان کی تقاریر کا کچھ کم اثر نہیں ہوا۔ تاریخی تحقیق کا ذوق اور شوق کافی بڑھا اور محمد ابا سیٹھ صاحب جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ مخطوطات ڈھونڈ ڈھونڈ کر لانے لگے۔ انھی میں چند دکنی مخطوطات ایسے تھے جسے ۱۹۳۷ء میں بابائے اُردو نے پسند کیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے علاوہ میسور سے شائع ہونے والے قدیم اخبار و رسائل بھی ساتھ لے گئے۔ ایک مضمون بھی اس سلسلے میں رسالہ "اردو" میں لکھا تھا۔

"سلیم صاحب! ابا سیٹھ نے مارفیا انجکشن خود لیتے ہوئے کہا، جب میں ایشیا کے مختلف مقامات کی سیر کے بعد پاکستان گیا تو مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بغل گیر ہوئے، محبت سے پیش آئے۔ اپنا کتب خانہ دکھایا اور وہ دکنی کتابیں بھی جو مجھ سے لے گئے تھے۔ کہا، میں نے ابھی تک انھیں محفوظ رکھا ہے۔ قسمت سے بچ رہیں۔" اپنے پاس کچھ دن رہنے پر زور دیا۔ لیکن رشتے دار مجھے لے اڑے۔ بس وہ آخری ملاقات تھی، جب میں نے ان کی مجبوریوں کا حال پڑھا تو ان کے دشمنوں کے لیے بد دعا نکلی۔ آج نہ بزرگوں سے پہلی سی محبت و عقیدت ہے اور نہ بزرگوں کی نوجوانوں پر شفقت۔ جب بندھنوں سے رہائی ہوئی تو اس خبر پر کافی خوشی و مسرت کا اظہار فرمایا۔

سلیم صاحب! آپ نے کہا۔ مولوی صاحب جو میرے بھائی ہیں، سچی بات منہ پر کہتے ہیں، اور یار لوگ برداشت نہیں کر سکتے، بے چارے کا دل آئینہ ہے۔

دوسری بار ملا تو دریافت فرمایا، کیا مضمون روانہ کر دیا سلیم صاحب! — میرے "نہ" پر فرمایا، آپ اپنے سر پر ڈھیر سارے کام

لیے پھرتے ہیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے۔ ہاں آپ کی بھجوائی ہوئی ٹیپو کی سول لسٹ (civil list) مل گئی۔ اس کتاب کے آپ نے میری اجازت سے فوٹو لیے اور کتاب کے ساتھ فوٹو بھی تحفۃً عنایت کیے، وہ کم بخت ......" ایک فارسی کے لیکچرار صاحب کو جو اپنے آپ کو اُردو فارسی عربی کے مشترکہ لیکچرار کہتے اور سمجھتے تھے، خوب سنائی۔ جنھوں نے سیٹھ صاحب کی اجازت کے بغیر اس کتاب کے فوٹو بھی لیے تھے اور کتاب بھی نقل کر لی تھی۔ اس کتاب پر سلطان ٹیپو کے دستخط اور مہر بھی ہے۔ مہر میں ٹیپو سلطان ہے مگر دستخط میں "نبی مالک" اپنی سلطنت کا نام سلطان نے سرکارِ خداداد یا سرکارِ احمدی رکھا تھا۔ عشقِ رسول نے انھیں اپنے دستخط میں نام کے بجائے "نبی مالک" لکھنے پر مجبور کیا۔

میں ایک تعلیمی اجلاس میں شرکت کی غرض سے بنگلور جانے سے پیشتر ملا تو انھوں نے اپنی تصویر دی اور کہا کہ "یہ قومی زبان کے لیے بھیج دیجئے۔ مضمون ضرور لکھیے۔ ہو سکے تو یتیم خانہ اطفال کی کتاب الرائے میں جو مولوی صاحب کی تحریر ہے اس کا فوٹو بھی بھیج دیجئے۔ مولوی صاحب نے یتیموں کے ناتے اچھی رائے لکھی ہے، ہاں تو میلادالنبی کے جلسے کے لیے میں نے تقریر لکھنی شروع کی ہے۔ ذرا ٹھہریئے۔

سیٹھ صاحب بڑے خوشخط تھے۔ میں نے کوئی چھ صفحات پڑھے اور تعریف کی۔ اس پر فرمایا "سلیم صاحب اس تقریر کو آپ مکمل کر دیجئے، شاید میں نہ کر سکوں گا۔"

"مگر سیٹھ صاحب، میں نے وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے کہا، انشاء اللہ بنگلور سے لوٹنے کے بعد آپ سے ملوں گا۔"

"کب تک آ رہے ہیں آپ؟" سیٹھ صاحب نے پوچھا۔

"ایک ہفتے میں لوٹ آؤں گا۔"

"مجھے جینا بھی تو ہے اس وقت تک، جلدی آ جائیے۔"

میں نے ان کی زبان سے پہلی بار کچھ مایوسی کی بات سنی تھی، یہ بات ... سفر میں بھی میرے دل میں بیٹھی رہی، تیرتی رہی، میں اپنے پروگرام کے مطابق میسور نہ آ سکا۔ کچھ اہم تعلیمی کام سرانجام دینے تھے۔ کوئی اجنبی قوت، میسور جلد سے جلد لوٹنے پر اکسا رہی تھی۔ آخر کام ادھورا چھوڑ کر رات کی ریل گاڑی سے نکلا۔ اس ریل گاڑی سے متعلق ایک لطیفہ ہے۔ یہ ریل شب کے دس بجے بنگلور اسٹیشن کو سلام کر کے آگے بڑھتی ہے اور صبح پانچ بجے میسور[1] پہنچتی ہے۔ ایک بوڑھے مسافر کے ہاتھ میں بچوں کا ٹکٹ تھا دیکھ کر گارڈ نے کہا آپ کو شرم آنی چاہئے کہ آپ نے بچوں کا ٹکٹ خرید رکھا ہے۔

بوڑھے نے نہایت متانت سے جمائی لیتے ہوئے کہا "حضور جب ریل میں سوار ہوا تھا تو بچہ ہی تھا۔"

نیند بھی چل دے گئی تھی، بظاہر سست رفتار وقت کٹا، گھر پہنچا۔ نماز پڑھی، پھر تکیے سے سر لگایا ہی چاہتا تھا کہ سیٹھ صاحب کے ایک عزیز محمود سیٹھ نے آواز دی، اور کہا "آپ کب آئے؟"

"ابھی" میں نے جواب دیا۔

"کل پرسوں سیٹھ صاحب نے آپ کو بہت یاد کیا"

"میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"آیئے۔ محمود سیٹھ نے کہا "صبح کی نماز کے بعد سیٹھ اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

---

[1] بنگلور اور میسور کا فاصلہ ۸۵ میل ہے۔

"مجھے جینا بھی تو ہے اس وقت تک" سیٹھ صاحب کے الفاظ گونجے۔

میں اُن کے بنگلے پر پہنچا تو ان کے چھوٹے بھائی ستار ابا سیٹھ ملے اور مجھے اندر لے گئے، شیر سو رہا تھا۔ چہرے پر سے کپڑا اٹھایا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ جیسے گلہ کر رہے ہوں کہ بہت دیر کردی مہرباں آتے آتے ـــ ان کی خاموشی میں بھی عجیب متانت، شان اور دبدبہ تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں سارے شہر کو اطلاع مل گئی، بلا تفریق مذہب و ملت لوگ آتے رہے۔ اچھا آدمی، نیک آدمی، بھلا اور بڑا آدمی کسی ایک قوم اور جماعت کا نہیں ہوتا۔ وہ کائنات کا ہوتا ہے وہ سب کا ہوتا ہے۔

حکومت کی طرف سے تعزیتی جلسہ ہوا، عوام نے اپنے جلسے کیے۔ سب کے ساتھ میں نے بھی تقریر کی۔ گُن گائے ـــ وہ سچا انسان کڑی بات سنتا اور کڑی بات سناتا، اس کے کسی لمحے قدم نہیں ڈگمگائے۔

محترم شاد زیبائی صاحب نے لفظ "اُف" سے ان کی عمر (۸۱ سال) کی تاریخ نکالی۔ محمد ابا سیٹھ، جن کی عظیم خواہش یہ تھی کہ وہ بغداد میں وصال فرمائیں، کیونکہ ان کے والد مرحوم وہیں آسودہ ہیں۔ میسور میں بروز دوشنبہ ۱۹ اپریل ۱۹۶۷ء کو انتقال فرمایا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ آپ کی تاریخ پیدائش بروز دوشنبہ ۱۹ اپریل ۱۸۸۶ء کی تھی۔

آپ کے وصال سے میسور کا ایک سنہرا عہد اور ایک تاریخ ختم ہوگئی۔ وہ قدیم و جدید تہذیب کا ایک بہترین نمونہ تھے۔

کرنل عطاء الرحیم - بابائے اُردو

پرنس کریم آغا خان - فخر ماتری مرحوم

مکتوبات



بنام سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

مولوی عبدالحق مرحوم مجھ پر بہت عنایت فرماتے تھے۔ ان کے متعدد خطوط میرے پاس تھے۔ ان میں بیشتر دوسرے مشاہیر کے خطوں کے ساتھ ایک حادثے میں تلف ہو گئے۔ تھوڑے سے خط جو باقی رہ گئے تھے، ان میں سے چند فرزند عزیز ڈاکٹر سیّد نیرّ مسعود رضوی نے رسالہ "نقوش" لاہور کے مکاتیب نمبر میں شائع کر دیئے۔ اب تلاش سے صرف دو خط اور ملے ہیں، جو اشاعت کی غرض سے بھیجے جا رہے ہیں۔

پہلا خط مولوی صاحب نے اپنے وطن ہاپوڑ سے اورنگ آباد جاتے ہوئے عجلت میں لکھا ہے۔ اس خط پر تاریخ تحریر ۱۱ر مارچ درج ہے سنہ نہیں ہے، لیکن ایک خط جو انجمن ترقی اُردو کے ایک کارکن زبیدالرحمان نے ۱۲ر اپریل ۱۹۲۷ء کو اورنگ آباد سے بھیجا تھا، اُس سے اس خط کا سن بھی معلوم ہو جاتا ہے یعنی ۱۹۲۷ء اور اس کے مندرجات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے اس لیے وہ خط بھی مولوی صاحب کے خط کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس خط میں آنریری سیکریٹری صاحب سے مراد مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔

ان دونوں خطوں میں میرے جس مضمون کا ذکر ہے وہ مولوی صاحب کی خواہش کے مطابق اپریل ۱۹۲۷ء کے رسالہ "اُردو" میں اندرسبھا اور شرح اندرسبھا" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

مولوی صاحب کا دوسرا خط ۱۴ر جنوری ۱۹۴۳ء کا ہے۔ اس میں مرحوم نے مجھ سے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کو مرتب کرنے کی فرمائش کی ہے۔ افسوس ہے کہ مجھے اس کام کے لیے فرصت نہ ملی اور مولوی صاحب کی یہ فرمائش اور خود میری ایک خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ایک مدت تک فرصت کا انتظار کرنے کے بعد میں نے تذکرے کے دونوں قلمی نسخے مولوی صاحب کو واپس کر دیئے۔ خط میں تذکرے کے جن تین نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایک وہ ہے جو غالباً کتب خانہ "مشرقی" پٹنہ کے نسخے سے نقل کیا گیا تھا، دوسرا وہ ہے جو میرے ذریعے انجمن ترقی اُردو کے لیے خریدا گیا تھا، تیسرا وہ ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دو قلمی نسخے جو واپس کر دیئے گئے تھے وہ انجمن ترقی اُردو کے کتب خانے میں موجود ہوں گے۔ مذکورۂ بالا تینوں خط ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

(۱)

ہاپوڑ، ۱۱ر مارچ

کرم گسترِ بندہ

آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ مارچ کے شروع میں آپ اپنا مضمون بھیج دیں گے۔ میں آج اورنگ آباد جا رہا ہوں۔ اگر آپ نے اب تک وہ مضمون نہ بھیجا ہو تو براہ کرم اب فوراً بھیج دیجئے۔ اپریل کا پرچہ چھپ رہا ہے اور آپ کے مضمون کا انتظار ہے۔ امید ہے کہ آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔

نیازمند عبدالحق

(۲)

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، دکن   ۲۱ اپریل سنہ ۱۹۲۷ء

مکرمی و مخدومی، تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۱۹ اپریل آج اس وقت ملا، جب کہ جناب آنریری سیکریٹری صاحب حیدرآباد تشریف لے جا رہے تھے، وہ چونکہ جلدی میں تھے اس لیے مجھ کو ہدایت کر گئے ہیں کہ آپ کو جواب لکھ دوں۔ رسالہ اپریل سنہ ۲۷ء بالکل تیار ہے۔ صرف جلد بندی باقی رہ گئی ہے لیکن آپ کے مضمون کی خاطر ایک مضمون چھپا ہوا روک دیا گیا ہے۔ یعنی وہ رسالۂ اپریل میں شامل نہ کیا جائے۔ آپ اپنا مضمون بواپسی ڈاک جناب آنریری سیکریٹری صاحب لکھ کر بھیج دیجئے تاکہ وہ ہمیں مل جائے اور ہم اس کو جلدی سے چھاپ کر رسالہ شائع کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ اس خط کے پہنچنے سے قبل مضمون روانہ بھی کر چکے ہوں۔

والسلام ۔   خاکسار فریدالرحمان

(۳)

انجمن ترقی اُردو (ہند) دریاگنج دہلی   مورخہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

مکرمی و معظمی، تسلیم

تذکرۂ خوش معرکہ زیبا، جو آپ کی معرفت خریدا گیا تھا ارسال خدمت ہے۔ اب آپ کے پاس تین تذکرے مکمل ہو گئے۔ براہ کرم اتنا بتا دیجئے کہ آپ کب تک مرتب کر کے عنایت فرما دیں گے تاکہ ہم اپنے مطبوعات کا پروگرام اسی کے مطابق ترتیب دے سکیں۔

نیازمند عبدالحق



مقبرۂ رابعہ دورانی کا وہ حصہ جہاں بابائے اُردو رہتے تھے ۔

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

بنام طالب کشمیری

پنڈت نند لال طالب کاشمیری کا پہلا مجموعہ منظومات "رشحات التخیل" کے نام سے ۱۹۸۰ بکرمی یعنی ۱۹۲۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔ اس کے صفحہ ۱۴۳ پر مولانا عبدالحق کا یہ خط شامل کتاب ہے۔ یہ خط مولانا عبدالحق نے طالب کاشمیری کو اُن کے مذکورہ مجموعہ کلام کے مطالعے کے بعد لکھا ہے یہ خط میں قومی زبان میں شائع ہونے کے لیے دے رہا ہوں کیونکہ مولانا عبدالحق کے مکتوبات کے جو چار مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں یہ خط اب تک شامل نہیں ہوا ہے۔

اورنگ آباد دکن — یکم نومبر ۱۹۲۵ء

کرم فرمائے بندہ زاد لطفہ،

تسلیم! آپ کا عنایت نامہ پہنچا اور اس سے قبل آپ کا مجموعۂ کلام پہنچا، اس حسن یاد آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، مگر اس کے دوسرے ہی روز مجھے سفر پر جانا پڑا اور ایک مدت تک باہر رہنا پڑا۔ اس وجہ سے نہ تو میں آپ کے کلام کا لطف حاصل کر سکا اور نہ جواب لکھ سکا، جس کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے اس امر کا افسوس ہے کہ پچھلی گرمیوں میں جب میں سری نگر میں تھا تو آپ سے ملاقات کا موقع نہ ملا اور نہ کسی نے میری رہنمائی کی۔ حضرت کیفی کی ملاقات کا مجھے بے حد شوق تھا مگر اس سے بھی محروم رہا کیونکہ وہاں تشریف نہ رکھتے تھے۔

میں نے جستہ جستہ آپ کا کلام دیکھا مجھے فی الحقیقت تعجب ہے کہ آپ نے وادیٔ کشمیر میں رہ کر اردو زبان پر ایسی قدرت کیوں کر حاصل کرلی آپ کی ذہانت اور فراست کی دلیل ہے، اس پر آپ کی نظر، آپ کا بیان قابل داد ہے، بیان میں صفائی اور گداز ہے اور یہ بڑی تعریف کی بات ہے۔

حضرت کیفی نے ایسا اچھا دیباچہ آپ کے کلام پر لکھا ہے کہ اس کے ہوتے مجھے قلم اٹھاتے ہوئے حجاب معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس میں شک نہیں، آپ کا کلام پڑھ کر مسرت ہوئی اور میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

اگر حضرت کیفی وہاں تشریف رکھتے ہوں تو میری طرف سے اُن کی خدمت بابرکت میں سلام نیاز پہنچا دیجئے گا۔

نیاز مند،
عبدالحق

بنام ڈاکٹر مظفر الدین قریشی

" قومی زبان کے بابائے اُردو نمبر بابت ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کے نام بابائے اُردو کے نو (۹) خط شائع کیے گئے تھے۔ اس مرتبہ مزید بیس (۲۰) خطوط شائع کیے جا رہے ہیں۔ آخری خط ڈاکٹر قریشی مرحوم کی بیگم صاحبہ کے نام ہے۔ (ادارہ)

۱۔ دریا گنج، دہلی
مورخہ ۵ر اگست، ۱۹۴۱ء

شفیق مکرم زاد لطفہ، تسلیم

عنایت نامہ پہنچا بہت ممنون فرمایا۔ میں نے اب پٹنے اور رانچی کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ کل یہاں سے حیدر آباد روانہ ہو جاؤں گا اور ۸ر اگست کی صبح کو آپ کے وطن مالوفہ کی سرحد میں پہنچ جاؤں گا۔

نیازمند عبدالحق

۱۔ دریا گنج، دہلی
مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۱ء

مشفقی و مکرمی، تسلیم

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا۔ جنوری کے وسط میں سی پی کے بعض مقامات کا دورہ عمارت فنڈ کے لیے کروں گا۔ اسی ذیل میں حیدر آباد کا بھی ایک دورہ ہو جائے گا۔

۱۔ عربک کالج کے لیکچرار سائنس قریشی صاحب ایک کتاب (CHEMISTRY TODAY) کا ترجمہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ آپ نے کتاب نہ دیکھی ہو تو بھیج دوں یا وہیں مل جائے تو دیکھ لیجیے۔

۲۔ قاضی صاحب نے اڑھائی سو روپے عمارت فنڈ میں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مہربانی فرما کر انھیں یاد دلائیے سے کہ بھیج ہی دیجئے۔

۳۔ خلیفہ عبدالحکیم انجمن کے لیے "داستان دانش" لکھ رہے ہیں ایک حصہ لکھ بھی چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے کہا تھا کہ تقاضا کرتے رہنا۔ میں نے یاد دہانی کا خط لکھا تھا جواب نہیں دیا۔ آپ تقاضا کر دیں۔ کم سے کم یہ معلوم ہو جائے کہ کب تک مکمل کر کے دیں گے۔ ہمیں ۳۲ء کا پروگرام مرتب کر کے یونیورسٹی کو بھیجنا ہے۔

انشاء اللہ اس ہفتے زمین مل جائے گی اس کے لیے مجھے بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑی لیکن ملے گی اسی وقت جب گورنمنٹ کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ انجمن کے پاس عمارت کے لیے کافی روپیہ ہے۔ اس لیے اب مجھے روپیہ فراہم کرنے کے لیے دَورے پر نکلنا ہوگا۔ کام کا بار روز بروز بڑھتا جاتا ہے اب مجھے راتوں کو اٹھ اٹھ کے کام کرنا پڑتا ہے۔

پروفیسر شیرانی کو بھی میں انجمن میں کھینچ لایا ہوں۔ کبھی کبھی اس دُور افتادہ کو اپنی خیریت سے اطلاع دیتے رہنے کہ تعلق خاطر رہتا ہے۔

نیاز مند عبدالحق

رانچی۔ چھوٹا ناگپور

میرے شفیق و رفیق خدا آپ کو خوش و خرم اور کامیاب رکھے۔ آپ کا عنایت نامہ مجھے کل یہاں ملا۔ یہ آوارہ گوشت اردو ہم مارچ کا گھر سے نکلا ہوا آج رانچی پہنچا۔ ۷ مارچ کو شمالی بنگال کے ضلع دیناج پور میں اُردو کانفرنس تھی۔ توقع سے زیادہ کامیاب رہی۔ دیناج پور سے ٹھاکر گاؤں بگوں باڑی، کشن گنج ہوتا ہوا کلکتے پہنچا۔ وہاں سے جمشید پور (ٹاٹا نگر) گیا۔ جمشید پور سے کل یہاں وارد ہوا۔ یہاں کے مدرسوں کا معائنہ کر رہا ہوں۔ پرسوں یہاں سے گیا، گیا سے پٹنے اور پٹنے سے ۲۱ کی شب کو دہلی پہنچ جاؤں گا۔ ۲۲ مارچ کو انجمن کے دفتر میں اصلاح رسم خط کی مجلس منعقد ہوگی۔ میں نے آپ کا خط پڑھا۔ نہایت ضروری اور کام کے مشورے ہیں۔ میں نے یہ خط بہت غور سے پڑھا اور دو بار پڑھا۔ مجھے حرف حرف سے اتفاق ہے۔ انشاء اللہ دہلی واپس پہنچ کر عمل شروع کروں گا اور اپنی رائے سے مفصل اطلاع دوں گا۔

مسز قریشی اور بچے آپ سے زیادہ عقلمند معلوم ہوتے ہیں کہ ۲۵ کو وہاں سے چل دیں گے۔ میں ۲۷ مارچ کو صبح ریلوے اسٹیشن پر ان کا انتظار کروں گا۔ وہ دن بھر میرے ہاں رہیں گے اور شام کی گاڑی سے امرتسر چلے جائیں گے۔

۲۷ کی شام کو میں بھی الہ آباد جانے والا ہوں۔ ۲۸ کو "نئی" ہندوستانی اکاڈمی کا پہلا جلسہ ہے۔ بچوں کو بہت بہت دعا اور پیار۔

مسز قریشی کو سلام اور دُعا پہنچے۔۔ نیاز مند۔ عبدالحق

۱۔ دریا گنج دہلی ۔ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۴۳ء ، شفیق زاد لطفہٗ ، تسلیم

گرانڈ ٹرنک ایکسپرس کی وضعداری میں فرق نہیں آیا۔ فون سے دریافت کیا معلوم ہوا ۱۰ بجے آئے گی۔ تھوڑی دیر بعد پوچھا تو کہا ۱۱ بجے۔

میں ساڑھے دس بجے ہی پہنچ گیا۔ ٹھیک ۱۲ بجے بڑے ناز و غمزے سے تشریف لائیں۔ مسز قریشی اور بچے سب خیر و عافیت سے پہنچ گئے۔ اس وقت چائے پی رہے ہیں اور سٹر یہ قریشی تماشے کر رہا ہے۔ آپ کا خط دیر میں پہنچا۔ نشستیں محفوظ نہیں ہوئیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کسی ترکیب سے ان کو جگہ مل جائے۔ وعدہ تو کر لیا ہے منہ میٹھا کرنا پڑے گا۔

میں آج شب کی گاڑی سے الہ آباد جا رہا ہوں۔ ۳۱ مارچ یا یکم اپریل تک واپس آجاؤں گا۔ ممکن ہوا تو ۳۰ ربی کو ۔ ۴ اپریل کو ایک روز کے لیے میرٹھ جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ کے آنے کا انتظار کروں گا۔ ہمیوں خاں اچھے رہے۔ یزدانی کے جانشین ایسے! اب تو ایسے ہی انتخاب ہوتے ہیں۔ آپ جلدی آئیے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق ڈاکٹر ضیاء الدین سے گفتگو ہوئی وہ بالکل رضامند ہیں۔ اگر شروانی صاحب علیگڑھ میں ہوں تو الہ آباد سے واپسی میں ایک دن کے لیے ٹھہر جاؤں گا اور ان سے بھی گفتگو کروں گا۔ فقط والسلام

نیازمند عبدالحق

۱۰- دریا گنج دہلی
مورخہ ۴ اگست ۱۹۴۳ء

شفیقی و محبی، تسلیم

امید ہے کہ آپ اور غلام محمد صاحب بمبئی سے واپس آگئے ہوں گے۔ براہ کرم کسی فرصت کے وقت یاد دہانی کر دیجئے گا کہ انجمن کا مفاد راست بینک سے ہو جائے۔ جو شورش حیدرآباد ٹریڈ ٹیکس کے بارے میں مجھے ہوئی تھی۔ وہ غالباً اب دھیمی پڑ گئی ہوگی۔

اب تو جناب قاضی صاحب اور ان کے ساتھ آپ جامعہ کی جوبلی کے انتظامات میں مصروف ہوں گے۔

دو چار روز سے نباتیات کی ایک کتاب کے پروف دیکھ رہا ہوں۔ یہ آپ کے پروفیسر نباتیات کی تصنیف لطیف ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے سخت افسوس اور رنج ہوا۔ اگر کہیں یہ کتاب اس سے پہلے میرے مطالعے میں آئی ہوتی تو یا تو میں اسے پھاڑ کر پھینک دیتا یا پھر از سر نو خود لکھتا۔ ایک طالب علم بھی لکھتا تو اس سے بہتر لکھتا۔ یہ کیسے پروفیسر ہیں جنھیں اپنے فن سے بھی واقفیت نہیں۔ "جال گونا" کو "جال گنا" پیلو کو درخت مسواک "بادرنج" کو "بدرنج یا بدرنگ" "ثعلب مصری" کو "شعاب مصری" "کاکنج" کو "ککناج" "رائی" کو "زرد سرسوں" وغیرہ وغیرہ تحریر کیا ہے۔

یہ تو ان کے اپنے فن کا حال ہے اور عبارت کی یہ کیفیت ہے کہ ایک سطر بھی صحیح نہیں۔ اپنا مفہوم ادا کرنے سے بالکل قاصر۔ لکھنے کا مطلق سلیقہ نہیں۔ املا، انشا سب غلط۔ ذریعہ تعلیم اُردو ہونے پر یہ حال ہے۔ کئی جگہ لکھا ہے کہ یہ ہندوستان کا عام درخت ہے اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں پایا جاتا ہے۔ اور نام لیٹن یا انگریزی تحریر فرمایا ہے۔ اپنا نام معلوم نہیں۔ انگریزی کتابوں سے نقل کرتے ہیں اور نقل کرنا بھی نہیں آتا۔ "بادرنج" کو "بدرنج" اور "کاکنج" کو "ککناج" وغیرہ کیوں لکھا۔ اس لیے کہ انگریزی میں زبر اور الف دونوں کے لیے "A" لکھا جاتا ہے۔ اب جو چاہے پڑھ لیجئے۔ سید ہاشمی نے عبارت کی بابت کچھ اصلاح کی مگر اب بھی قابل اطمینان نہیں۔ اور اکثر مقامات مبہم ہیں۔

اور مفہوم بری طرح ادا کیا گیا ہے۔ خدا رحم کرے۔

مسز قریشی اور بچوں کو بلا لیجیے۔ لاہور امرتسر کا موسم بہت خراب ہے۔ مسعود احمد خاں لاہور سے آئے تھے۔ پناہ مانگتے تھے اور دلی کو اس کے مقابلے میں جنت کہتے تھے۔　　نیازمند　عبدالحق

انجمن ترقی اُردو (ہند)

ٹیلیفون ۶۲۹۰

اورنگ آباد، مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۴۳ء

شفیقی و محبی زاد لطفہ التسلیم

میں ۵ ستمبر کی شام کو بخیر و عافیت اورنگ آباد پہنچ گیا۔ اب بالکل اچھا ہوں، کسی قدر نقاہت باقی ہے۔ ۲۰ یا ۲۱ ستمبر کو صرف چند روز کے لیے حیدرآباد آؤں گا۔ اس وقت انشاء اللہ آپ سے ملاقات ہوگی۔ اپنی خیریت اور دیگر حالات سے ضرور اطلاع دیجیے۔ مسز قریشی اور بچوں کو بہت بہت دعا اور سلام۔　　عبدالحق

۱- دریا گنج، دہلی

مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۳ء

شفیقی و محبی التسلیم

اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ آج شبر کے ہاتھ آپ کا اشفاق نامہ پہنچا۔ میں اب بالکل اچھا ہوں۔ کسی قدر نقاہت باقی ہے۔ آج کل یہاں کا موسم بے مثل ہے۔ کشمیر کا لطف آرہا ہے۔ کاش ایک دو روز کے لیے آپ یہاں آجاتے۔ کشمیر کو بھول جاتے۔ میں ۲۰ کی شام کو روانہ ہو کر ۲۱ کی صبح کو حیدرآباد پہنچوں گا۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ آپ کے پاس ٹھہروں۔ منظور جنگ سے اجازت لے لیجیے۔ ۲۲ ستمبر کو انجمن کی مجلس نظما (گورننگ باڈی) کا جلسہ ہے۔ عید کے دوسرے روز چلا جاؤں گا۔ نینی تال میں آل انڈیا یورپین و اینگلو انڈین مدارس کی میٹنگ ہے۔ اس میں ان کے مدارس میں اُردو تعلیم اور اُردو کتب درسیہ وغیرہ کے متعلق فیصلہ ہوگا۔ اس میں میری شرکت لازمی ہے۔ اس غرض سے انھوں نے مجھے اپنی سوسائٹی کا ممبر بنا لیا ہے۔

خیر طلب

مسز قریشی اور بچوں کو سلام اور دعا۔　　عبدالحق

آپ کا خط دہلی سے بھی آج اس وقت ملا۔

۱- دریا گنج، دہلی، مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۳ء۔　　شفیقی و مکرمی التسلیم

آپ کا خط ابھی ملا۔ میں نے پہلے لکھا تھا کہ انجمن کی مجلس نظما کا جلسہ ۲۲ ستمبر کو ہوگا اور میں ۲۰ کو یہاں سے روانہ ہوں گا، لیکن

نواب صاحب چھتاری کی خواہش پر جلسہ ۲۰ ستمبر کو قرار پایا ہے۔ اس لیے اب میں پرسوں یعنی ۱۹ کو روانہ ہو کر ۲۰ کی صبح حیدرآباد پہنچوں گا۔
اس وقت میں ویجاپور جا رہا ہوں۔ احباب ویجاپور عمارت فنڈ کے لیے کچھ رقم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ شام تک واپس آجاؤں گا۔
باقی سب خیریت ہے۔ نیازمند عبدالحق

مدراس،

مورخہ ۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء

شفیقی و مکرمی زاد لطفہ، تسلیم

میں کل شب مدراس پہنچ گیا۔ کل شب کالی کٹ روانہ ہو جاؤں گا۔ ۶، ۷ نومبر کو کانفرنس رہے گی۔ اگر ضرورت ہوئی تو وہاں کے چند مقامات کا دورہ کر لیا جائے گا۔ اس میں دو روز سے زیادہ صرف نہ ہوں گے۔ واپسی پر ممکن ہے کہ دو ایک روز اور مدراس میں ٹھہرنا پڑے۔ غالباً ۱۳ تک حیدرآباد پہنچ جاؤں گا۔ میں نے منظور جنگ کو لکھ دیا ہے کہ جس روز میں حیدرآباد پہنچنے کی اطلاع دوں آپ کو اور تقی کو شب کے کھانے پر بلا لیں تاکہ آپ سے مفصل گفتگو کر سکوں کیونکہ وہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔ جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس لیے آپ مہربانی سے ضرور تشریف لے آئیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ غلام محمد صاحب کی طبیعت علیل ہو گئی ہے۔ اُمید ہے اب اچھے ہوں گے۔

مسز قریشی اور بچوں کو سلام اور دعا۔ نیازمند، عبدالحق

۱- دریاگنج، دہلی

مورخہ ۶ اکتوبر ۱۹۴۳ء

قریشی صاحب آپ مجھے کچھ انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ انگریز ان معنوں میں نہیں جو ہم ہندوستانی سمجھتے ہیں۔ سیاسی حالات نے اسے ہماری نظروں میں بہت ہی مکروہ بنا دیا ہے ورنہ انفرادی طور پر انگریز کا کیرکٹر بہت قابل قدر ہے۔ اس میں بعض ایسی خوبیاں ہیں، جو دوسری قوموں میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کا دھیما پن، صبر و استقلال حصول مقصد میں یکسوئی، فرض شناسی، کام کی دھن۔ قوم پرستی وغیرہ عجیب خوبیاں ہیں۔ رُوپے کی خاطر اپنی قوم کو بیچتا ہے اور نہ اپنے فن یا خاص کام کو چھوڑتا۔ آیچ سی ایس کی طرح جست لگا کر چوٹی پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے لیے یا اپنے کسی عزیز یا دوست کے لیے کچھ کہتے ہوئے بہت جھجکتا ہے۔ اور کہتا بھی ہے تو نہایت نرم الفاظ میں، اور دبی زبان سے تاکہ مخاطب انکار بھی کر دے تو تلخی نہ آنے پائے۔

اس مرتبہ انجمن کی امداد ملنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی ہے۔ میں نے بعض چیزوں کو (جنھیں میں بہت عزیز رکھتا تھا) بیچ کر کام چلایا ہے یہ نہیں کہ خدانخواستہ انجمن دوالیا ہے۔ اس کے پاس خدا کے فضل سے اچھی خاصی رقم جمع ہے۔ اس رقم کو میں ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔ میں مرنے سے پہلے کم سے کم دس لاکھ روپے انجمن کے سرمایئے میں جمع کر دینا چاہتا ہوں۔ میں غلام محمد صاحب سے اس لیے نہیں کہتا۔ کہ،

اُنھوں نے اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اب ان سے کچھ کہتے ہوئے حجاب معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس لیے نہیں کہتے کہ یہ ایک چھوٹی بات ہے اس لیے انھیں تکلیف دینا مناسب نہیں۔ پھر آپ انجمن کے سچے ہمدرد اور میرے دوست (بلکہ دوست سے بڑھ کر) ہیں اس لیے آپ کو بھی حجاب معلوم ہوتا ہے تیسرا کوئی نظر نہیں آتا جو اس مکردہ کام کو انجام دے۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ کیا کیا جائے۔ میں حیدرآباد سے دلی تک برابر سوچتا آیا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس لیے آپ کو لکھتا ہوں شاید آپ وہاں پہنچ جائیں جہاں میں نہ پہنچ سکا۔

مسز قریشی اور بچوں کو سلام اور دعا۔ خیر طلب عبدالحق

۱- دریا گنج، دلی

مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۴۳ء

ڈاکٹر صاحب یہ کیا بات ہے آپ نے خطوں کا جواب نہیں دیا۔ آپ کی مصروفیت مسلّم لیکن اپنی خیر و عافیت سے تو اطلاع دیتے۔ اتنے دنوں سے جو خط نہیں آیا تو تشویش ہے۔ آپ نے خط لکھنے میں کبھی اتنی دیر نہیں کی۔ آخر یہ ہوا کیا۔ اب دو تین کام کی باتیں لکھتا ہوں ان کا جواب ضرور عنایت فرمائیے۔

۱۔ انجمن کی رقم اب تک وصول نہیں ہوئی جس کی وجہ سے سخت تکلیف ہے اور کام میں ہرج واقع ہو رہا ہے۔ چند روز ہوئے اکزامینر اکونٹس کو تار دیا تو جواب آیا کہ فنانس کے فیصلے کا انتظار ہے۔ یہ انتظار کب تک۔ مہربانی کر کے اس گتھی کو سلجھائیے۔

۲۔ سائنس کمیٹی نے کتابوں کی تالیف کی جو تجویز کی تھی اس کا کیا حشر ہوا۔ ان صاحبوں کو اطلاع دی گئی جن کے نام تجویز کیے گئے تھے اور ان کے کیا جواب آئے۔ یہ کام فوراً شروع ہو جانا چاہیے۔

۳۔ تیسری ضروری بات یہ ہے کہ انجمن کی تیسری آل انڈیا اُردو کانفرنس ناگپور میں ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء کو ہونے والی ہے اس کے لیے اعلیٰ پیمانے پر انتظام کیے گئے ہیں۔ بہت بڑا اجتماع ہونے والا ہے اور بہت اہم تجاویز پیش ہونے والی ہیں۔ اس میں آپ کی شرکت لازمی ہے۔ کیسی ہی مصروفیت ہو آپ کو آنا پڑے گا۔ مجھے امید ہے آپ میری اس درخواست کو رد نہ کریں گے۔

علاوہ اس کے آپ سے بعض نہایت ضروری باتیں کہنی ہیں۔ یہ اجلاس خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کو ضرور آنا چاہیے۔ ابھی سے اس کا تہیہ کر لیجیے۔

بچوں کو دعا اور مسز قریشی کو سلام نیازمند عبدالحق

۱- دریا گنج، دلی۔ مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء

جناب سفری پروفیسر صاحب۔ اب یہی نام آپ کے لیے موزوں ہے۔ اگر میری بجائے یہ خط شریر جاوید لکھتا تو آپ کو گھن چکر پروفیسر کہتا۔ غلام محمد صاحب سے کہیے کہ وہ آپ کے لیے چھتاری سے کہہ کر سفر یار جنگ کا خطاب دلوا دیں۔

امید ہے اب آپ بنگلور سے واپس آگئے ہوں گے۔ مہربانی کر کے آپ سٹار صاحب سے ہمارے کاغذ کے لیے اجازت نامہ (پرمٹ) دلوا دیجئے۔ کاغذ شبر کی تحویل میں ہے۔ اس کے متعلق کوئی امر دریافت کرنا ہو تو شبر سے دریافت کر لیجئے گا۔

سائنس کی کتابوں کی تالیف کا کام ہو رہا ہے یا نہیں۔ ذرا خبر لیتے رہیے۔ ہمارے لوگ بڑے سُست اور کام چور ہوتے ہیں۔ ہم سب ایسے ہی ہیں۔ بار بار کہنے اور جتانے کی ضرورت ہے۔

سُنا ہے کہ علی یاور جنگ بہادر بھوپال کے وزیر اعظم ہو رہے ہیں کہاں تک صحیح ہے۔

مسز قریشی اور بچوں کو بہت بہت دعا اور سلام۔ دلّی کب آیئے گا؟

نیاز مند عبدالحق

۱- دریا گنج، دہلی

مورخہ ۲۳ جون ۱۹۴۴ء

شفیقی زاد لطفہٗ، تسلیم

آپ کا خط بہت انتظار کے بعد ابھی ملا۔ میں انشاء اللہ اُردو کانفرنس کے اجلاس سے دو تین روز قبل حیدر آباد پہنچ جاؤں گا۔ نئے ارکان کو اطلاع نہ دینے کے متعلق مجھے غلط فہمی ہوئی۔ تار کے الفاظ سے ایسا خیال ہوا تھا مگر وہ پڑھنے کی غلطی تھی۔ تقی الدین آپ سے ملے ہوں گے اور انھوں نے سب کیفیت بیان کی ہوگی۔ وہ شخص کس قدر خبیث ہے۔ یہ خبر بہت بری سُنائی کہ آپ کی صحت اچھی نہیں یاد رکھیے صحت سب سے مقدم ہے۔ باقی سب چیزیں ہیچ ہیں۔ کچھ دنوں آرام کیجئے۔ منظور جنگ کل آئے اور کل ہی مصوری چلے گئے۔ وہاں انھوں نے کوئی مکان خریدا ہے۔ اس کی کارروائی کے لیے وہاں گئے ہیں۔

مسز قریشی اور بچوں کو (خاص کر شیطان بچے) کو دعا اور سلام۔

نیاز مند عبدالحق

۱- دریا گنج، دہلی

مورخہ ۸ جولائی ۱۹۴۴ء

شفیقی و مکرمی زاد لطفہٗ تسلیم

آپ کا خط پہنچا جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی لیکن اس کا افسوس ہے کہ ابھی تک آپ کی طبیعت بحال نہیں ہوئی حیدر آباد میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سُنا ہے کہ سید صدر شعبہ کیمیا، الیاس برنی رجسٹرار ہو گئے ہیں اور نظامت دارالترجمہ کے امیدوار وہی دونوں بزرگ ہیں جن کی لڑائی اب تک جاری ہے۔ کیا نظامت تعلیمات پر جانے کے بعد بھی قاضی صاحب صدر شعبہ اُردو رہیں گے۔ سُنا ہے قاضی صاحب نے دو مہینے کی رخصت لے لی ہے۔ مجھے تو ان کی حالت پر بہت رحم آتا ہے

کیا عجب بات ہے کہ اقبال کا شیطان آپ کے ہاں پیدا ہوا ہے۔ اسے میری طرف سے بہت بہت دعا اور پیار کیجئے۔ مسز قریشی

اور دوسرے معمولی بچوں کو سلام و دعا۔ عبدالحق

میں ۱۶ر جولائی کو روانہ ہو کر ۱۸ کو حیدرآباد پہنچوں گا۔ اور آپ ہی کے ہاں ٹھہروں گا۔ عبدالحق

۱۔ دریا گنج، دہلی

مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۴۵ء

شفیق و محبی! تسلیم

آپ کا خط پہنچا۔ آپ کی خیر و عافیت اور مصروفیت کا حال پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔

آج غلاموں کا قافلہ نکلے جا رہا ہے۔ گاندھی نے جیسی کہ اس کی عادت ہے عین وقت پر ایسا اڑنگا لگایا ہے کہ اگر وہ اس پر اڑا رہا تو ساری امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ یہ پہلی بار نہیں اس نے ہر بار جب کبھی ایسا موقع آیا کوئی نہ کوئی ایسی ہی حرکت کی۔ بقول سر تیج بہادر سپرو کے کہ اس شخص نے ہر موقع پر جب کہ معاملہ روبہ اصلاح ہو چلا تھا سارا کھیل بگاڑ دیا۔ یہی راونڈ ٹیبل کانفرنس میں کیا اور یہی اب۔ اس کی بحث بالکل غیر متعلق اور ناواجب ہے۔ یہ لفظی اور ملایانہ بحث ہے۔ میں نے اس شخص کے متعلق بہت غور کیا ہے۔ میری رائے میں وہ سخت رجعت پسند یعنی Reactionary ہے۔ وہ ہندوستان کو ویدک زمانے میں لے جانا چاہتا ہے۔ اور چرخے کے زور پر اور نان وائلنس (Non. Violence) کے ذریعے آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس مرتبہ اس کی حکمت نہیں چلے گی۔ اگر کوئی صورت مصالحت کی نہ پیدا ہوئی تو اہل ہند کی اس سے بڑی کوئی بدنصیبی نہ ہوگی۔ انگریز اس وقت وہ کچھ پیش کر رہا ہے جس کی اس سے کبھی توقع نہ تھی ہندو مسلمان اب بھی یوں ہی لڑتے رہے تو انھیں کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی۔ اور ہمیشہ غلام رہیں گے۔ افسوس تعمیری کام کا ہماری قوم میں نہ کسی کو تجربہ ہے اور نہ خیال۔ جب غیر تعمیری کاموں کی الجھنوں کو نہیں سلجھا سکتے تو تعمیری کام کیا کریں گے۔

ابھی آپ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیجیے۔ یہاں آکر حیدرآباد کا رنگ دیکھیے اس کے بعد سوچیں گے کہ کیا کیا جائے۔ بظاہر حیدرآباد میں کوئی امید نہیں۔ آپ کی محنت اور کارگزاری کا کوئی قدر کرنے والا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر آپ کو دلّی ہی آنا پڑے گا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ مجھ سے زیادہ کسی کو خوشی نہ ہوگی۔

نواب چھتاری کو سالگرہ کے موقع پر سعید الملک کا خطاب عطا ہوا ہے۔ بہت خوش ہیں۔

زاہد حسین صاحب ابھی حیدرآباد نہیں گئے۔ غالباً اس مہینے کے آخر میں جائیں۔

باقی حالات بدستور۔ آپ کے بیوی بچے ابھی حیدرآباد ہی میں ہیں۔ معلوم نہیں امرتسر کب جائیں گے۔

۱۵ر جولائی کے بعد اورنگ آباد جانے کا ارادہ ہے۔ اور اگست اور ستمبر کے مہینے وہیں بسر کروں گا کیونکہ یہ مہینے دلی میں بہت خراب اور غلیظ ہوتے ہیں۔

ہاشمی بعد سلام شوق کہتے ہیں کہ ایک دن رات ہی میں روزانہ بہت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مگر کہتے ہیں کہ سورج اپنا حال اور

اپنی چال ہزاروں سال میں بھی نہیں بدلتا۔ خیر طلب عبدالحق

دریا گنج، دہلی

مورخہ ۱۰ر فروری ۱۹۴۵ء

شفیقی و مکرمی زاد لطفہٗ، تسلیم

آپ کا خط پہنچا۔ اس سے قبل بھی آپ کا خط آیا تھا کیا میں نے اپنا پروگرام آپ کو نہیں لکھا۔ اب سنیے یہاں سے ۱۹ر فروری کی شب کو پشاور ایکسپریس سے بمبئی روانہ ہوں گا۔ وہاں ۲۳ر ۲۴ر ۲۵ فروری کو اُردو کانفرنس ہے۔ ادھر گاندھی جی وردھا میں ہندستانی پر چار کانفرنس کر رہے ہیں۔ ان کے دو خط میرے پاس آچکے ہیں۔ ان کا بہت اصرار ہے کہ اس میں شریک ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ اس کی تاریخیں بھی ۲۴، ۲۵ ہیں۔ چند روز ہوئے انھوں نے پنڈت سندرلال اور ڈاکٹر تاراچند کو بھیجا۔ وہ دو روز تک میرے مکان پر دھرنا دیئے بیٹھے رہے۔ آخر مُروت میں آکر میں نے شریک ہونا قبول کرلیا۔ لیکن میرا عذر یہ تھا کہ ایک ہی تاریخوں میں دو جگہ کیسے شریک ہو سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس کی تاریخیں ۲۵، ۲۶ کرادیں گے تم ۲۶ کو آجانا۔ تو بمبئی سے ۲۵ر کی شام کو روانہ ہوکر ۲۶ کی صبح وردھا پہنچوں گا۔ اگر اسی شام کو گرانڈ ٹرنک میں جگہ مل گئی تو خیر ورنہ ۲۷ر کی صبح کو پسنجر سے آنا پڑے گا۔ اب میں ٹھیک تاریخ کیسے بتاؤں۔ یا تو ۲۷ر کی صبح کو ورنہ ۲۸ کی صبح کو ضرور پہنچ جاؤں گا۔ اور آپ ہی کے ہاں ٹھہروں گا۔ وہاں ۳ر مارچ کو یوم حالی ہے۔ اس میں شریک ہوں گا۔ ۹ر مارچ کو شہر کے کسی کتب خانے کا سالانہ جلسہ ہے اس میں شرکت کرکے اسی روز ½۴ بجے سہ پہر کو احمد نگر چلا جاؤں گا وہاں اُردو کانفرنس ہے۔ وہاں سے فارغ ہوکر واپس دہلی۔ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ یوم حالی سے فارغ ہوکر اسی روز احمد نگر چلا جاؤں مگر شبر نے بہت تقاضا کیا مجبوراً ٹھہرنا پڑے گا ورنہ حیدرآباد کا قیام اب مجھے سخت ناگوار گزرتا ہے اور غلام محمد صاحب کے جانے کے بعد ہرگز دل گوارا نہیں کرتا کہ ایک منٹ بھی وہاں ٹھہروں۔

عبدالحق

۱۔ دریا گنج، دہلی

مورخہ ۱۴ر فروری ۱۹۴۵ء

مشفقی و مکرمی زاد لطفہٗ، تسلیم

گاندھی جی کی اطلاع آگئی کہ انھوں نے میری خاطر اپنی کانفرنس کی تاریخیں بدل کر ۲۶، ۲۷ فروری کردی ہیں۔ اگر وردھا میں ۲۷ر کی شام کو گرانڈ ٹرنک میں جگہ مل گئی تو زہے قسمت ورنہ ۲۸ر فروری کی صبح کو پسنجر سے روانہ ہوکر یکم مارچ کی صبح کو حیدرآباد پہنچ جاؤں گا۔ سنا ہے کہ محمد اعظم صدرالمہام ہوگئے۔ علی یار خاں وائس چانسلر اور اشفاق ہوم سیکریٹری ہونے والے ہیں۔ خیر مارا چہ ازیں قصہ۔

اب ملاقات پر آپ سے باتیں ہوں گی۔ عبدالحق

۱- دریا گنج ، دہلی

مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۴۶ء

شفیق مکرم زاد لطفہ ، تسلیم

اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں ۔ امید ہے پہنچا ہوگا ۔ میں چلتے وقت عمارت کا نقشہ تقی الدین صاحب کو دے آیا کہ وہ آپ کو دے دیں ۔ غالباً انھوں نے پہنچا دیا ہوگا ۔ مہربانی کر کے اس کی نقل جہاں تک جلد ممکن ہو کرا دیجیے ۔ باقی نقشے وہاں موجود ہیں ۔ جب نقل ہو جائے تو شبر سے کہہ کر سب نقشوں کا البم بنوا لیجئے تاکہ عرضداشت کے ساتھ پیش کر دیئے جائیں ۔ یہ کام بہت جلد ہونا چاہیے ۔ سر مرزا اسمٰعیل آپ کے ہیں معاملہ تازہ تازہ ہے ایسے وقت میں یہ عرضداشت پیش ہوگئی تو سر مرزا کو اس کے مسترد کرنے میں تامل ہوگا ۔ اس قسم کی یہ پہلی درخواست ہوگی اور شروع ہی میں ایک ایسی درخواست نامنظور کرنا مناسب خیال نہ کریں گے ۔ تقی الدین صاحب کو بھی آج خط لکھا ہے کہ وہ سب نقشوں کا البم اور عرضداشت (جو ان کے پاس ہے) خود لے جا کر نواب کاظم یار جنگ بہادر کے حوالے کر دیں ۔

میں جانتا ہوں آپ بے حد مصروف ہیں اس لیے بار بار زحمت دیتے ہوئے مجھے شرم معلوم ہوتی ہے مگر کیا کروں آپ دو تین صاحبوں کے سوا میرا وہاں کوئی ہمدرد نہیں البتہ مخالفوں کے پرے کے پرے جمع ہیں ۔

پچھلے خط میں انگریزی اردو ڈکشنری کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے متعلق لکھا تھا ۔ معلوم نہیں آپ کو زاہد حسین صاحب سے گفتگو کا موقع ملا یا نہیں ۔ اخباروں میں نواب زاہد جنگ لکھا ہوتا ہے کیا انھیں خطاب مل گیا ؟ یہ کب ؟

مسز قریشی اور بچوں کو بہت بہت دعا ۔ نیازمند عبدالحق

۱- دریا گنج ، دہلی

مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۶ء

شفیقی و مکرمی ، تسلیم

آپ کا خط پہنچا ۔ آپ حیدرآباد میں ہیں مگر حالات سے بے خبر ۔ آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ مرزا صاحب نے انجمن کے متعلق نوٹ لکھ کر باب حکومت میں بھیج دیا ہے ۔ عجیب و غریب نوٹ ہے ۔ قابل دید ہے ۔ غرض وہ انجمن کو ختم کر دینا چاہتے ہیں ۔ اسی طرح انھوں نے مسلم یونیورسٹی پر بھی تحقیقاتی کمیٹی بٹھانے کا حکم دیا ہے ۔ آپ اب زاہد حسین صاحب سے مل کر دیکھیے کہ کیا کیا جاتا ہے ۔ ابھی تک کوئی سرکاری اطلاع انجمن کو وصول نہیں ہوئی ۔ یہ اطلاع مجھے نج کے طور پر معلوم ہوئی مگر بالکل صحیح ہے ۔ میں نے شبر کو لکھا ہے کہ وہ آپ سے مل کر پوری کیفیت بیان کر دے ۔ اگر وہ اب تک آپ کے پاس نہ آئے ہوں تو مہربانی کر کے انھیں بلا کر دریافت کیجیے ۔ معاملہ اہم ہو گیا ہے اور اس کی وجہ سے مجھے بہت پریشانی ہے ۔ تاہم میں دوسری تدبیروں سے غافل نہیں ہوں ۔ جس پلیننگ بورڈ کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کی تجویز لیگ کی شرکت سے بہت قبل ہو گئی تھی ۔

کان پور کی کانفرنس کامیاب رہی - حافظ محمد صدیق صاحب نے انجمن کو ۲۵ ہزار عنایت فرمائے ۔ وہ اُردو یونیورسٹی کے لیے بھی تیار ہیں۔ فی الحال تو مجھے انجمن کی پڑی ہے - عمر کے ان آخری ایام میں مجھے بھیک مانگنے کے لیے نکلنا پڑے گا ۔ مرزا بہت کینہ پرور شخص ہے وہ ضرور انجمن کو نقصان پہنچائے گا اور ہماری امداد بند کر کے رہے گا ۔ اس کا نوٹ دیکھ کر آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ شخص جو بڑا مدبر مشہور ہے ایسا خفیف الحرکات ہے اور ایسی ہی باتیں لکھتا ہے جو قابل مضحکہ ہیں ۔ جواب کا انتظار رہے گا ۔

نیازمند عبدالحق

اسپتال روڈ کراچی - ۱

مورخہ یکم مارچ ۱۹۵۲ء

مکرمہ بیگم صاحبہ سلمہا ، آپ کا دعوت نامہ عقد عزیزی عزلیفہ بانو سلمہا پہنچا جس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ تقریب مبارک کرے ۔ اور دولہا دلہن دونوں محبت اور خوش حالی سے زندگی بسر کریں۔ اور آپ کے لیے اور سارے خاندان کے لیے موجب شادمانی و خوشی ہوں ۔

خیر طلب ، عبدالحق



باباے اردو، مرحوم امیر بہاولپور کے ساتھ

ابو سلمان شاہجہانپوری

بنام محمّد اجمل خاں

محمد اجمل خاں صاحب کے نام بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے چند خطوط پیش کیے جا رہے ہیں۔ مکتوب الیہ علمی حلقے میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ موصوف متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو کے علمی جریدے "اردو" میں ان کے متعدد عالمانہ اور محققانہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم اُردو کے لیے کس طرح زمین کا گز بنے پھرتے تھے ابھی سنتے ہیں کہ کشمیر میں ہیں اور ساتھ ہی خبر آتی ہے کہ دکن تشریف لے گئے۔ ابھی سندھ میں ہیں تو ذرا میں خبر آتی ہے کہ وہ سابق صوبہ سرحد اور بلوچستان کے دَورے پر چلے گئے۔ اور اس خبر کی روشنائی بھی سوکھنے نہیں پاتی کہ معلوم ہوتا ہے مولوی صاحب پنجاب میں اُردو کے لیے مصروف عمل ہیں اور یہ خبر پڑھ کر ہم فارغ نہیں ہو پاتے کہ معلوم ہوتا ہے مولوی صاحب بہار میں کانگریسی لیڈروں سے اُردو کے حق میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ کبھی پٹنے اور کبھی کلکتے میں مولانا ابوالکلام آزاد سے صلاح و مشورہ ہو رہا ہے۔ کبھی لکھنؤ میں اور کبھی کسی اور جگہ لیگی لیڈروں سے اُردو کے مسئلے پر گفتگو ہو رہی ہے۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ دلّی میں ہیں لیکن کل تصدیق کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ مدراس چلے گئے۔ انھیں صرف اُردو کی فکر تھی۔ ان کی یہی دُھن تھی۔ اسی کی لگن تھی اسی کا انھیں عشق تھا، یہی ان کی زندگی تھی، یہی ان کا اوڑھنا تھا یہی ان کا بچھونا تھا۔ غرضیکہ اُردو سے مولوی صاحب مرحوم کو جو عشق و شیفتگی تھی ان خطوط سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

ان خطوط سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ خطوط مولوی صاحب کی وسیع الخیالی کا بھی ثبوت ہیں۔ مولوی صاحب فکر و رائے کی آزادی کا کس درجہ احترام کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو کے رسم الخط کے سلسلے میں کبھی کوئی تبدیلی قبول کرنے پر مولوی صاحب راضی نہیں ہوئے لیکن اُردو کی ترقی کے سلسلے میں رومن رسم الخط کی تجویز سننے اور اس پر غور کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ خود اجمل خاں صاحب سے اصرار کر کے اُردو کے لیے رومن رسم الخط کی اہمیت پر مضمون لکھوایا۔ اجمل خاں صاحب اس نظریے کے نہ صرف ترجمان بلکہ اس کے داعی تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سیاسی لیڈروں سے تبادلہ خیال کیا تھا بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو کو اس پر آمادہ بھی کر لیا تھا کہ اُردو ہندی کا جھگڑا ختم کرنے کے لیے رومن رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔ اجمل خاں صاحب نے مولوی صاحب مرحوم کے ۲۵ جون ۱۹۳۶ء کے خط پر ایک نوٹ لکھا، فرماتے ہیں:-

" میرا خیال تھا کہ اُردو، ہندی کی بحث ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ رومن یعنی لیٹن رسم خط اختیار کیا جائے۔ پنڈت

جواہر لال جب ۱۹۲۹ء میں روس سے واپس ہوئے تھے تو الہ آباد میں ان سے میں ملا۔ اور انھوں نے اس خیال کی تائید کی لیکن تیسرے دن جب وہ واردھا تشریف لے گئے اور گاندھی جی نے ان کے بیان پر تبصرہ کیا تو وہ اس بات کے قائل ہوگئے کہ ہندوستانی زبان ہو اور اردو اور ناگری دونوں خطوں میں لکھی جائے۔ میرے کئی مضمون اس سلسلے میں مختلف اخباروں میں شائع ہوتے۔ مولانا (ابوالکلام آزاد) نے بیان نہیں دیا مگر اس نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کیا۔ سبھاش بابو اور ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی اور ڈاکٹر اما لطیفی اور دوسرے ترقی پسند اس کے حامی تھے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ اُردو اور فارسی اور ناگری خطوں کے علاوہ لیٹن خط بھی ترقی زبان کا باعث ہو سکتا ہے کم از کم ان ممالک میں جو لیٹن خط سے واقف ہیں اس طرح یہ زبان بین الاقوامی زبان بن سکتی ہے۔"[۵۰]

اگرچہ مولوی صاحب مرحوم اس نقطۂ نظر سے قطعاً متفق نہ تھے لیکن رسم خط کے سلسلے میں مخالف نقطۂ نظر کی اشاعت کی اجازت دی اور اس مسئلے پر اجمل خاں صاحب کا مضمون "اردو" میں شائع کیا۔

زبان کے مسئلے میں مولوی صاحب کا خیال تھا کہ نہ تو اس میں سنسکرت کے ایسے الفاظ ہوں جن کا تلفظ بھی مشکل ہو اور نہ عربی کے دقیق الفاظ ہوں جن کا سمجھنا لغات کے بغیر ممکن نہ ہو۔ وہ ایسی زبان کے قائل تھے جو ہندی اُردو دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے، اور ہر شخص بے تکلف سمجھ لے۔ یہی رائے مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی۔ اس کے لیے بڑی ضرورت ایسے بنیادی الفاظ کی فہرست بنانے کی تھی جنھیں اُردو اور ہندی دونوں زبانوں اور دونوں رسم الخطوں میں آسانی سے استعمال کیا جاسکے اور بے تکلف سمجھا جاسکے۔ یہ کام مولانا آزاد کے مشورے سے اجمل خاں صاحب نے انجام دیا۔ موصوف فرماتے ہیں۔

" مولانا (ابوالکلام آزاد) کے مشورے سے میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ میں کم از کم ایک ہزار لفظوں کی ایسی فہرست تیار کرنے میں لگ گیا جنھیں ہندوستانی کہا جاسکے۔ یہ سب مضامین انجمن ترقی اُردو کے رسالے اُردو میں شائع ہوئے۔"[۵۱] حال ہی میں اجمل خاں صاحب کی ترتیب دی ہوئی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط اور جوابات آزاد" سنگم کتاب گھر، دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ مولوی صاحب کے خطوط اسی سے ماخوذ ہیں اور مرتب کے شکریے کے ساتھ "قومی زبان" میں نقل کیے جا رہے ہیں:۔

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

۲۵ رجون ۱۹۳۶ء

مکرم بندہ تسلیم

کچھ دنوں تو سفر میں رہا اور اس کے بعد ایسا مصروف ہوا کہ آپ کو کوئی خط نہ لکھ سکا۔ آپ نے کچھ دن ہوئے مجھے لکھا تھا کہ آپ ایک مضمون لکھنا چاہتے ہیں جو شاہ اسماعیل اور دیگر مجاہدین کی اُردو کتب کے متعلق ہوگا۔ اُمید ہے کہ آپ نے لکھ دیا ہوگا

---

[۵۰] مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات آزاد" مرتبہ اجمل خاں، ناشر سنگم کتاب گھر دہلی، اکتوبر ۱۹۶۶ء ص ۱۸۱

[۵۱] ایضاً ص ۱۷۱

اور اگر ابھی نہ لکھا ہو تو آپ ضرور لکھ ڈالیے۔ اگر آخر جولائی یا شروع اگست میں مل جائے تو بہت اچھا ہو۔
میں منتخب اصحاب کی کانفرنس اکتوبر میں دسہرے کی تعطیلات میں کروں گا جولائی میں اس کا پروگرام آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا تاکہ آپ تمام امور مندرجہ پروگرام پر پوری طرح غور کرلیں۔
رسم الخط[1] پر آپ اپنا مضمون تیار کر رکھیں۔ اس مسئلے پر ضرور بحث ہوگی۔

نیاز مند عبدالحق

انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد (دکن)

دلکشا بنڈر روڈ راتے پیٹھ۔ مدراس ۴ر اکتوبر ۱۹۳۷ء

مشفقی و مکرمی۔ تسلیم

میں آج کل مدراس میں ہوں اور اُردو کی دھن میں آیا ہوں۔ ہندی شاعری پر آیندہ قسط میں ضرور کچھ لکھیے اور کبیر، نانک، فرید وغیرہ کے دوہوں کے نمونے ضرور ہونے چاہئیں۔ میرا تعداد کا معین کرنا مناسب نہیں۔ آپ حسب ضرورت نمونے دے سکتے ہیں۔ کبیر نانک فرید کے دوہے ایسے نہیں، جن کے ترجمے کی ضرورت ہو۔ البتہ عربی، فارسی الفاظ شمار کرا دیئے جائیں اور بعض تراکیب پر توجہ دلا دی جائے بہر حال بنیادی ہندوستانی پر ضرور مضمون[2] لکھیے بہت دلچسپ اور مفید ہوگا اور ان تمام امور کو بیان کیجیے جن کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے افسوس ہے کہ مدراس آجانے کی وجہ سے میں فوراً جواب نہ لکھ سکا اور اس تاخیر کی معافی چاہتا ہوں کیا کروں مجبور ہوں، عمر کے ساتھ ساتھ کام بھی بڑھتا جاتا ہے اور اتنی فرصت نہیں ملتی کہ خطوط کا جواب وقت پر لکھ سکوں۔ نیاز مند عبدالحق

نادر منزل، سیف آباد حیدر آباد (دکن) ۲۱ر جنوری ۱۹۳۸ء

مشفقی و مکرمی۔ تسلیم

میں حال ہی میں سندھ کے دورے سے واپس آیا ہوں جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی جس کی معافی چاہتا ہوں۔ میں پنڈت سندرلال صاحب کی بہت قدر کرتا ہوں اور ان کی ذات اس زمانے میں مغتنمات میں سے ہے۔ اخباروں سے مجھے معلوم ہوا کہ یوپی گورنمنٹ نے ان کی کتاب کے چھپنے کی اجازت دے دی ہے لیکن وہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ بنگالی زبان والا مضمون[3] مکمل ہوگیا ہو تو ضرور بھیج دیجیے۔ بہت ممنون ہوں گا۔ نیاز مند عبدالحق

---

[1] رسم الخط کے موضوع پر اجمل خاں صاحب کا یہ مضمون بعنوان " ترقی اُردو کا واحد ذریعہ رومن رسم الخط ہے" اردو جنوری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔
[2] اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جو "بنیادی ہندوستانی کے الفاظ" کے نام سے جولائی، اکتوبر ۱۹۳۹ء کے "اُردو" میں شائع ہوا ہے۔
[3] بنیادی ہندوستانی اور بنگالی اور اُردو والے دونوں مضمون بھیجے گئے" اور وہ رسالہ "اُردو" میں شائع ہو چکے ہیں (اجمل خاں) یہ مضمون "اُردو" اپریل ۱۹۳۸ء میں "بنگالی اردو" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔

۲۴ ہارڈنگ ایونیو - نئی دہلی　　یکم فروری ۱۹۳۹ء

مکرمی ، تسلیم

میں ابھی لاہور سے آیا ہوں - آپ کا خط پہنچا - پارہ عم کا بنگالی ترجمہ پہنچ گیا بہت بہت شکریہ ۔

جنوری کا رسالہ زیر طبع ہے اگر آپ اپنا مضمون "بنیادی ہندوستانی"[1] فوراً بھیج دیں تو اسی رسالہ میں طبع کر دیا جائے گا ۔ منتقلی کی وجہ سے اقبال نمبر[2] میں بہت دیر ہوگئی اور اسی کی وجہ سے جنوری کا رسالہ بھی تاخیر میں پڑ گیا - اسی مہینے میں شائع ہو جائے گا ۔ اس کی پچاس کاپیاں بڑی خوشی سے آپ کی خدمت میں مارچ تک بھیج دی جائیں گی ۔　　عبدالحق

مضمون بھیجتے وقت آپ پنسل سے لکھ دیں کہ پچاس کاپیاں الگ چھاپ کر دی جائیں ۔ آپ کا دوسرا خط ملا - جو کچھ میں نے لکھا وہ کانگریس کے اخبار "ہندوستان" میں درج تھا ۔ (عبدالحق)

دریا گنج - دہلی　　۱۲ ردسمبر - ۱۹۳۹ء

مکرم من - تسلیم

عنایت نامہ پہنچا - آپ نے جو تجویزیں ارسال فرمائی ہیں ، انھیں آپ خود ہی پیش کریں تو مناسب ہوگا ۔ پٹنے میں میں نے مولانا ابوالکلام سے درخواست کی تھی کہ کانفرنس میں شرکت فرمائیں ۔ انھوں نے کہا کہ کوشش کروں گا ۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اگر آپ نہ آسکیں تو محمد اجمل خاں صاحب کو ضرور بھیج دیجیئے گا ۔ مولانا نے حتمی وعدہ کیا کہ ان کو ضرور اجازت دے دوں گا - اس لیے اب آپ کا آنا پکا ہو گیا - آپ ضرور تشریف لائیں اور مولانا سے میرے اس خط کا ذکر کر دیجئے میں آپ کا منتظر رہوں گا ۔ ۲۰ ر کی صبح تک پہنچ جائیے اور اگر ۲۷ ر کو آجائیے تو اور اچھا ہوگا ۔　　نیازمند　عبدالحق

مسلم ایجوکیشن کانفرنس نے تاریخیں نہیں بدلیں - تاریخیں نہ بدلنے سے انھیں نقصان ہے ۔

---

۱ - دریا گنج - دہلی　　مورخہ ۲۴ ر دسمبر ۱۹۴۰ء

برادر مکرم - تسلیم

میں آج ہی لاہور اور جموں کے سفر سے واپس آیا ہوں میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوش خبری نہیں ہوسکتی کہ ہندی ، اُردو کا تنازعہ رفع ہو جائے ۔ خدا کرے پنڈت سندر لال اور مولانا[3] کی کوششیں کامیاب ہوں ۔

---

[1] یہ مضمون رسالہ "اُردو" جولائی ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ۔

[2] مولوی صاحب مرحوم نے رسالہ "اُردو" کا ایک شاندار "اقبال نمبر" شائع کیا تھا

[3] مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف اشارہ ہے ۔

ڈاکٹر داؤد پوتا صاحب[1] سے میری بھی باتیں ہوئی تھیں۔ میں سندھ جانے کا قصد کر رہا ہوں لیکن جھگڑے فساد کی وجہ سے نہ جاسکا لیکن کچھ دن وہاں رہ کر کام کرنا ہوگا۔ مجھے چند دن بھی یہاں رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ پٹنے سے آیا تھا کہ لاہور اور جموں جانا پڑا۔ آپ کا قاعدہ تلاش کروں گا۔ یا اچھا ہوتا آپ ایک نسخہ بھیج دیتے تو فوراً لکھ کر بھیج دیتا۔

عبدالحق

---

[1] سابق صوبہ سندھ (پاکستان) کے مشہور ماہر تعلیم، کئی سال ہوئے انتقال ہوگیا۔

" اُردو زبان جو ہندوستان کے بہت بڑے حصے کی زبان ہے اور سارے ملک کی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، پچھلے پچاس برسوں میں جتنی ترقی کی ہے اس میں مولوی عبدالحق صاحب کی کوششوں کو بہت کچھ دخل ہے۔ مولوی صاحب نے نہ صرف اُردو کے حال کو استوار بنایا بلکہ اس کے مستقبل کو پائدار بنانے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یعنی اُردو کی جو محبت ان کے دل میں تھی اس کی لگن لاکھوں دلوں میں لگادی اور اس کا پیام سارے ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک پہنچا دیا۔ آج اُردو نہ صرف مشرقی علوم بلکہ مغربی علوم وفنون سے بھی مالا مال ہے۔ ملی تعلیم کا ذریعہ ہے اور ایشیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور یہ ان تحریکوں کا نتیجہ ہے جن کی رُوح رواں مولوی عبدالحق صاحب کی ذات تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (صدر جمہوریہ ہند)

" پچاس سال تک اُردو زبان وادب کی انتھک خدمت نے ان کے نام کو اردو کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ دونوں کا تصور ایک ساتھ ذہن میں آتا ہے انھوں نے اپنی زندگی کے صبح شام اُردو کی محبت میں بسر کیے اور اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کیا۔ یکسوئی اور یک دلی کے ساتھ اپنی زبان وادب سے ایسی وابستگی کی مثال دوسری زبانیں بھی مشکل ہی سے پیش کرسکیں گی۔

پروفیسر احتشام حسین

" مولوی عبدالحق نے ساری زندگی جس طرح اُردو کی خدمت کی ہے اس کی دُوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ انھوں نے اُردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے تقریباً پچاس سال سے جو کوششیں کی ہیں وہ بھلائی نہیں جاسکتیں۔ انھوں نے نوجوانوں کی ہمت افزائی کی ہے، کام کرنے والوں کا دل بڑھایا ہے۔ وقت کی رفتار کو پہچانا ہے۔ ادب کے تہذیبی اور سماجی رول کو واضح کیا ہے۔ اور اپنی بلند ہمتی اور سعی پیہم سے مایوسی کی گھٹاؤں میں امید کی کرنیں دوڑائی ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور

محمد حسین خان زبیری



محمد حسین خاں زبیری

بنام محمد امین زبیری

مولوی محمد امین زبیری مرحوم، بابائے اردو کے قدیم دوستوں میں سے تھے۔ ان دونوں کے درمیان تقریباً نصف صدی تک مراسلت رہی۔ بابائے اُردو کے جو چند خطوط محفوظ رہ گئے ہیں وہ جناب محمد حسین زبیری نے مرتب فرما دیئے ہیں جس کے لیے ادارہ اُن کا ممنون ہے۔

---

(۱)

بنجارہ روڈ حیدرآباد دکن ، ۳ اگست ۱۹۳۰ء

شفیقی و مکرمی تسلیم

شکر ہے کہ تمھارے ہاتھ کا لکھا ہوا خط پہنچا۔ تم اچھے ہوگئے اور بڑے موذی حملے سے بچے۔ نعمان کے خط سے مجھے بہت تشویش ہوگئی تھی۔ تم ضرور طویل رخصت لے لو اور تبدیلی آب و ہوا کے لیے باہر چلے جاؤ۔ حیدرآباد ضرور آنا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ جلد سنڈیکیٹ کا جلسہ ہوجائے اور یامین و عمران کا معاملہ طے پاجائے۔ آج پھر جاکر رجسٹرار کو کھٹکھٹاتا ہوں اس کے بعد تمھیں لکھوں گا۔

سرکار عالیہ[1] کی وفات کا صدمہ جتنا تمھیں ہوا ہے اتنا ان کی کسی اولاد کو بھی نہ ہوا ہوگا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ تم نے ہر قومی اور نیک کام میں اپنی بساط سے بڑھ کر مدد دی اور اپنے کاموں سے زیادہ ان کاموں کو مقدم رکھا۔ تم مایوس نہ ہو انشاء اللہ یہ بچے تمھارے زیر عاطفت تعلیم پائیں گے اور کبھی اس نعمت سے محروم نہ رہیں گے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ ان کا کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ دل مضبوط رکھو۔ ہمت کو پست نہ ہونے دو اور جہاں تک جلد ممکن ہو تھوڑے دنوں کے لیے بھوپال سے باہر چلے جاؤ لیکن اپنے سفر میں حیدرآباد کو نہ بھولنا۔

نعمان۔ عمران۔ یامین اور تمام حشرات الارض کو دعا۔

عبدالحق

---

[1] بیگم صاحبہ بھوپال

(۲)

نجارہ روڈ حیدرآباد دکن ، ۲۷ جنوری ۱۹۳۱ء

شفیق و مکرمی - تسلیم

بھئی یہ باتیں زبانی کہنے سننے کی ہوتی ہیں۔ تحریر سے کام نہیں چلتا۔ اگر تم مجھے پہلے ہی لکھ دیتے تو جب میں علی گڑھ گیا تھا تو اس معاملے کے متعلق اچھی طرح ان سے کہہ سُن لیتا۔ اب میں لکھوں گا ضرور لیکن اس کا کچھ اثر ہو اس کا نہ مجھے یقین ہے اور نہ تم کو یقین دلا سکتا ہوں۔

مسعود[1] اپنے زمانے کے محسن الملک ہیں ان سے اس طرح کام نکالنا آسان نہیں۔ وعدہ لے لینا نہ میرے لیے مشکل اور نہ وعدہ کر لینا ان کے لیے بڑی بات۔ اس سے کام نہیں چلتا۔ رو در رو بات چیت کرنے میں بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں اور بہت سے شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔ میں انھیں لکھتا ہوں سرسری نہیں دل سے لکھوں گا۔ عبدالحق

(۳)

نجارہ روڈ حیدرآباد دکن - ۹ ستمبر ۱۹۳۱ء

شفیقی و مکرمی - تسلیم

آپ کا خط پہنچا۔ یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ اب آپ بھوپال کو خیرباد کہنے والے ہیں۔ بھوپال آپ کے لیے ایک دوسرا وطن ہو گیا تھا اور زندگی کا بہتر اور بڑا حصہ وہیں صرف ہوا اور حق یہ ہے کہ آپ نے وہاں رہ کر ایسی نیک نامی اور خوبی سے گزاری اور علمی کاموں میں ایسی کچھ مدد دی کہ وہاں کے بڑے بڑے عہدے داروں کے لیے بھی قابل رشک ہے۔

اگرچہ اس نئے عہد میں آپ کی قدر نہیں ہوئی اور ختم ملازمت پر جیسا سلوک کہ چاہیے تھا وہ آپ سے نہیں کیا گیا لیکن آپ کے لیے یہ کچھ کم باعث مسرت و فخر نہیں ہے کہ آپ وہاں ہمیشہ نیک نام رہے۔ آزاد رہے اور اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیے۔ گو اہل بھوپال آپ کے کاموں کی قدر نہ کریں مگر حِن انجمنوں، مدارس اور دیگر مجالس رفاہ عام کی امداد کے لیے آپ نے بے غرضانہ کوششیں کی ہیں وہ کبھی آپ کے احسان کو نہیں بھول سکتیں۔ ایسی زندگی ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ پنشن کتنے دن ملے گی ؟ کم ہوئی یا زیادہ۔ یہ چند دن زندگی کے کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائیں گے لیکن انسان کا کام ہمیشہ رہنے والا ہے۔ یہی ایک چیز ہے جسے بقا ہے باقی سب کو فنا ہے۔

میں شمالی ہند آتے جاتے صرف آپ کی خاطر بھوپال ٹھیر جایا کرتا تھا۔ افسوس اب وہ بھی گیا۔ مجھے بھی اب بھوپال سے کوئی انس نہیں رہا۔ آپ وہاں تھے تو ایک آدھ روز سفر میں حضر کا لطف آجاتا تھا۔ خیر اب وہاں نہیں تو علی گڑھ میں سہی۔

آپ کی تحریر سے مجھے کامل اتفاق ہے۔ علی گڑھ میں رہ کر تم بہت کچھ کر سکتے ہو اور خوش رہ سکتے ہو۔ میں آج مسعود جنگ کو ایک مفصل خط لکھوں گا اور ان پر زور دوں گا کہ آپ سے کام لیں۔ میری رائے میں آپ کا وہاں جانا کئی لحاظ سے بہت اچھا ہوگا۔ دسمبر میں میں بھی وہاں آؤں گا اور اس سے

---

[1] سر راس مسعود

متعلق زبانی بہت سی باتیں کروں گا۔ آج کل مسعود غالباً بمبئی میں ہیں۔ خیر کہیں ہوں خط انھیں پہنچ ہی رہے گا۔

آپ کا مخلص ، عبدالحق

(۵)

حیدرآباد ۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۳۵ء

مشفقی و مکرمی۔ تسلیم

خط پہنچا۔ تم نے تو ڈرا دیا۔ بچہ مرگیا تو کیا ہوا۔ دو بڑے بڑے گبرو جوان موجود ہیں اس کے بعد بھی بچوں کی خواہش ہے تو سراسر حماقت ہے۔ قاضی صاحب کو آج کتاب بغرض ریویو دے دی باقی باتیں بھی کہلا بھیجی ہیں۔ اب تم براہ راست خط لکھو۔

حبیب نظامی نے "حیاتِ جاوید" بغیر اجازت چھاپ لی ہے تو مجھے معاملہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب اس کے متعلق کچھ نہ کیجیے۔

صدیق حسن کا خط بجنسہ ملفوف ہے اس کا جواب آپ ان کو براہ راست دیجیے۔ عبدالحق

(۶)

نادر منزل حیدرآباد ۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۳۶ء

محبی زاد لطفہٗ تسلیم

لقمان آئے تھے۔ انعام جیت کے لے گئے آپ کے لکھنے پر انھیں بیس روپے دے دیئے تھے حساب میں لکھ لیجیے۔

ریڈروں[۱] کی باقی کا پیاں وصول نہیں ہوئیں۔ کاتب صاحب کو تاکید کر دیجیے کہ جلد لکھ دیں۔ چھٹی ریڈر ابھی اور لکھوانی ہوگی اسے ایک نظر دیکھ کر جلد بھیج دوں گا۔ عبدالحق

جمیل صاحب کا خط آیا تھا وہ ڈیڑھ سو روپے قرض مانگتے ہیں بھائی صاحب مرحوم کی بیماری میں تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے صرف ہو گئے اب ان کے قرض وغیرہ کے معاملات باقی ہیں کچھ ادا کر دیا گیا کچھ باقی ہے ایسی حالت میں مجبور ہوں۔ مجھے کہتے ہوئے مروّت مانع ہوتی ہے آپ انھیں سمجھا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ سلطان احمد کو ضرور کپڑے بنوا دیجیے اس کا خرچ میں بھیج دوں گا۔

(۷)

دریا گنج دہلی ، ۲۸ر مئی ۱۹۴۱ء

مشفقی و مکرمی زاد لطفہٗ تسلیم

خط پہنچا۔ تمباکو کا پارسل لینے کے لیے آدمی بھیجا ہے بہت شکر گزار ہوں۔ "ہماری زبان" کا روپیہ دے دیا۔

تم پوچھتے ہو کہاں جا رہے ہو؟ جاتا کہاں؟ بیگار میں پکڑا گیا ہوں۔ جھک مارنے جا رہا ہوں۔ کشمیر میں بھی اُردو ہندی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہے

---

[۱] سلسلہ عثمانیہ کی اُردو ریڈریں۔

اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ہر طرف سے مطالبہ ہے کہ جاؤ اور معاملہ سلجھاؤ۔ گویا قربانی کا ایک بکرا میں ہی تو رہ گیا ہوں۔ اردو اور کسی کی زبان ہی نہیں میری اکیلے کی ہے۔ اب سمجھے کہاں جا رہا ہوں اور کیوں جا رہا ہوں۔ لیکن ابھی اس بات کو اپنے ہی تک رکھنا۔

میرا مشورہ پھر بھی یہی ہے کہ علی گڑھ چھوڑ دو وہاں رہ کر سازشوں کے جال سے بچنا ناممکن ہے اور اگر تمھیں اسی میں مزا آتا ہے تو مبارک ہو۔ میں تو علی گڑھ سے اس طرح بچتا ہوں جیسے کوئی طاعون زدہ مقام سے۔ میری یہ قطعی رائے ہے کہ تمام عمارتیں بیچ ڈالی جائیں اور اس کے روپے سے ایک وقف بنا دیا جائے جس کی آمدنی سے مسلمان طلبہ کو تعلیمی امداد دی جائے یہ کہیں بہتر ہوگا۔ یہ یونیورسٹی ہمارے لیے ایک لعنت ہو گئی ہے اسے کون تعلیمی مرکز کہتا ہے۔ اسے علم و فضل اور تہذیب سے کیا تعلق بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم سے دور رکھنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ لائق آدمی وہاں آنے نہیں پاتا اور آ جائے تو ٹھیرنے نہیں پاتا۔ علم سے اور اہل علم سے دشمنی جہالت اور سازش سے پیار۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

عبدالحق

(۸)

دریا گنج۔ دہلی۔ ۱۴ر جون ۱۹۴۴ء

شفیقی زاد لطفہٗ تسلیم

میں تمھارا تبصرہ[۱] پڑھ رہا ہوں۔ کیا خوب لکھا ہے۔ تمھاری تحقیق و جستجو کی داد نہ دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ بڑا کام کیا ہے۔ جزاک اللہ۔ کذب اور تلبیس کی قلعی کھول دی ہے اصل کتاب کی کوئی وقعت نہ رہی۔

میں نہیں سمجھتا تھا کہ فاضل مصنف ایسے تنگ دل۔ تنگ نظر۔ تنگ خیال اور عامیانہ طبیعت کے ہوں گے۔ یہ تو اپنے استاد سے بھی بڑھ گئے۔ انھوں نے واقعات کو مسخ کر کے اپنے ممدوح کی بڑائی بتائی ہے لیکن یہ بڑائی ان کے حق میں برائی سے بدتر ثابت ہوگی۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے اہل علم ایسے کم ہی ہیں۔ کیا مولانا شبلی میں کچھ کم خوبیاں تھیں جو ان کے ابھارنے کے لیے وہ دوسروں کی تنقیص و تذلیل کے محتاج ہوئے اور وہ بھی غلط توجیہوں اور واقعات پر پردہ ڈالنے سے؟ افسوس اس کا ہے کہ ان کی سالہا سال کی محنت اکارت گئی۔ اس تبصرے کے بعد اصل حقیقت کھلے گی۔

میں ۲۴ر جون کو آؤں گا اور وہ بھی ایک دن کے لیے۔ مطلق فرصت نہیں۔ کام کا ہجوم ہے اور یہ دن بھی میں نے اپنے اوپر جبر کر کے نکالا ہے۔

عبدالحق

(۹)

دریا گنج، دہلی۔ ۵ر ستمبر ۱۹۴۵ء

شفیقی و مکرمی، تسلیم

خط پہنچا میرے پاس "حیات سلطانی" یا "حیات شبلی" رائے کے لیے نہیں آئی صرف چند ادب کی نظم و نثر کی کتابیں آئی تھیں جن میں کوئی بھی قابل

---

[۱] تبصرہ بر حیات شبلی

انعام نہ تھی۔

میں نے حکیم اسرار احمد صاحب کو کاظمی صاحب[1] کے پاس بھیجا تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آپ کے تمام خطوں اور استفسارات کا جواب دیں گے۔ تعجب ہے کہ انھوں نے آپ کو کوئی خط نہیں لکھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں روداد آتی ہے یا نہیں۔ مجھے اپنے کاموں سے فرصت نہیں۔

میں یہاں ۱۰ ستمبر کو پنجاب میل سے روانہ ہوں گا۔ اورنگ آباد صرف دو تین روز رہوں گا۔ اس کے بعد حیدرآباد چلا جاؤں گا۔ بعض کام اٹکے ہوئے ہیں۔　　　عبدالحق

(۱۰)

خلیق منزل چوڑی والان دہلی　　　۳۱ ر دسمبر ۱۹۴۸ء

محبی تسلیم

کارڈ پہنچا۔ ۱۸ جنوری تو بہت دور ہے۔ میں ۶ ر جنوری کو بھوپال جا رہا ہوں ٹکٹ بھی لے لیا ہے۔ ریل سے جاؤں گا۔ وہاں ۱۰ تک ٹھیروں گا۔ اب تم سے کراچی ہی میں ملاقات ہو تو ہو۔ میری تو یہ آرزو تھی کہ تم یہاں آتے دو چار روز رہتے اور یہاں سے ہم ساتھ بھوپال جاتے اور وہاں کچھ دن ساتھ بسر کرتے لیکن سب آرزوئیں کب پوری ہوتی ہیں۔ خیر خدا تمھیں صحت و عافیت کے ساتھ کراچی لائے۔

یہ دن جو دلّی میں گزرے ہیں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ عمر بھر کبھی ایسی کوفت نہیں ہوئی تھی نہ ایسی ذلت آمیز زندگی کبھی بسر ہوئی تھی۔ فساد کے بعد سے انجمن پر اور ہم پر جو گزری اس کی پوری داستان لکھ رہا ہوں۔

تم یونیورسٹی کی تاریخ کے لیے بہت کچھ تلاش کر رہے ہو ایک چیز میرے لیے بھی تلاش کر دو۔ تمھیں شاید یاد ہو کہ نہ یاد ہو مگر یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ جب لوگوں نے سرسید پر بہت اصرار کیا کہ وہ سید محمود کے استعفے کے متعلق اصل حقیقت یا اپنا خیال ظاہر فرمائیں، تو انھوں نے ایک مضمون انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا تھا جس کے آخر میں اس قسم کے دو ایک فقرے تھے کہ انگریز کو حکومت کا غرور ہے اور وہ گوارا نہیں کرتا کہ کالا آدمی گورے منہ والے کے ساتھ ایک بنچ پر بیٹھے۔ یہ مضمون غالباً ۱۸۹۲ء میں لکھا گیا تھا۔ میں نے سرسید کی کوٹھی ہی پر اسے پڑھا تھا۔ ان فقروں کی نقل مجھے بھجوا دینا۔

میں اس امید میں تھا کہ علی گڑھ سے آؤ گے تو اندر کی اصل خبریں سننے میں آئیں گی۔ یہ بھی نہ ہوا اور کیا کیا کہوں کہ کیا کیا نہیں ہوا۔ خدا حافظ۔

عظمت الٰہی صاحب کو میرا بہت بہت سلام پہنچا دینا۔ معلوم نہیں وہ رجسٹرار رہتے ہیں یا نہیں۔ نیا زمانہ ہے نئے حالات ہیں ان کے لیے آدمی بھی نئے ہونے چاہئیں۔　　　خیر طلب

عبدالحق

تم نے حبیب الرحمان[2] کا وہ ایڈریس پڑھا جو اس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو دیا ہے۔ اسے شرم نہیں آتی۔

---

[1] اسداللہ کاظمی۔　[2] مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی

(۱۱)

خلیق منزل چوڑی والان دہلی ۔　　۱۴ر جنوری ۱۹۴۹ء

شفیقی زاد لطفہ، تسلیم

آج خط پہنچا کل شب کو رحم علی نے (خدا اس پر رحم کرے) لیمو کا اچار پہنچایا۔ اسے تمھاری یادگار سمجھ کر کراچی لے جاؤں گا۔

تمھاری سب چیزیں رکھی ہیں جس تاریخ کو جانے لگو تو دلّی پہنچنے کے وقت سے پہلے محمد یعقوب صاحب یا رفیق صاحب کو اطلاع کردینا وہ تم کو سب چیزیں ریل پر پہنچادیں گے۔ اگر تم دلّی میں ٹھیرنا چاہو تو اسی مکان میں ٹھیر سکتے ہو جس میں پہلے آکر ٹھیرے تھے۔ وہ مکان ہمارے قبضے میں رہے گا۔

مسلم یونیورسٹی کی مختصر تاریخ بذریعہ بک پوسٹ بھیج رہا ہوں۔ فی الحال خدا حافظ۔ اب انشاءاللہ کراچی میں ملاقات ہوگی۔

خیر طلب　عبدالحق

(۱۲)

کراچی ۔　۲۷ر نومبر ۱۹۵۲ء

حضرت مکرم السلام علیکم

کرم نامہ ملا اس سے قبل مجھے آپ کا کوئی خط نہیں ملا ورنہ ضرور جواب دیتا اور اگر انجمن کے کتاب خانے میں آپ کی مطلوبہ کتابیں ہوتیں تو دینے میں تامل نہ کرتا۔

شبر حاتمی[1] کے حالیہ معاملے کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا افتاد پڑی اور کیا حالات پیش آئے لیکن یہ میں پورے یقین اور راستی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس نے انجمن کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا اس کے ذمّے جو رقم تھی وہ اس نے سب ادا کی بلکہ اس کے علاوہ بھی انجمن کو بہت کچھ دیا اور ہر موقع پر اس کی خدمت کی۔ اگر یہ رقم نہ ملتی تو یہاں انجمن کے قدم نہ جمتے اور نہ اس کا کالج قائم ہو سکتا جسے ابتدائی دو سال تک حکومت یا پبلک سے کوئی امداد نہ ملی اور تمام مصارف انجمن نے ادا کیے۔

اگرچہ آپ ناراض ہیں اور ناراضی کی حالت میں انسان بہت کچھ تند و تلخ کہہ جاتا ہے۔ لیکن میں نے آج تک ایک لفظ بھی اپنی زبان سے آپ کے خلاف نہیں کہا۔ یہی نہیں بلکہ دوسروں سے سُننا بھی گوارا نہیں کیا۔ ایک صاحب نے جو بھارت سے آئے تھے اور کچھ دن وہاں کی انجمن میں بھی رہے تھے آپ کے متعلق بطور شکایت کچھ کہنا چاہا تو میں نے فوراً انھیں روک دیا اور کہا میں محمد امین کے خلاف ہرگز کچھ سننا نہیں چاہتا وہ اگر ناراض ہیں تو یہ ہمارا ان کا معاملہ ہے۔

آپ جو چاہیں کہیں اور لکھیں لیکن میں اپنی زبان یا قلم سے آپکے خلاف ایک لفظ بھی نہیں نکالوں گا۔ بلکہ کبھی ایسا موقع آیا تو آپ اپنی تعریف ہی

---

[1] شبر حاتمی صاحب کے متعلق زبیری صاحب کو انجمن کے کاموں سے متعلق شبہات ہوگئے تھے۔ اسی کے متعلق مولوی صاحب سے اختلاف تھا جو بعد میں رفع ہوگیا۔

دیکھیں گے۔ خیر طلب عبدالحق

(۱۴)

کراچی۔ ۳ر جنوری ۱۹۵۳ء

مکرم و کرم فرما۔ تسلیم

کرم نامہ پہنچ گیا تھا مگر میں اسے کہیں رکھ کر بھول گیا۔ دو ایک بار اِدھر اُدھر تلاش کیا نہ ملا۔ آج اتفاق سے اس کتاب میں جسے کئی روز ہوئے پڑھ رہا تھا نکلا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پڑھ کر اس میں رکھ دیا تھا

حاتمی صاحب کی نسبت آپ کا خیال صحیح نہیں ہے۔ دہلی میں تقسیم کے بعد جو مخطوطات نکالے گئے وہ میرے سامنے نکالے گئے اور تمام وقت میں خود بیٹھا رہتا تھا اور شام کو اپنے ساتھ لاتا تھا۔ حاتمی صاحب کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اس زمانے میں دہلی میں تھا ہی نہیں۔ اس کام میں میرے ساتھ محمد یعقوب صاحب کاتب اور حامد علی ندوی صاحب تھے جو چیزیں ہم نے نکالیں وہ بالکل محفوظ رہیں اور محفوظ طور پر یہاں پہنچیں۔

اخبار کے لیے بے شک ایک صاحب کو حاتمی کی سفارش پر رکھا تھا۔ میں خود بھی اس سے واقف تھا۔ چار سو بہ نہیں دو سو یہ۔ کام اچھا نہیں کیا تو دو ایک مہینے کے بعد ان کو جواب دے دیا گیا اور کیا کیا جاتا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی معمولی بات تھی۔

حیدرآباد میں گشتی کتب خانہ ہرگز انجمن کا نہ تھا۔ اس کے مالک بلا شرکت غیرے حاتمی تھے اور ان کا یہ کمال تھا کہ اسے یہاں لے آئے اور انجمن کی نذر کر دیا یہ ان کا اتنا بڑا احسان ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس نے میری اور خصوصاً انجمن کی بڑی خدمت کی ہے اور اس احسان کو تسلیم نہ کرنا بڑی ناشکری ہوگی۔ انجمن کا کوئی بُک ڈپو حیدرآباد میں نہ تھا۔ انجمن کی ریڈریں جو حیدرآباد میں رائج تھیں وہ حاتمی کے ذریعے مختلف مقامات میں حسب ہدایت سررشتہ تعلیم تقسیم کی جاتی تھیں اس پر انھیں کمیشن دیا جاتا تھا بعد میں ریڈروں کی طباعت وغیرہ کا کام منشی گلاب سنگھ کی فرم سے متعلق ہو گیا اور اس فرم نے انھیں اپنا ایجنٹ رکھا۔ دُنیا میں کونسا ایسا شخص یا ادارہ اور ایسی حکومت ہے جس سے غلطی نہیں ہوئی اور جسے کبھی نقصان نہیں ہوا۔ اصل مقصد کو قائم رکھنا اور ترقی دینا ہر حال میں ضروری ہے۔ باوجود طرح طرح کی مشکلات کے اب انجمن کی حالت ایسی اچھی ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ پانچ رسالے انجمن سے شائع ہوتے ہیں۔ ہر رسالہ بمنزلہ ایک کتاب کے ہے۔ اس برعظیم میں کوئی بھی ایسا ادارہ ہے جسے یہ توفیق ہوئی ہو۔ انجمن نے اپنا پریس بھی قائم کر لیا ہے اس سال تقریباً بیس یا چوبیس کتابیں شائع ہوں گی جو زیر طبع اور زیر ترتیب ہیں یہ سب کچھ ایسی حالت میں ہو رہا ہے جب کہ حکومت سے گزشتہ سال کوئی امداد نہیں ملی اور نہ اس سال ملی۔ گزشتہ غلطیوں کو روتے رہنا اور پرانی لکیر کو پیٹتے رہنا پست ہمتوں کا کام ہے۔ گزشتہ زمانہ واپس نہیں آسکتا۔ ماضی سے زیادہ قابل احترام حال ہے۔

مد محفوظ بھارت کی انجمن کے پاس رہا اور امپیریل بنک سے ہم بہت کم رقم نکالنے پائے تھے کہ بھارت کی انجمن نے کارروائی کر کے رقم رکوادی۔ پولیس نے چیف کمشنر کے حکم سے انجمن کے کتب خانے کو سربہ مہر کر دیا تھا۔ اس پر سر تیج بہادر نے چیف کمشنر کو خط لکھا اور شکایت کی کہ

یہ کارروائی نامناسب اور ناجائز کی گئی چیف کمشنر نے لکھا کہ یہ میں نے ابوالکلام آزاد ۔ ڈاکٹر تاراچند کے اشارے سے کیا ہے ۔ سرتیج بہادر نے خط کی نقل مجھے بھیج دی ۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے خط میں اس کی گنجائش نہیں کبھی موقع ہوگا تو بیان کروں گا ۔ اس وقت اس بحث کو ختم کرتا ہوں ان باتوں میں اُلجھنا وقت ضائع کرنا ہے ۔

اس سال انجمن کے قیام کو پچاس سال ہوتے ہیں اس کی پنجاہ سالہ جوبلی منانے کا ارادہ ہے ۔ اس کا پروگرام تیار کر رہا ہوں اس کے لیے ابھی بعض ضروری امور طے کرنے ہوں گے ۔ بہت سا وقت اس میں صرف کرنا پڑتا ہے ۔ اگر سب امور قابلِ اطمینان طور پر طے ہوگئے ، تو اس وقت اس کا اعلان کروں گا ۔ عبدالحق

(۱۴)

کراچی ۔ ۲۸ر جنوری ۱۹۵۳ء

حضرت " شبلی کی رنگین زندگی " ملی اس سے پہلے آپ نے نہیں بھیجی تھی جن صفحات کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے انہیں ضرور پڑھوں گا ۔ قمرالحسن صاحب کی انگریزی کتاب کا نام (BIRTH OF PAKISTAN _ STEP BY STEP) ہے سرسید کے تذکرے کا خیال بہت اچھا ہے جتنے حالات بھی اور ملیں غنیمت ہے ورنہ پھر اس کی بھی توقع نہیں ۔

عبدالحق

میں نے اپنے شوفر سے کہا کہ یہ خط آپ کو پہنچا دے تو اس نے آپ کے پتے سے لاعلمی ظاہر کی لہٰذا ڈاک سے بھیج رہا ہوں ۔

عبدالحق

(۱۵)

کراچی ۔ ۱۲ر فروری ۱۹۵۳ء

مشفقی تسلیم

آپ کے آدمی سے کہہ دیا تھا کہ چار بجے آکر جواب اور کتاب لے جائے جس وقت آپ کا خط آیا کتاب خانہ بند تھا ۔ ۲½ بجے کھلتا ہے ۔ اسی لیے چار بجے آنے کو کہا تھا آج اور انتظار کروں گا ۔

میں نے راجندر پرشاد کی کتاب نہیں پڑھی اور نہ میرے پاس ہے ۔

سرسید کے اس قسم کے خیالات کانگرس سے پہلے بھی تھے؛ مجھے بھی اس سے اتفاق نہیں کہ سرسید نے کانگرس کی مخالفت مسٹر بیک کے اثر سے کی البتہ بیک کو یہ موقع خوب ہاتھ آیا اور اس نے اس مخالفت کو خوب اچھالا اور اس کام میں بڑی مدد دی ۔ میرے کالج میں داخل ہونے سے پہلے یہ کام شروع ہوچکا تھا اس لیے میں ذاتی علم و مشاہدہ کی بنا پر کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ میر ولایت حسین زندہ ہوتے تو بتا سکتے تھے یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا ۔

عبدالحق

(۱۶)

شاردا مندر کراچی

مجبی تسلیم[۱]

جس روز آپ آئے تھے اس روز سے برابر اسہال میں مبتلا ہوں۔ بہت کمزور ہو گیا ہوں اور کام کرنے کے بالکل ناقابل۔ "ترجمے والا کاغذ" کا مطلب میں نہیں سمجھا۔ ایسا کوئی کاغذ میرے پاس نہیں آیا۔ "روشن مستقبل" پہنچ گئی تھی۔

فہرست[۲] مضامین طبیعت صاف ہونے پر دیکھ کر بھیج دوں گا۔ عبدالحق

(۱۷)

کراچی۔ ۳۱ مئی ۱۹۵۳ء

مجبی تسلیم

آپ کا عنایت نامہ قاضی صاحب کے نام آیا تھا جو انھوں نے میرے پاس بھیج دیا تھا اس میں اس قدر پریشانی کا اظہار تھا کہ میں نے قاضی صاحب سے کہا آپ کو لکھ بھیجیں کہ میں بالکل اچھا ہوں لیکن میں بالکل اچھا نہ تھا آپ کی رفع پریشانی کے لیے لکھ بھیجا تھا لیکن اسی روز سے افاقہ شروع ہو گیا تھا۔ تین دن کے بعد اچھا ہو گیا لیکن نقاہت بہت تھی۔ میں انسائیکلوپیڈیا امریکینا کے لیے ایک آرٹکل لکھنے کا وعدہ کر چکا تھا اس کے پہنچنے کی آخری تاریخ ۳۱ مئی تھی اس نقاہت کی حالت میں میں نے آرٹکل لکھ ڈالا اور پرسوں ٹائپ کرا کر روانہ کر دیا اس سے میرے دماغ پر بار پڑا اور پیروں پر ورم آ گیا۔ کرسی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھنے اور کام کرنے سے یہ ورم بڑھ گیا۔ بہر حال اب میں بالکل اچھا ہوں۔ لیکن مسلسل کئی گھنٹے کرسی پر بیٹھ کر کام نہیں کر سکتا۔

میں نے آپ کا "خاکہ سرسید" دیکھا یہ جامع ہی نہیں مانع بھی ہے۔ آپ نے کمال کیا مقتدیٰ خاں شروانی نے جو بیان چند روز پہلے دیا تھا وہ بھی شریک کر لیا۔

آپ نے سرسید کے اس مضمون کا حوالہ بھی دیا ہے جو انھوں نے سید محمود کے متعلق لکھا تھا۔ میں نے یہ مضمون علی گڑھ میں بہ زمانہ طالب علمی پڑھا تھا مجھے اس کی تلاش تھی۔ میں نے علی گڑھ الطاف علی صاحب کو لکھا کہ وہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت سال ۱۸۹۴ء یا ۱۸۹۵ء کے پرچے دیکھیں، اس میں ملے گا۔ اس کی نقل مجھے بھیج دیں۔ انھوں نے لکھا کہ میں نے ان ہر دو سال کے پرچے نیز اس کے قریب کے بھی دیکھے۔ یہ مضمون کہیں نہیں ملا، کوئی اور شخص ایسا تھا نہیں جسے میں لکھتا اگر آپ کو دستیاب ہو گیا ہے تو مہربانی کر کے اس کی نقل عنایت فرمایئے۔

---

[۱] اس خط پر تاریخ درج نہیں غالباً ۱۹۵۳ء میں لکھا گیا۔

[۲] تذکرہ سرسید کے مضامین کی فہرست "یہ تذکرہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن راولپنڈی نے شائع کیا ہے۔

کرنل گریہم کی لائف آف سرسید میں نے نکال رکھی ہے آپ کسی روز اپنے آدمی کو بھیج دیجئے تو اسے دے دوں گا۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔

عبدالحق

زیبا[1] کو تاکید کردی ہے وہ کل پرسوں تک ترجمہ بھیج دیں گے۔ کوپ لینڈ کی کتاب ہمارے پاس نہیں ہے۔

(۱۸)

کراچی۔　۹ر جون ۱۹۵۳ء

محبی زاد لطفہٗ تسلیم

عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کو خط لکھنے کے بعد اس شب کو دس بجے حضرت بخار مزاج پرسی کے لیے نازل ہوئے۔ ملیریا تھا۔ تھوڑی دیر سے ہوئی تو جاڑا کافور ہوگیا۔ خالی بخار رہ گیا۔ دو روز کے بعد وہ بھی تشریف لے گئے لیکن اپنی نشانی نقاہت چھوڑ گئے۔

آپ نے عبدالرحمان صدیقی کے مضمون میں جو تقابلی تحریر دیکھی وہ میں بہت پہلے اپنے ایک پمفلٹ میں لکھ چکا تھا جو مسلم یونیورسٹی کے متعلق تھا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلم یونیورسٹی کے متعلق بہت گرم گرم بحثیں ہو رہی تھیں۔ بجنوری نے اسے بہت پسند کیا تھا۔

میں نے بھی عبدالرحمان کی وفات کے روز ایک تاریخ کہی تھی۔

چل دیا ہائے غریب الوطن

۱۳۴۷ھ

گریہم کی کتاب بذریعہ رجسٹری بھیج رہا ہوں۔ ترجمہ آج ختم ہو جائے گا۔ کل بھجوا دوں گا۔

عبدالحق

(۱۹)

شاردا مندر کراچی۔　۱۵ر جون ۱۹۵۳ء

مکرمی تسلیم

اب اس پمفلٹ کا ملنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ خدا جانے کیا ہوا اور کہاں گیا

سید حامد[2] جیسے ہماری قوم میں ہزاروں لاکھوں تھے اور ہیں ان کے ذکر سے کتاب[3] بوجھل بنانے کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ جو پڑھے گا افسوس کرے گا اور اکثر نہیں پڑھیں گے۔

اب اچھا ہوں تھوڑا بہت کام کرلیتا ہوں۔　　عبدالحق

---

[1] شجاع احمد زیبا

[2] سرسید کے بڑے صاحبزادے

[3] تذکرہ سرسید۔

(۲۰)

شاردا مندر کراچی - ۱۷ جون ۱۹۵۳ء

محبی تسلیم

آپ نے میرے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے مجھے یاد نہیں ایسی مہمل چیزیں بہت سی لکھیں، کس کس کو یاد رکھیں۔ سید راس مسعود کا تذکرہ کون لکھے گا۔ سرسید کے بعد ان کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ محمود نے اپنے زمانے میں قانون میں نام پیدا کیا اور بس اور اسی وقت ختم ہو گئے۔ راس مسعود ان لوگوں میں سے تھے جو طرب اندوزی اور بزم آرائی کے شائق ہوتے ہیں۔ ان کی اولاد ایسی نکلی جیسے اینگلو انڈین لونڈے۔ ان کی تعلیم ہی ایسی ہوئی تھی۔ رہے نام اللہ کا۔

عبدالحق

"جس زمانے میں میں اورنگ آباد دکن کے مدرسہ فوقانیہ (ہائی اسکول) میں پڑھتا تھا، مولوی عبدالحق اس زمانے میں اورنگ آباد کے انسپکٹر آف اسکول تھے۔ اس وقت سے میرے دل میں ان کا غایت درجے کا احترام ہے اور اس زمانے میں ان کی جو تقریریں سُنی تھیں، ان کا اثر اب تک دل و دماغ پر ہے۔ اس کے بعد جس طرح اُردو زبان کی ترویج و ترقی کا ایک مقصد اپنے لیے متعین کر کے انھوں نے اپنی ساری محنتوں اور توجہات کو اس پر مرکوز کر دیا ہے اور جس لگن اور دھن کے ساتھ سالہا سال سے وہ اس کے لیے کام کر رہے ہیں، وہ درحقیقت محض قابل قدر ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

دنیا میں کبھی کبھی ایسے انسان بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو صرف پیدا ہونا جانتے ہیں مرنا نہیں جانتے۔ ان کی زندگی کی پیمائش سال و ماہ سے نہیں بلکہ ان کے کردار و عمل سے کی جاتی ہے اور انھی انسانوں میں سے ایک ڈاکٹر عبدالحق ہیں۔ تاریخ کے نقش غیر فانی، داستان ادب کے سب سے بڑے ہیرو۔ اور جریدہ عالم پر ایک مہر دوام! ان کے متعلق یہ سوال کبھی نہیں کیا جا سکتا کہ خدمت زبان کے لیے انھوں نے کیا کیا؟ بلکہ ہمیشہ یہ پوچھا جائے گا کہ کیا نہیں کیا؟ اس اجمال کی تفصیل کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

علامہ نیاز فتح پوری

رشیدہ رضویہ



رشیدہ رضویہ

بنام محمودہ رضویہ

گزشتہ برس بابائے اردو نمبر میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے اس حقیقت سے ناآشنا تھی کہ انجمن ترقی اردو اور بابائے اردو سے ہمارے گھر کے تعلقات کس حد تک تھے۔ مضمون کی اشاعت کے بعد جہاں یہ انکشاف ہوا کہ انجمن ترقی اردو کراچی کی بنیاد محمودہ رضویہ کی نانی اماں کے بھائی ولایت حسین اور ان کے شریکِ کار محمد ابراہیم عرب (نیشنل بینک آف انڈیا) محمد صدیق خاں شیروانی اور حکیم صمصام نے پاکستان چوک کی ایک عمارت میں رکھی تھی۔ اور ۱۹۳۶ء میں والد صاحب نے دو ہزار کی رقم دے کر انجمن کا کام آگے بڑھایا تھا وہیں یہ چار خطوط بھی دستیاب ہوئے۔ جو مولوی عبدالحق صاحب نے محمودہ رضویہ کو لکھے تھے۔ بدقسمتی سے میں یہ چار خط ہی حاصل کر سکی۔ بقیہ خطوط پیر حسام الدین راشدی کے پاس ہیں۔ بہرحال یہ خطوط بھی بابائے اردو کے لگاؤ اور شفقت کا آئینہ ہیں۔

(۱)

۱۲ دریا گنج دہلی

۲۹ مئی ۱۹۴۵ء

عزیزی سلمہا

تمہارا خط پہنچا۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ تمہاری محنت رائیگاں نہ جائے گی اور تم ضرور کامیاب ہوگی۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ تمہارے شکوک بالکل بے جا ہیں۔

والد صاحب کی خدمت میں میرا بہت بہت سلام پہنچا دینا۔ مجھے ان کی عالی ظرفی اور اسلامی ہمدردی سے کامل توقع ہے کہ وہ انجمن کی ضرور دستگیری فرمائیں گے۔

خیر طلب

عبدالحق

(۲)

اورنگ آباد دکن

۲۴ ستمبر ۱۹۴۵ء

عزیزی سلمہا

تمھارا خط دہلی سے ہوتا ہوا مجھے یہاں ملا۔ یہ معلوم کرکے بہت افسوس ہوا۔ کہ تم نے رسالے[1] سے قطع تعلق کرلیا ہے۔ خیر جو کچھ ہوا ہے۔ اچھا ہوا اب تم اطمینان اور فرصت سے اپنی تعلیم میں مصروف رہ سکتی ہو۔ منشی فاضل اور بی۔اے دونوں کے لئے ساتھ ساتھ تیاری کرنے میں تم پر بہت محنت پڑے گی۔ اس سلسلے میں پہلے منشی فاضل کے لئے تیاری کی جائے۔ اس کے بعد تمھیں بی۔اے کے امتحان میں بیٹھنے کا حق ہوجائے گا۔ بغیر منشی فاضل میں کامیابی کے تم بی۔اے کا امتحان نہیں دے سکتیں۔ اس میں محنت بھی کم پڑے گی۔

والد صاحب کو خط لکھو۔ تو میرا سلام ضرور لکھ بھیجنا۔

خیر طلب

عبدالحق

(۳)

کراچی

۲۹ ستمبر ۱۹۴۶ء

عزیزی محمودہ سلمہا

تمھارا خط پہنچا۔ جس کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کل دوپہر کا کھانا میں تمھارے ساتھ کھاؤں گا۔ میرے ساتھ حکیم اسرار احمد صاحب اور حامد علی صاحب بھی ہوں گے۔ ہم ساڑھے بارہ بجے تک تمھارے مکان پر پہنچ جائیں گے۔

خیر طلب

عبدالحق

تمھارے مکان کا پتا یاد نہیں رہا۔ مہربانی کرکے ہماری رہنمائی کے لئے کسی کو بھیج دینا۔

---

[1] شعاع اردو

(۳۴)

مل دریا گنج دہلی

۲۶؍اپریل ۱۹۴۷ء

عزیزی سلمہا

تمھارا خط ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کہ تم خیر و عافیت سے ہو اور ادبی و علمی کام میں مصروف۔ خدا تمھیں اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔

میں ان دنوں نہایت مصروف رہا۔ سر مرزا اسماعیل کی عنایت سے حیدر آباد کی امداد جو بند ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ سے بہت پریشانی اور مصروفیت رہی۔ اُس نے فنانس کے ایک افسر اور چند اہل کار ہمارے حسابات اور کتب خانے وغیرہ کی تصیح کے لئے بھیجے تھے۔ مسلسل دو ہفتے تک تصیح کرتے رہے۔

بچوں کے لئے جو کتابیں تم نے لکھ کر شائع کی ہیں وہ ضرور بھیج دو۔ ان پر ہماری زبان میں تبصرہ شائع کیا جائے گا

تمھارے بھائی صاحب کے بھی دو خط آچکے ہیں۔ اُن کا بھی جواب نہ لکھ سکا۔ میری طرف سے معذرت کرنا۔

خیر طلب

عبدالحق

انجمن ترقی اردو (شاخ کراچی) کی ایک یادگار تقریب



بائیں سے دائیں۔ روش صدیقی، منظر عالم، بابائے اردو، جبریل صدیقی، شبنم رومانی، اے بی چغتائی اور خورشید اعجاز مدیر ہفتہ وار "جھنکار"

جمیل نقوی

وہ نہیں ہے تو فسُردہ ہے جہانِ اُردو

آج پھر آئی ہے اس بندۂ حق کوش کی یاد
زندگی جس کی تھی آئینۂ ایثار و جہاد
جو نہ پابندِ خلائق تھا نہ یکسر آزاد
آپ ہی صید تھا اور آپ ہی اپنا صیاد
مثل او مادرِ ملت در ادب باز نہ زاد

واقف و کاشفِ اسرار معانی تھا وہ شخص
طرز و اسلوب میں سرسید ثانی تھا وہ شخص
نئے انداز کی تحقیق کا بانی تھا وہ شخص
محورِ علمِ لسان و ہمہ دانی تھا وہ شخص
عہدِ پیری میں بھی اردو کی جوانی تھا وہ شخص

اُس کی گفتار میں، رفتار میں اک عظمت تھی
اُس کی تحریر میں، تقریر میں اک ندرت تھی
اُس کے لہجے میں عجب شان عجب سطوت تھی
رائے میں اس کی بڑی جان بڑی قوت تھی
اُس کو اظہارِ حقیقت پہ بڑی قدرت تھی

اُس کی تقریر نے اُردو کو طلاقت بخشی
اُس کی تحریر نے اُردو کو سلاست بخشی
اُس کی تحقیق نے اُردو کو قدامت بخشی
سرد الفاظ کو اظہار کی طاقت بخشی
نفسِ گرم دیا، پھر سے، حرارت بخشی

لوگ کہتے ہیں وہ دیوانہ تھا سودائی تھا
مستِ پندار تھا، مستِ مئے خود رائی تھا
عشق کے نام سے بیزار تھا، ہرجائی تھا
میں یہ کہتا ہوں کہ وہ مظہرِ دانائی تھا
آپ ہی اپنے تماشے کا تماشائی تھا

وہ دوانہ تھا تو ہشیار کسے کہتے ہیں
پیکرِ جذبۂ ایثار کسے کہتے ہیں
بطلِ حق، صاحبِ کردار کسے کہتے ہیں
بُت شکن، خالقِ اقدار کسے کہتے ہیں
رہنمائے رسن و دار کسے کہتے ہیں

یاد آتا ہے تو احساس پہ چھا جاتا ہے
دل میں، آنکھوں میں، تصوّر میں سما جاتا ہے
چند بھولے ہوئے افسانے سنا جاتا ہے
دلِ خود دار کو دیوانہ بنا جاتا ہے
کام کرنے کا نیا شوق دلا جاتا ہے

عاشق و محسنِ اُردو تھا گراں پایا تھا
عشق کے نام سے پیغامِ جنوں لایا تھا
جو زمانے کو پلٹ دیتی ہے وہ کایا تھا
فخرِ اسلاف تھا وہ، قوم کا سرمایا تھا
عظمتِ رفتہ کا ڈھلتا ہوا اک سایہ تھا

وہ نہیں ہے تو فسردہ ہے جہانِ اُردو
اُجڑی اُجڑی نظر آتی ہے دوکانِ اُردو
تم کو معلوم ہے اے خوش نظرانِ اُردو
نامکمل ہے بغیر اس کے بیانِ اُردو
روئے گی حشر تلک اس کو زبانِ اُردو

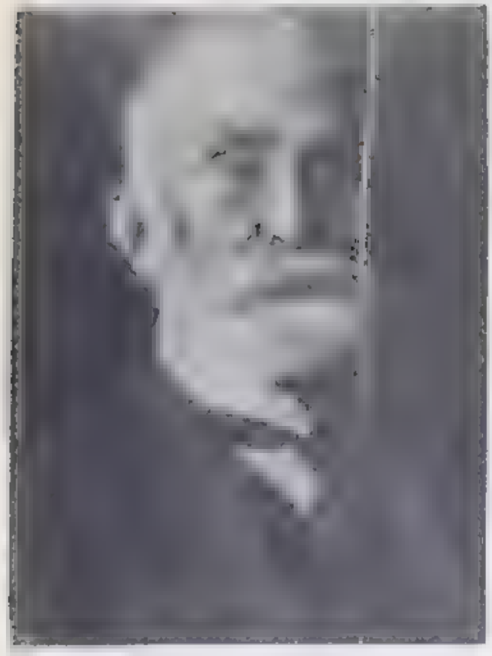
انجمن بود گلِ تازہ و اُو خوشبو بود
ہر نفس کز تنش آمد نفسِ اُردو بود

بیادِ عبدالحق



محمد حبیب اللہ رشدی

اس مضمون سے متعلق چند شخصیات



عماد الملک مرحوم



سر اکبر حیدری مرحوم



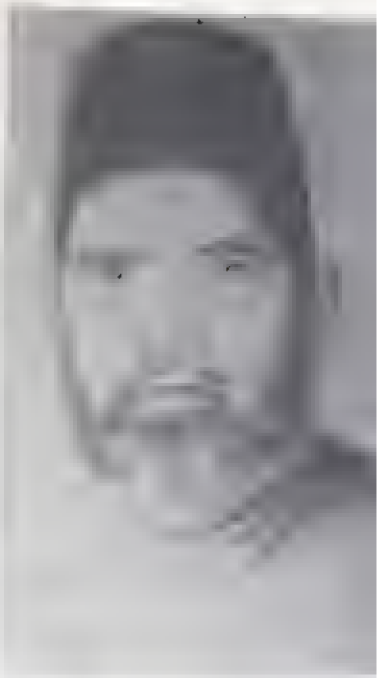
سر عبد القادر مرحوم



مولانا ظفر علی خاں



مہاراجا کشن پرشاد شاد



مولانا احسن مارہروی



باباے اُردو اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی



سید مختار احمد



سید وقار احمد مرحوم ایڈیٹر "نظام گزٹ"



محمد حبیب اللہ رشدی

سنہ ۱۹۲۰ء کی ایک تصویر



دائیں سے بائیں (کرسیوں پر) ۵ ۔ سر راس مسعود ۔ ۶ ۔ نواب مہدی یار جنگ ۔ ۱۰ ۔ عظمت اللہ خاں
زمین پر بیٹھے ہوئے داہنی طرف، پہلے نمبر پر مولوی میر سعادت علی تشریف فرما ہیں ۔

—— (۱) ——

وفات سے پہلے مولوی عبدالحق کی علالت کی اطلاعیں مل رہی تھیں۔ ہر چند ان اطلاعوں سے مرض کے مہلک ہونے ہی کا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا مگر وفات کی خبر پر مجھے ان کی وفات کا یقین نہیں آتا تھا۔ بیس پچیس برس سے میرے دل میں یہ خیال جم سا گیا تھا کہ مولوی صاحب کبھی نہیں مریں گے۔ یعنی کم از کم میری زندگی میں نہیں مریں گے۔

مولوی صاحب کی وفات سے کچھ مدت پہلے (غالباً ۱۹۵۷ء میں) ایک روز میں نے صبح صبح اخبار میں یہ اطلاع دیکھی کہ اس روز راجہ صاحب محمود آباد کراچی یونیورسٹی میں قائداعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی پر تقریر فرمائیں گے۔ راجہ صاحب سے مجھے ایک طرح کی عقیدت ہے اگرچہ میں رسماً ان سے متعارف نہیں ہوں۔ خبر پڑھ کر خیال ہوا کہ راجہ صاحب کی صورت دیکھے، اُن کی گفتگو سُنے برسوں ہو گئے۔ یہ تقریر ضرور سنوں۔ میں تیار ہونے لگا۔ میرے منجھلے لڑکے کو مضمون نگاری کا شوق پیدا ہو چلا تھا۔ میرا ارادہ معلوم کر کے ملتجی نگاہوں سے کہنے لگا، بابا ہمیں بھی لے چلیے۔ میں نے اسے ساتھ لے لیا۔ اُن دنوں کراچی یونیورسٹی، انجمن ترقی اُردو کے دفتر کے قریب کی عمارتوں میں تھی۔ ہم وہاں پہنچے۔ دیکھا کہ طلبہ اور اساتذہ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ جلسے کے کہیں آثار نہیں پائے جاتے۔ یونیورسٹی کے کارکنوں سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ہاں راجہ صاحب کی تقریر ہونے والی تو ہے مگر کب اور کس جگہ؟ یہ کوئی نہیں بتاتا تھا۔ اندازہ ہوا کہ جلسے کے انتظام میں گھنٹے دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ اتنی دیر کیا کریں؟ یکایک خیال آیا کہ انجمن کا دفتر یاس ہی ہے کیوں نہ اپنے لڑکے کو مولوی صاحب کی زیارت کرا دوں۔ اس وقت غالباً میرے تحت الشعور میں وہی تیقن موجود ہو گا کہ مولوی صاحب کبھی نہیں مریں گے۔ اس لیے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ مولوی صاحب سے یہ لڑکا مل لے۔ وہ اس کو دیکھ لیں۔ ممکن ہے میرے بعد کسی وقت اس کو مولوی صاحب کی مدد کی ضرورت پڑ جائے۔

ہم دونوں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولوی صاحب دفتر انجمن کی سب سے اونچی منزل میں اپنے کمرے کے سامنے دھوپ میں تشریف فرما تھے۔ میں نے لڑکے کا تعارف کیا اور کہا "اسے کچھ اردو ادب سے لگاؤ پیدا ہو چلا ہے۔ مضامین لکھتا ہے اس لیے آپ کی خدمت میں لایا ہوں کہ بابائے اردو کی زیارت کرلے" مسکرا کر فرمایا "کیوں نہ ہو، آخر آپ کا لڑکا ہے"۔ یہ فقرہ رسمی خوش اخلاقی کے لہجے میں ادا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کچھ اداس سے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی گہری فکر میں ہیں۔ پاؤں پر ورم نظر آتا تھا۔ مجھے اور زیادہ بیٹھنا مناسب نہیں معلوم ہوا، ہم دونوں جلد ہی اٹھ آئے غالباً یہی میری آخری ملاقات تھی۔

مولوی صاحب میرے ہی بزرگ نہیں تھے بلکہ میرے بزرگوں کے بھی بزرگ تھے۔ اُن کے اصل ہم عصر تو خدا جانے کب کے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں گے۔ اس نسل کے بعد کی نسل والے بھی اب گنتی کے چند بزرگ رہ گئے ہیں۔ مجھ میں اور مولوی صاحب میں اتنا فصل ہے کہ میں نے طالب علمی ختم کی اور مولوی صاحب نے اپنی سرکاری ملازمت ختم کر کے پنشن لی۔ یعنی مولوی صاحب کے آرام لینے کا زمانہ شروع ہوا اور میں نے کشمکش کے دور میں قدم رکھا۔ اب مولوی صاحب کی وفات ایسے زمانے میں ہوئی ہے کہ میرے وہ ساتھی جو سرکاری ملازمت میں منسلک تھے پنشن لے کر آرام لینے کے دور میں آچکے ہیں اور بوڑھے کہلاتے ہیں۔

(۲)

مولوی صاحب کی عمر کا ایک بڑا حصہ بلکہ بہترین حصہ حیدرآباد دکن میں گزرا۔ ایک گمنام نوجوان کی حیثیت سے حیدرآباد گئے اور تیس چالیس سال کے بعد کل ہند شہرت کے مالک بن کر حیدرآباد سے لوٹے۔ غالباً ۱۹۱۹ء سے میرے کانوں میں مولوی عبدالحق کا نام گونجتا رہا تھا، اس زمانے میں وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کے ناظم تھے لیکن میں نے انھیں ۱۹۲۳ء تک دیکھا بھی نہیں تھا۔ اگر دیکھا بھی ہوگا تو ذہن پر اتنا گہرا نقش نہیں بیٹھا کہ قائم رہتا۔ میں عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ہمارے اردو کے پروفیسر مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی تھے جو شاید سارے ہندوستان میں اردو کے اولین پروفیسر تھے اس لیے کہ عثمانیہ یونیورسٹی سے پہلے کسی یونیورسٹی میں اردو ادب کی "کرسی" نہیں ہوا کرتی تھی۔ پروفیسر سلیم فرماتے تھے کہ وہ سرسید مرحوم کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ ان کے "لٹریری اسسٹنٹ" (معاونِ ادبی) رہ چکے تھے (اگرچہ یہ کبھی نہیں بتایا کہ وہ سرسید مرحوم تک پہنچے کیسے۔ لیکن ہم نے امکانات سے یہ قیاس قائم کرلیا تھا کہ وہ بھی مولانا حالی مرحوم کے کرمِ عام کا نتیجہ ہوگا)۔ مولوی عبدالحق سرسید مرحوم کے چہیتے طالب علم تھے۔ اس لیے ان دونوں بزرگوں میں اسی زمانے کی شناسائی ہوگی۔ پروفیسر سلیم مرحوم کئی برس تک مسلم گزٹ لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔ مولوی سید سلیمان کے رسالہ معارف سے مدتوں پہلے "معارف" نام کا ایک ادبی رسالہ نکال چکے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے کچھ پہلے مولوی عبدالحق نے انھیں سوا یا ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر دکن میں بلا لیا تھا۔ پروفیسر سلیم نے انجمن ترقی اردو کے لیے وضعِ اصطلاحات کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کو انجمن نے شائع کیا۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو پروفیسر سلیم اردو کی اسسٹنٹ پروفیسری پر مامور کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس تقرر میں مولوی عبدالحق کے سوا اور کس کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ پروفیسر سلیم کے حسد کے تیروں سے کوئی نہیں بچا تھا۔

صرف دو آدمی مستثنیٰ تھے۔ ایک مولوی حالی اور دوسرے مولوی عبدالحق۔ مولوی عبدالحق کے احسانات نے پروفیسر سلیم کا منہ بند کر دیا تھا۔ ورنہ ان کی تیغ زبان سے نہ سر اکبر حیدری بچے اور نہ سر تیج کے پوتے سر راس مسعود۔

۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء ہوگا میں بی اے میں تھا کہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں ایک انگریزی کتاب "ڈکشنری آف سمی لیز" (لغت تشبیہات) میرے ہاتھ لگی۔ یونیورسٹی کا ابتدائی زمانہ تھا، کتب خانے کے لیے آئے دن ڈھیروں کتابیں آتی رہتی تھیں مگر مستقل لائبریرین کا تقرر نہ ہوا تھا۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم کے لائبریرین بننے کے امکانات تھے اور غالباً مولوی عبدالحق صاحب ہی کے بلانے پر وہ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اس وقت شعرالعجم پر ان کے تنقیدی مضامین کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ مجھے پروفیسر سلیم نے ان انھیں دیکھنے اور اُن کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ انھیں مرحوم کی زبان سے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ وہ بیرسٹر تھے۔ علوم شرقیہ کا مطالعہ ان کے ذاتی شوق کا نتیجہ تھا جس میں انھوں نے کمال حاصل کیا تھا۔ سنا تھا کہ ارباب یونیورسٹی اُن کے مطالبے کے مطابق تنخواہ دینے پر راضی نہ تھے۔ وہ واپس چلے گئے۔ لائبریری کی نگرانی تلنگی زبان کے پروفیسر ستارا و صاحب کے ذمے تھی۔ وہ ٹیگور کے مدرسہ شانتی نکیتن کے تعلیم یافتہ تھے۔ تلنگی زبان کے شاعر تھے۔ رباعیات عمر خیام کا تلنگی میں ترجمہ کر چکے تھے، لیکن لائبریری کے کام سے واقف نہیں تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے لائبریری میں آتے اور صرف "نگرانی" کر کے چلے جاتے۔ سارا کام ایک آفس کلرک کیا کرتا تھا۔ کتابوں کی ترتیب و تنظیم کا یہ حال تھا کہ مشہور عالم مستشرق ای۔ جے۔ ڈبلیو گب (GIBB) (جس کے سرمائے اور نام سے گب میموریل قائم ہے) کی معرکہ آرا کتاب "ہسٹری آف آٹومن پوئٹری" (تاریخ شعر ترکی) کی چاروں جلدیں شعبۂ تاریخ کی ایک الماری میں رکھی ہوئی تھیں اس لیے کہ کتاب کا نام ہی لفظ "ہسٹری" (تاریخ) سے شروع ہوتا ہے۔ اَدب کے کسی طالب علم یا پروفیسر کو اس کا علم ہی نہیں تھا کہ یہ کتاب کتب خانے میں موجود ہے۔ کتب خانے کی اس افراتفری سے ہم چند طالب علم بہت فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ گب کی اس کتاب کی پہلی جلد سے جو عربی، فارسی، ترکی کے مشترکہ علم بیان، عروض وغیرہ پر نہایت کاوش سے لکھی گئی ہے۔ میں نے مہینوں فائدہ اٹھایا اس لیے کہ اس کی کوئی مانگ نہ شعبۂ تاریخ سے آتی تھی اور نہ شعبۂ اَدب سے۔

غرض تشبیہات کا لغت بھی کسی الماری کی زینت تھا۔ میں اسے اپنے نام دَرج کرا کے لے گیا۔ دیکھا کہ مؤلف نے بڑی محنت سے ان تشبیہوں اور استعاروں کو جنھیں انگریز شعرا نے استعمال کیا ہے، نظائر کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ میں نے وہ کتاب پروفیسر سلیم کو دکھائی۔ انھیں بےحد پسند آئی کہا "تم اس کو اُردو میں ترجمہ کر دو۔ اُردو والے ان تشبیہوں سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میں انجمن ترقی اردو سے اس کی اشاعت کا انتظام کرا دوں گا" واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ تشبیہوں کے بادشاہ حضرت جوشؔ ملیح آبادی ابھی حیدرآباد نہیں آئے تھے اور نہ اس وقت تک تشبیہوں کا خزانہ ان کے ہاتھ لگا تھا جسے وہ چند سال کے بعد اُردو اَدب میں بے دریغ لٹانے لگے۔ غرض میں نے پہلے کچھ نمونہ تیار کیا اور پروفیسر سلیم کو دکھایا اور پھر پوری کتاب کے ترجمے پر کمر باندھ لی۔ اس بات کے کچھ دنوں کے بعد طویل تعطیلیں آگئیں۔ پروفیسر سلیم اورنگ آباد کی طرف سے شمالی ہند جانے لگے یا شاید اس وقت صرف اورنگ آباد ہی کا پروگرام تھا۔ چلتے وقت بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ "ان تعطیلوں میں بمبئی کے کسی کتب فروش کو خط لکھ کر یہ کتاب منگوا لو۔ میں

مولوی عبدالحق سے اس کی اشاعت کا مسئلہ طے کرلوں گا۔ لیکن مولوی صاحب سے گفت و شنید کے بعد پروفیسر سلیم نے مجھے مطلع فرمایا کہ مولوی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ان انگریزی تشبیہوں کے علاوہ اُردو شعرا نے جو تشبیہیں استعمال کی ہیں، انھیں بھی جمع کر کے اس میں شامل کیا جائے تب انجمن اس کتاب کو شائع کرے گی۔

طالب علم کا پہلا فرض اپنی تعلیم کی تکمیل کرنا اور بطور ثبوت امتحانات میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ میرے لیے تو اس ضخیم کتاب کا ترجمہ ہی بار تھا بلکہ میری تعلیم میں نقصان کا باعث تھا۔ چہ جائیکہ سارے اُردو شعراؔ کے کلام سے تشبیہوں اور استعاروں کو تلاش کر کے جمع کروں —— اور پھر، کیا یہ کام اتنا آسان اور مختصر تھا کہ ایک طالب علم اس کو انجام دے دیتا؟ میں نے تو دست بستہ معافی چاہی پروفیسر سلیم کو میرے عذرات معقول معلوم ہوئے ہوں گے اس لیے انھوں نے کوئی اصرار نہیں کیا اور نہ پھر کبھی اس کا ذکر ہی چھیڑا۔ رفتہ رفتہ میں مولوی عبدالحق صاحب سے اچھی طرح روشناس ہوتا گیا۔

—— (۳) ——

مولوی عبدالحق نے ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ بمبئی میں لیڈی حیدری کے والد انھیں کام سکھاتے تھے۔ لیڈی حیدری کا خاندان بمبئی کے نہایت روشن خیال سلیمانی بوہروں کا خاندان تھا جو جدید تعلیم اور تحریک علی گڑھ کا حامی تھا۔ اس خاندان کے ایک مشہور بزرگ جسٹس بدرالدین طیب جی تھے جو بمبئی ہائیکورٹ کے غالباً اولین مسلمان جج تھے جس وقت مولوی صاحب نے وہ فقرہ فرمایا تھا، یہ پوچھنے کا موقع نہیں تھا کہ انھوں نے کس قسم کا کام سکھایا؟ آیا تجارت کا عملی کام، یا کاروبار کا دفتری کام۔ مگر خیال ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا وہ زمانہ کچھ اچھا نہیں گزرا ہوگا۔ بیسیوں مرتبہ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر رہنے کا، اور ان کی گفتگو سننے کا اتفاق ہوا مگر اس ایک فقرے کے سوا، بمبئی میں ان کے قیام کا کوئی اور تذکرہ یا حوالہ میں نے نہیں سنا۔ بڑے آدمیوں کی ابتدائی زندگی کی کشمکش کا حال نوجوانوں کے لیے بڑا سبق آموز ہوتا ہے۔ کاش مولوی صاحب اس دور کے کچھ اور حالات بھی سناتے۔

بمبئی کے بعض روشن خیال مسلمان تاجر، علی گڑھ کالج سے بہت متاثر تھے اور کالج کے لیے دل کھول کر چندہ دیا کرتے تھے۔ ہر سال کالج کے طلبہ کا کوئی نہ کوئی وفد کسی پروفیسر کے ساتھ بمبئی جاتا تھا اور چندہ وصول کر لاتا تھا۔ اس زمانے کا یہ قصہ بہت مشہور تھا جو میرے ایک "علیگ" دوست سید انیس الدین مرحوم ایڈوکیٹ ضلع بیڑ نے سنایا تھا، کہ علی گڑھ کالج کا ایک وفد بمبئی کے ایک مسلمان تاجر کے ہاں چندے کے لیے پہنچا۔ اس نے ایک بڑی رقم چندے میں دی اور ایک ایک طالب علم سے پوچھا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیا پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ ہر ایک نے اپنا مقصد ملازمت ہی بتایا۔ تاجر نے تعجب سے کہا کہ اتنی اچھی تعلیم پانے کے بعد کوئی بھی طالب علم تجارت کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ طلبہ نے کہا — تجارت کے لیے ہمارے پاس سرمایہ نہیں ہے —— سرمایہ نہ ہونے کے عذر پر اس نے کہا — "میاں، میں بہت غریب خاندان کا لڑکا تھا۔ یہاں کے ایک ہوٹل میں جھاڑو دینے اور برتن دھونے پر نوکر تھا۔ ایک دن راستے میں مجھے بگھی کے گھوڑے کا ایک ٹوٹا ہوا نعل پڑا مل گیا۔ میں نے وہ اٹھا لیا اور ایک نعل بند کو دیا۔ اس نے مجھے دو پیسے اس کی قیمت دی۔ اب راستہ چلتے ہوئے میری آنکھیں سڑک پر نعل تلاش کرنے لگیں۔ جتنے نعل مل جاتے، میں نعل بند کو دے دیتا، دو دو پیسے

نی نعل مجھے مل جاتی۔ چند روز کے بعد میں نے ہوٹل کی نوکری چھوڑ دی۔ گلے میں ایک جھولی ڈالے سارا دن نعلوں کی تلاش میں بمبئی کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ جھولی بھر بھر کر نعل جمع کرتا اور نعل بندوں کو بیچ دیتا۔ چند روز کے بعد اتنے پیسے ہو گئے کہ میں نے دوسرا کام شروع کیا۔ اس کے بعد کاروبار کے نئے نئے راستے سوجھنے لگے۔ یہ میرا سارا کاروبار اور ساری جائداد انھی نعلوں کی کمائی کا نتیجہ ہے۔"

ممکن ہے اسی قسم کے کسی عزم کے ساتھ مولوی صاحب بی اے کرنے کے بعد بمبئی گئے ہوں، اور سرسید مرحوم کی سفارش پر لیڈی حیدری کے والد سے ملے ہوں اور انھوں نے اپنے ہاں انھیں تجارتی کام پر لگایا ہو۔ لیکن کچھ مدت کے تجربے کے بعد مولوی صاحب نے یہ محسوس کیا ہو کہ یہ کام ان کی دلچسپی کا نہیں ہے۔

مولوی عبدالحق کے متعلق اب تک بیسیوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں چند ہی مضامین میں مولوی صاحب کی ابتدائی زندگی کے کچھ منتشر حالات بیان ہوئے ہیں۔ مگر مجھے کسی مضمون سے اس کا پتا نہیں چلا کہ مولوی صاحب حیدرآباد کس سنہ میں گئے۔ ۲۳-۲۵ فروری ۱۹۴۵ء میں مولوی صاحب نے بمبئی کی اردو کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ اس کانفرنس میں انھوں نے بمبئی کے اُردو جرائد کے سلسلے میں کہا تھا:-

> "کشف الاخبار ۱۸۵۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ جب میں ۱۸۹۵ء میں یہاں آیا تھا تو اس وقت بھی جاری تھا، اور میں اس کے ایڈیٹر سے ملا تھا۔"

اس سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۹۴ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں مولوی صاحب بمبئی گئے تھے۔ وہاں کب تک ٹھیرے اور کب حیدرآباد گئے؟ یہ مسئلہ حل طلب ہے۔

مولوی صاحب کے قدیم دوست محمد امین زبیری مرحوم کے ماموں زاد بھائی محمد حسین خاں زبیری کا ایک مضمون قومی زبان کے بابائے اُردو نمبر بابتہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں:-

> "انیسویں صدی کے آخری عشرے میں نواب محسن الملک سال کے بیشتر حصے میں بمبئی میں رہا کرتے تھے۔ ایک اپنی صحت کی درستی کے لیے اور دوسرے علی گڑھ تحریک کو بمبئی کے دولت مند طبقے میں مقبول بنانے کے لیے۔ اسی زمانے میں مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں اور میرے پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد امین زبیری، نواب صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ان اصحاب ثلاثہ کو مختلف خدمات سپرد تھیں۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ یہ شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اوّل الذکر دونوں حضرات نے حیدرآباد دکن کا رُخ کیا اور زبیری صاحب بھوپال پہنچ گئے۔"

ظاہر ہے کہ یہ باتیں مضمون نگار صاحب نے مولوی محمد امین زبیری مرحوم سے سنی ہوں گی۔ مگر انھوں نے اس واقعے کے سنہ کو متعین نہیں کیا "آخری عشرے" سے یہ مدت دس سال تک ممتد ہو جاتی ہے۔

مولوی عبدالحق کے چھوٹے بھائی جناب شیخ احمد حسن کا ایک نہایت مفید مضمون "ابدی بھائی" رسالہ اُردو کے بابائے اُردو نمبر بابت ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:-

" بی اے پاس کرنے کے بعد سرسید کے ایما پر نواب محسن الملک نے اپنے خط کے ساتھ حیدر آباد روانہ کر دیا، جہاں اس زمانے میں نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرحوم فینانس منسٹر تھے۔ کچھ ہی روز کے بعد ایک دن جب نواب افسر الملک بہادر کمانڈر انچیف، نواب وقار الملک سے ملنے تشریف لائے اور بھائی صاحب کو دیکھا تو ان کے متعلق دریافت کیا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ علی گڑھ سے نواب محسن الملک کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ بی۔اے پاس اور اچھے ادیب ہیں، کمانڈر انچیف بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں نے مدرسۂ آصفیہ قائم کیا ہے۔ اس کی ہیڈ ماسٹری کے لیے مناسب شخص کی تلاش میں تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ میری منشا و خواہش کے مطابق یہ مل گئے۔ لہٰذا بھائی صاحب کا تقرر بہ عہدۂ ہیڈ ماسٹری آصفیہ اسکول ہو گیا۔

انھوں نے ۱۸۹۷ء میں راقم الحروف کو بغرض تعلیم اپنے پاس حیدر آباد بلا لیا، اور مدرسۂ آصفیہ میں داخل کرا دیا فرصت کے اوقات میں خود بھی پڑھاتے رہے۔ چھ سال تک میں ان کے پاس رہا۔"

اس بیان سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق علی گڑھ سے سیدھے حیدر آباد پہنچے۔ ان کے بمبئی جانے اور وہاں ظفر علی خان، اور محمد امین زبیری کے ساتھ نواب محسن الملک سے وابستہ رہنے کا اشارہ تک نہیں ملتا گویا اس سے محمد حسین خان زبیری کے مذکورہ بالا بیان کی کوئی تائید نہیں ہوتی۔

لیکن مولوی صاحب کے اپنے بیان سے یہ ثابت ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء میں بمبئی گئے تھے۔ جناب احمد حسن صاحب نے بھی یہ واضح نہیں کیا کہ مولوی صاحب حیدر آباد کس سنہ میں گئے۔ البتہ ۱۸۹۷ء میں مولوی صاحب کا مدرسۂ آصفیہ کا ہیڈ ماسٹر بن جانا ثابت ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مولوی عبدالحق کے قیام بمبئی کے زمانے میں جناب احمد حسن صاحب ساتھ نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ کم عمر تھے، اسکول میں پڑھتے تھے اس لیے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ مولوی صاحب کے حیدر آباد پہنچنے سے پہلے کے حالات کا بھی انھیں علم ہوتا۔

میں نے حیدر آباد میں معتبر لوگوں سے یہ سنا تھا کہ مولوی عبدالحق سے پہلے ظفر علی خاں مدرسۂ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب وہ ہوم سیکریٹری کے دفتر میں مترجم بن کر چلے گئے تو مولوی عبدالحق مدرسہ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے۔ اس وقت پروفیسر محمود احمد خاں ہی ایک ایسے شخص ہیں جو اپنی خاندانی یادداشتوں کی چھان بین کر کے یہ بتا سکتے ہیں کہ ظفر علی خاں مدرسہ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر رہے بھی یا نہیں۔ اس سے ان دونوں بزرگوں کی سوانح عمریوں کا ایک واقعہ صحیح طور پر متعین ہو جائے گا۔

میرے ایک دوست کے ایک معمر عزیز کسی دفتر میں کلرک تھے ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں جب کہ مولوی صاحب کی شہرت عروج پر تھی، ایک عید کے موقع پر میرے دوست عید کی ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ مولوی عبدالحق کا نام لیا۔ مجھے اس وقت کچھ ناگوار سا گزرا، اس لیے کہ یہ بزرگ علمی آدمی نہیں تھے۔ ان سے ہم لوگ یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ وہ مولوی صاحب کا علمی مرتبہ پہچانتے ہوں۔ ان کی زبان سے مولوی صاحب کا ذکر اس انداز سے سن کر حیرت ہونا قدرتی بات تھی۔ میں نے ان سے پوچھا " کیا آپ مولوی عبدالحق کو جانتے ہیں ؟" انھوں نے کہا۔ جاننے کی ایک ہی رہی، میں

اور وہ بریگیڈ آفس میں ملازم تھے، ان صاحب کو غلط بیانی کرنے کی کوئی وجہ تھی، اور نہ وہ مولوی عبدالحق سے اپنا قدیم تعلق ظاہر کرکے کوئی تفوق حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے میں اُن کے اس بیان کو اُس وقت بھی صحیح سمجھتا تھا اور اب بھی صحیح مانتا ہوں، اِلّا اس کے کہ اس کے خلاف کوئی اور شہادت مل جائے۔

ان معلومات کی بنا پر میں مولوی صاحب کے حیدرآباد جانے کے واقعات اس طرح جوڑ سکتا ہوں:۔

مولوی صاحب ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد وطن گئے۔ وہاں والدہ کے اصرار سے ان کی شادی کا مرحلہ ان کی مرضی کے خلاف طے ہوا۔ وہ کسی بات پر ناراض ہوکر گھر سے بمبئی پہنچے۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ گھر سے سیدھے بمبئی نہ پہنچے ہوں بلکہ علی گڑھ گئے ہوں اور وہاں سرسید سے تعارفی خطوط لے کر بمبئی گئے ہوں۔ ابتدا میں کاروبار میں حصّہ لینے کے مقصد سے لیڈی حیدری کے والد سے کام سیکھنا شروع کیا ہو۔ لیکن اس کام سے دلچسپی پیدا نہ ہوئی ہو۔ اتفاق سے محسن الملک بمبئی آئے ہوں اس پر مولوی صاحب سرسید کے سفارشی خط کے ساتھ ان سے ملے ہوں۔ یہ ملحوظ رہے کہ اسی زمانے میں غالباً ۱۸۹۴ء میں محسن الملک ایک بڑی سازشی کارروائی کے بعد حیدرآباد سے شہر بدر کیے گئے تھے لیکن انھیں آٹھ سو روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ عین امکان ہے کہ وہ حیدرآباد سے سیدھے شمالی ہند جانے کے بجائے بمبئی چلے گئے ہوں اور حیدرآباد واپس بلالیے جانے کی تگ و دو میں مصروف ہوں۔ ۱۸۹۵ء میں مولوی چراغ علی علاج کی غرض سے حیدرآباد سے بمبئی گئے تھے لیکن جانبر نہ ہوسکے تھے اور وہیں وفات پائی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ان دنوں مولوی صاحب نے محسن الملک کے ہاں انگریزی خط وکتابت وغیرہ کا کام انجام دیا ہو۔ اس سلسلے میں مولوی محمد امین زبیری اور ظفر علی خاں کا ساتھ رہا ہو۔ ظفر علی خاں اور مولوی عبدالحق دونوں کو محسن الملک نے ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد کے دوستوں کے نام سفارشی خط دیئے ہوں۔ ان سفارشی خطوط کی بنا پر وقارالملک مولوی مشتاق حسین نے افسر جنگ سے متعارف کرایا ہو جس پر افسر جنگ نے ظفر علی خان کو مدرسہ آصفیہ کا ہیڈ ماسٹر بنایا اور مولوی عبدالحق کو بریگیڈ آفس میں جگہ دی ہو۔ سال چھ مہینے کے بعد ظفر علی خاں کو ہوم آفس کی مترجمی مل گئی اور مولوی عبدالحق ۱۸۹۷ء میں مدرسہ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر بنا دیئے گئے۔

مولوی محب حسین بریگیڈ آفس میں مترجم تھے۔ ۱۸۹۷ء سے ان کے اہتمام سے رسالہ افسر شائع ہونے لگا۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں مولوی صاحب رسالہ افسر کے ایڈیٹر نام زد ہوئے مگر جنوری ۱۹۰۰ء سے رسالہ افسر نئے انداز میں مولوی عبدالحق کی باقاعدہ ادارت میں شائع ہونے لگا۔

—— (۴) ——

ریاست حیدرآباد کی اصل فوج مغلیہ طرز کی تھی۔ انگریزوں کے اقتدار کے بعد یہ خیال پیدا ہونا فطری تھا کہ ریاست میں انگریزی طرز کی فوج بھی تیار کی جائے۔ نظام الملک دوم۔ نظام علی خاں کے زمانے میں یورپی وضع کی ایک فوج مرتب کی گئی تھی اس کا افسر ایک فرانسیسی شخص موسیو ریماں تھا جس کا مقبرہ حیدرآباد میں ہے۔ (اس نام کو حیدرآباد میں دو لباس پہنائے گئے۔ اسلامی لباس میں وہ "موسیٰ رحمو" بنا اور ہندو لباس میں "موسیٰ رام" اور اس کا مقبرہ جو ایک ٹیلے پر ہے "موسیٰ رحمو کی ٹیکری" اور کبھی "موسیٰ رام کی ٹیکری"

کہلاتا ہے۔ یہ مقبرہ مدرسہ آصفیہ کے قریب ہے) موسیو ریماں کے بعد وہ فوج کس مپرسی کی حالت میں رہی۔ یہاں تک کہ حضور نظام ششم میر محبوب علی خاں کا زمانہ آیا۔ سر سالار جنگ میر محبوب علی خاں کے دادا ناصر الدولہ کے زمانے میں ریاست کے دیوان یعنی وزیر اعظم بنے تھے۔ ناصر الدولہ کے بعد ان کے بیٹے افضل الدولہ نے سات آٹھ سال ہی حکومت کی۔ افضل الدولہ کی وفات کے وقت ان کے بیٹے میر محبوب علی خاں دو ڈھائی سال کے تھے۔ سالار جنگ وزیر اعظم تو تھے ہی اب، ایک امیر پائیگاہ کی شرکت میں "نائب السلطنت" (ریجنٹ) بھی بنا دیئے گئے۔ امیر پائیگاہ کے انتقال کے بعد سالار جنگ تنہا "نائب السلطنت" رہ گئے۔ گویا وہ وزیر اعظم بھی تھے اور ریاست کے پورے حکمراں بھی۔ انگریز حکومت نے ان کے لیے توپوں کی سلامی مقرر کی تھی جو اس زمانے میں ایک واحد نظیر تھی کئی سال کے بعد ۱۹۱۲ء میں سر آغا خان مرحوم کو بھی جارج پنجم نے گیارہ توپوں کی سلامی منظور کی تھی۔

سر سالار جنگ نے کم سن تاجدار دکن میر محبوب علی خاں کی تعلیم و تربیت کے لیے دو ایک انگریز استادوں کے علاوہ مشرقی علوم کی تعلیم کے لیے مولوی انوار اللہ خاں (نواب فضیلت جنگ) سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) آغا میرزا بیگ (نواب سرور الملک) کو بھی مقرر کیا تھا۔ ان لوگوں کے علاوہ ملک کے مشہور چابک سوار ٹیپو خاں کو شہسواری سکھانے کے لیے اور انگریزی فوج کے ایک نان کمشنڈ آفیسر کو جو فوجی کرتبوں میں بھی مہارت رکھتے تھے، ورزش جسمانی اور فوجی تربیت کے لیے مقرر کیا۔ اس فوجی معلّم کو حضور مرحوم نے اختیارات حکومت مل جانے کے بعد (یعنی ۱۸۸۴ء کے بعد) افسر جنگ کا خطاب دیا اور انگریزی نمونے کی فوج بھرتی کرنے اور اس کی تنظیم وغیرہ کی پوری ذمہ داری ان کے حوالے کردی۔ یہ فوج "امپیریل سروس ٹروپس" (یعنی انگریز حکومت کی خدمت گزار فوج) کہلاتی تھی۔ عوام میں اس کو "فوج باقاعدہ" کہا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مغلیہ طرز کی قدیم فوج "فوج بے قاعدہ" کہی جاتی تھی۔ افسر جنگ (افسر الدولہ، افسر الملک) فوج باقاعدہ کے "کمانڈر انچیف" تھے۔ شاید یہ فوج ابتدا میں ایک ہی بریگیڈ پر مشتمل تھی اس لیے اس کا صدر دفتر "بریگیڈ آفس" کہلاتا تھا۔

افسر جنگ اور ان کا خاندان علی گڑھ تحریک کے حامیوں میں تھا۔ فوج کی افسری کے امیدواروں (کیڈٹ) کے انتخاب میں کئی سال تک افسر جنگ علی گڑھ کے طلبہ کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ افسر جنگ کے ایک داماد نواب ممتاز یار الدولہ تھے جو لڑکپن میں مرحوم نظام میر محبوب علی خاں کے ہم درس تھے۔ اس ہم درسی کی ایک دلچسپ وجہ نواب سرور الملک نے اپنی سوانح حیات "کارنامۂ سروری" میں بیان کی ہے کہ حضور مرحوم، لڑکپن کی وجہ سے کبھی کبھی پڑھنے سے جی چراتے تھے یا شرارت کرتے تھے۔ ان کی تخویف و تادیب کے لیے استادوں نے یہ ترکیب سوچی کہ کسی متوسط گھرانے کے لڑکے کو حضور مرحوم کا ہم درس بنایا جائے، اور جب کبھی حضور کی تادیب کی ضرورت پڑے اس لڑکے کی پٹائی کردی جائے۔ سرور الملک کہتے ہیں کہ انگلستان کے شہزادوں اور بڑے امیروں کے لڑکوں کی تعلیم میں ان کے درس میں ایسے ہی لڑکے شریک کیے جاتے تھے جن کی پٹائی کی جا سکتی تھی ایسے لڑکوں کو (Whipping Boys) "وہپنگ بوائے" کہا جاتا تھا۔ غالباً یہ تجویز انگریز استادوں نے پیش کی ہوگی۔ غرض، نواب ممتاز یار الدولہ (ممتاز یار جنگ) "وہپنگ بوائے" کی حیثیت سے حضور محبوب علی خاں کے ہم درس کیے گئے تھے۔ بڑے ہونے کے بعد وہ فوج میں

ملازم ہوتے، افسر جنگ کے داماد بنے اور ترقی کر کے میجر کے عہدے تک پہنچے جو اس زمانے میں فوج کا بڑا عہدہ تھا۔ کرنلوں اور جرنلوں کی اتنی کثرت نہیں تھی جو دوسری جنگ کے بعد سے نظر آ رہی ہے۔

ممتاز یار الدولہ نے بڑی عمر پائی۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کو بھی، دو ایک ہم پیشہ مدیران جرائد کے ساتھ ان کی ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ اگرچہ ذہنی اعتبار سے کچھ نمایاں شخصیت نہیں رکھتے تھے، مگر تعلیم کو پھیلانے کا شوق، خبط کی حدوں کو چھوتا تھا۔ ان کا یہی مبارک جذبہ تھا جس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں ان کا احترام اور عقیدت تھی۔ حضور نظام میر محبوب علی خاں کے ہم سبق سپہ سالار وقت کے داماد اور خود فوج کے ایک بڑے افسر ہونے کی وجہ سے، انیسویں صدی کے ربع آخر میں حیدرآباد میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اپنے اس اثر و رسوخ سے کام لے کر انھوں نے یا خود افسر جنگ نے شہر سے پانچ سات میل دور ایک بہت بڑا رقبۂ زمین حاصل کر کے ایک اقامتی مدرسہ **"مدرسۂ آصفیہ"** کے نام سے قائم کیا۔ ابتدا میں غالباً یہ مدرسہ فوج کے ملازموں کی اولاد کے لیے مخصوص ہوگا مگر بعد میں عام مدرسہ قرار دیا گیا تھا اس مدرسے کو ترقی دینے کی انھیں ایسی آرزو تھی کہ اس کو "مدرسہ آصفیہ" کے بجائے "آصفیہ یونیورسٹی" دیکھنا چاہتے تھے اگرچہ وہ بدنصیب مدرسہ پچیس تیس برس تک مڈل اسکول سے بڑھ کر ہائی اسکول نہ بن سکا۔ آخری زمانے میں نواب ممتاز یار الدولہ کو خوش کرنے کا "تیر بہدف" نسخہ یہ بتایا جاتا تھا کہ انھیں "دکن کا سر سید" کہہ دیا جائے۔ نواب مرحوم کو اپنے مدرسے کو ترقی دینے کی دلی آرزو تھی مگر ترقی کے وسائل اور اصول کو توڑنے میں خود کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہم لوگوں کا ان کے متعلق یہ خیال تھا کہ مدرسے کے معاملے میں ان کی حالت ایسی گنوار ماں کی سی تھی جو اپنے بیمار بیٹے کو وفور محبت میں خود ہی ہر طرح کی بدپرہیزی کراتی ہو اور خود ہی اس کی بیماری پہ واویلا مچاتی ہو۔

—— (۵) ——

"مدرسہ آصفیہ" کی ہیڈ ماسٹری پر مولوی عبدالحق دس بارہ برس رہے۔ اسی دور میں وہ حیدرآباد کے علمی حلقوں میں روشناس ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے خاص احباب میں حکیم امتیاز الدین مرحوم قابل ذکر ہیں۔ حکیم امتیاز الدین صاحب حکیم اجمل خاں کے ہم درس رہ چکے تھے۔ یہ مشہور تھا کہ حیدرآباد سے کوئی مریض حکیم اجمل خاں کے ہاں دلی جاتا تو حکیم صاحب ناراض ہو کر پوچھتے کہ کیا حیدرآباد میں امتیاز الدین مر گیا ہے جو تم یہاں آتے ہو۔ حیدرآباد میں طب یونانی کا ایک مستقل محکمہ تھا۔ یونانی طب کے محکمے کے سب سے بڑے عہدہ دار کا لقب "افسر الاطبا" تھا جو ڈائرکٹر میڈیکل ڈپارٹمنٹ کے مماثل تھا۔ حکیم امتیاز الدین شہر حیدرآباد کے ایک بڑے سرکاری مطب کے طبیب تھے۔ موجودہ حضور نظام میر عثمان علی خاں کے ہاں بھی ان کی بڑی قدر تھی۔ آخری زمانے میں وہ افسر الاطبا ہو چکے تھے۔ ان کی علمیت ان کے طب پر غالب تھی۔ حیدرآباد کے علمی طبقوں میں حکیم صاحب کی علمیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔

سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ بدشکل آدمی تھا۔ حکیم امتیاز الدین مرحوم کا چہرہ بھی کچھ خوشنما نہیں تھا۔ بڑے تن و توش کے آدمی تھے۔ رنگ سانولا، چہرے کی جلد ناہموار، ناک موٹی سی تھی۔ عمر میں مولوی عبدالحق سے کچھ بڑے ہی ہوں گے۔ جس زمانے میں ہم نے پہلی مرتبہ انھیں دیکھا تھا یعنی ان کی وفات سے پانچ چھ برس قبل ان کی تنخواہ اور خانگی مطب کی آمدنی ہزار روپے ماہوار سے کم نہیں

ہوگی یہ آمدنی اس زمانے کے معیار کے لحاظ سے خاصی بڑی آمدنی تھی۔ موٹر نشین تھے مگر عموماً بازاروں میں پیدل پھرا کرتے تھے جو حیدرآباد کے سے جاگیردارانہ شہر میں سبکی کی بات تھی۔ حکیم صاحب کی یہ اخلاقی جرات تھی کہ کسی کی پروا کیے بغیر جارحانہ انداز میں سادگی اور بے تکلفی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے ہاں دوستی اور ہم نشینی کے لیے امیر غریب کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ ان کی نظر اپنے ملاقاتیوں کی دنیوی حیثیت پر نہیں پڑتی تھی۔ وہ صرف ان کے خلوص کو دیکھا کرتے تھے۔ ان کے بہت سے ہم نشین اور احباب غریب طبقے ہی کے لوگ تھے۔ غریب دوستوں کے گھر بے تکلف چلے جاتے اور گھنٹوں ہنسی مذاق میں گزار دیتے۔ امیروں سے پہلو بچاتے یا رسمی انداز کی گفتگو شروع کر دیتے۔ امیر مریضوں سے، بلا رو رعایت فیس وصول کرتے جو اوّل درجے کے ڈاکٹروں کی فیس سے کم نہیں تھی، لیکن غریبوں کے ہاں بلا فیس جاتے بلکہ بعض اوقات روپے سے مدد کرتے۔ حیدرآباد کے ایک مرحوم عالم سے انھوں نے شاید کچھ علمی فیض اٹھایا تھا یا ویسے ہی ان مرحوم کے علم و فضل سے عقیدت رکھتے تھے۔ ان مرحوم کی لڑکیاں غریب خاندانوں میں بیاہی گئی تھیں۔ ایک لڑکے نے کاروبار سے بڑا روپیہ کمایا تھا۔ ان کی آمدنی ہزار دو ہزار کے قریب تھی۔ حکیم صاحب کبھی ان کے ہاں علاج کے سلسلے میں جاتے تو بہ اصرار فیس طلب کرتے اور کچھ اس قسم کا فقرہ کہتے ــــ" لا، میری فیس نکال، تو تو شہر کو لوٹتا ہے۔ تجھے فیس نہیں معاف کروں گا۔" لیکن اسی بھائی کی کوئی بہن زیر علاج رہتی تو نہ صرف فیس نہیں لیتے تھے بلکہ الٹے اپنے پاس سے کچھ نہ کچھ روپے مریضہ کے سرہانے رکھ کر پھل کھانے کی تاکید کرتے۔ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کے ساتھ حکیم صاحب کا رویہ مختلف تھا۔ اس خاندان کے سب لوگ حکیم صاحب کے اس طرز سے واقف تھے۔

حضور نظام کے ہاں جانا فرائض میں داخل تھا۔ نظام کے محل "کنگ کوٹھی" کا نام انھوں نے اپنی اصطلاح میں "بیت الخلا" رکھ چھوڑا تھا۔ اگر یہ کہنا ہوتا کہ وہ کنگ کوٹھی جا رہے ہیں تو کچھ اس قسم کا فقرہ کہتے ــــ" ذرا بیت الخلا تو ہو آؤں ــــ یا ــــ" میں بیت الخلا جا رہا ہوں۔" مطلب یہ کہ جس طرح آدمی بہ اکراہ بیت الخلا جاتا ہے، اسی طرح انھیں یہ فرض ادا کرنا ہے۔ ان باتوں کے باوجود، حیدرآباد کے اُونچے طبقے پر حکیم صاحب کا بڑا رعب تھا۔ ہر شخص ان سے جھک کر ہی ملتا تھا۔ جن لوگوں کو حکیم صاحب بہت چاہتے تھے، اُن کو "تو" سے مخاطب کرتے اور کبھی کبھی گالیاں بھی بک دیتے تھے۔ گالیاں سننے والے کو ان کی گالیاں ناگوار نہیں گزرتی تھیں بلکہ وہ کچھ تفاخر سا محسوس کرتا کہ میں حکیم صاحب کے دل میں اتنی جگہ پا گیا کہ ان کی گالیوں کا مستحق ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ گالیاں اہانت کے مقصد سے نہیں دی جاتی تھیں یہ حکیم صاحب کے اظہار محبت کا ایک طریقہ تھا۔ غیروں سے وہ حسب مراتب "تم" یا "آپ" سے خطاب کرتے اور متین و سنجیدہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔

کالج کے میرے ایک ہم جماعت حکیم صاحب کے ہاں بہت جایا کرتے تھے۔ شاید ان کے بزرگوں سے حکیم صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے۔ میرے ہم جماعت نے یہ واقعہ سنایا تھا کہ کسی روز وہ حکیم صاحب کے ہاں بیٹھے تھے ایک معزز آدمی جو حکیم صاحب کے زیر علاج تھے، آئے اور سابقہ دوا کے مفید اثرات کا حال بتا کر باقی ماندہ شکایات بیان کیں۔ حکیم صاحب نے مریض کا حال سن کر پرچی پر ابریشم تین چار تولے لکھ کر مریض کو دی۔ ملازم سے دوا کی ایک بوتل منگوائی جس میں کوئی گاڑھا عرق تھا۔ اس دوا کی ایک قلیل مقدار بڑی

احتیاط کے ساتھ ایک کٹوری میں نکالی، کٹوری مریض کو دے کر کہا، پہلے (تولہ یا آدھا تولہ) ابریشم کو پانی میں جوش دے کر اس کا جوشاندہ کسی پیالے میں نکال کر ٹھنڈا کر لیجئے۔ اس کے بعد یہ دوا چاٹنے کا آدھا چمچا چاٹ لیجئے اور چاٹتے ہی وہ جوشاندہ پی لیجئے۔ یاد رکھیے۔ دوا آدھے چمچے سے زیادہ ہرگز نہ ہو اور جوشاندہ فوراً پی لیجئے۔ اگر آپ نے جوشاندہ نہیں پیا تو پھر میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ آپ کی جان کے لالے پڑ جائیں گے ــــ وہ معزز مریض بڑی شکر گزاری کے انداز میں دوا لے کر رخصت ہوئے۔

مریض کے جانے کے بعد حکیم صاحب نے دو طشتریاں اور چمچے منگوائے اور وہی دوا خاص مقدار میں دونوں طشتریوں میں نکالی اور کہا ــــ لے کھا لے"

میرے دوست نے طالب علمانہ شوخی کے ساتھ کہا :۔

" حکیم صاحب میرا ارادہ ابھی مرنے کا تو نہیں ہے"۔

حکیم صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا :۔

" ابے کھا، یہ خالص شہد ہے" پھر ایک موٹی سی گالی دے کر کہا ــ" اگر اس ... کو میں یہ کہتا کہ ابریشم کو جوش دے کر پی لے تو کبھی نہ پیتا۔ ان لوگوں کو چار پیسے کی دوا پر بالکل اعتقاد نہیں۔ ڈاکٹر اگر دس بیس روپے کی دوا تجویز کرتا ہے تو بڑے اعتقاد اور پابندی کے ساتھ وہ دوا کھاتے ہیں۔ ہماری سستی دواؤں کو خاطر میں نہیں لاتے"۔

غرضیکہ حکیم امتیاز الدین بڑے سادہ طبیعت، فلسفی مزاج انسان تھے۔ ان خصوصیات کے علاوہ ایک خاص چیز یہ تھی کہ انھیں کسی زمانے میں غالب سے عشق تھا۔ غالب کے اشعار پر اتنی گہری نظر رکھتے تھے کہ شاید ہی کسی کی ہو۔

حکیم امتیاز الدین صاحب بھی میرے بزرگوں کے بزرگ تھے۔ جنوری ۱۹۲۷ء کی بات ہے میں ایم اے میں تھا۔ ایک مرتبہ ایک شادی کی محفل میں مجھے کئی گھنٹے تک حکیم صاحب کی ہم نشینی نصیب ہوئی۔ میں نے گھیر گھار کر انھیں غالب کی طرف متوجہ کیا۔ حکیم صاحب اچھے موڈ میں تھے۔ فرمانے لگے :۔ بیس کی بات ہے کہ غالب کا یہ شعر پندرہ برس سے میرے زیر نظر تھا۔ اطمینان بخش معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے ؎

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

ایک روز غسل خانے میں جا رہا تھا۔ گھر میں ایک خرگوش کا بچہ پال رکھا تھا۔ خبر نہیں اس کے پنجرے پر کب سے دھوپ پڑ رہی تھی۔ میں جب اس کے سامنے سے ہو کر غسل خانے میں جانے لگا، خرگوش کا بچہ میرے سامنے تڑپا اور مر گیا۔ میں افسوس کرتا ہوا غسل خانے میں گیا اور نہانے کی تیاری کرنے لگا۔ یکایک میرے ذہن میں امیر خسرو کی وہ رباعی ابھری جس میں انھوں نے اس تلمیح کو نظم کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کا جسد خاکی تیار کیا تو روح کو اس میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ روح جسد کے اطراف میں پھرنے لگی، داخل نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو راگ گانے کا حکم دیا۔ راگ سن کر روح جسد میں داخل ہو گئی۔ وہ رباعی یہ ہے [1] :۔

---

[1] یہ رباعی میں نے کسی کتاب میں اسی طرح دیکھی۔ قافیوں میں سہو کتابت معلوم ہوتا ہے۔ کلام خسرو سے تصحیح کرنے کا موقع نہیں ملا (رشدی)

آں روز کہ رُوح پاک آدم بہ بدن
گفتند درا، نمی شد از ترس بدن
خواندند ملائکاں بہ لحن داؤد!
در تن در تن در آئے در تن در تن

اس رباعی کا خیال میں آنا تھا کہ بجلی کی طرح غالب کے اس شعر کا مفہوم روشن ہوگیا کہ غالب نے "وہ صدائے فرشتوں کے راگ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خوشی سے میری حالت حکیم ارشمیدس کی سی ہوگئی اور قریب تھا کہ اسی حالت میں غسل خانے سے باہر نکل بھاگتا مگر اپنے آپ کو سنبھالا اور بغیر نہائے پھر سے کپڑے پہن لیے اور دوڑا ہوا عبدالحق کے ہاں پہنچا کہ اسے سنا دوں"۔

یہ اُس زمانے کی باتیں تھیں جب کہ نہ حضرت علامہ نظم طبا طبائی کی شرح دیوان غالب شائع ہوئی تھی اور نہ احمد حسن شوکت میرٹھی کی۔ اسی صحبت میں حکیم صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کا ارادہ غالب اور مومن کے کلام کا انتخاب تیار کرنے کا بھی تھا۔

حکیم صاحب سے مذکورۂ بالا واقعہ سننے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اگرچہ اب اس واقعے کو پچیس تیس سال گذر چکے ہیں۔ دیوان غالب پر حضرت طبا طبائی کی اور مولانا حسرت موہانی کی شرحیں بہت مقبول ہیں پھر بھی ممکن ہے کہ حکیم امتیاز الدین صاحب کو برسوں کے غور و فکر سے غالب کے اشعار میں جو خاص خاص نکتے ہاتھ آئے ہوں انھیں لکھ کر شائع کیا جائے تو اُردو اَدب کی بڑی خدمت ہوگی میں نے بڑے ادب سے حکیم صاحب کی خدمت میں یہ بات عرض کی۔ فرمانے لگے "لکھنے کے جھگڑے میں کون پڑتا ہے"۔ میں نے عرض کیا "اجازت ہو تو گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے میں حاضر ہو جایا کروں اور آپ کے ارشادات نوٹ کروں"۔ اس پر کچھ اپنی عدیم الفرصتی اور کچھ اس ترک شدہ مشغلے سے اکتاہٹ کے انداز میں فرمایا "ارے بھئی چھوڑو ان باتوں کو"۔ اور پھر فوراً ہی دولھا میاں پر جو سہرا باندھے پاس ہی بیٹھے تھے اپنی طبّی امداد کی پیش کش کا ایسا گرما گرم فقرہ چست کیا کہ بے چارہ دولھا شرم سے کٹ کٹ گیا اور حاضرین ہنسی کے مارے لوٹنے لگے۔ اس فقرے پر میں بھی بے اختیار ہنس رہا تھا لیکن دل سے ایک مبہم آہ نکلی — ہائے بدنصیب اُردو — اس واقعے کے کچھ ہی مدّت کے بعد حکیم امتیاز الدین صاحب نے وفات پائی۔

—— (۶) ——

مدرسہ آصفیہ کی ہیڈ ماسٹری کے زمانے میں مرزا علی لطف کا تذکرہ گلشن ہند مولوی صاحب کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کتاب کے ناشر عبداللہ خاں تھے جو بڑی خصوصیات کے بزرگ تھے۔ انھیں اُس زمانے کے بہت سے اہل علم حضرات سے تعارف حاصل تھا۔ سنا تھا کہ وہ پنجاب کے تھے۔ یورپ بھی ہو آئے تھے۔ میں نے انھیں ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں بارہا دیکھا تھا۔ اس زمانے میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔ مولوی تصدق حسین مہتمم کتب خانۂ آصفیہ سے ان کے خاص تعلقات تھے اور غالباً انھیں تعلقات کی بنا پر مولوی تصدق حسین صاحب نے عبداللہ خاں کو کتب خانۂ آصفیہ کی قدیم عمارت (جو عابد شاپ کے مقابل تھی) کے ایک بیرونی کمرے میں ٹھہرا دیا تھا۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں مولوی تصدق حسین صاحب پنشن پا چکے تھے۔ ان کی جگہ ان کے صاحبزادے عباس حسین

صاحب مہتمم تھے ان کے بھانجے اسکول میں میرے ہم جماعت تھے۔ عمارت کے پچھلے حصے میں مہتمم کتب خانہ کا مکان تھا۔ تصدق حسین صاحب اور اُن کے صاحبزادے اسی مکان میں رہتے تھے۔ میں ان دنوں تقریباً روزانہ کتب خانہ آصفیہ جایا کرتا تھا اور عبداللہ خاں صاحب کو مولوی تصدق حسین صاحب اور چند دوسرے اہل علم کے ساتھ کتب خانے کے کسی کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے دیکھتا تھا۔ وہ زور زور سے باتیں کرتے تھے اور باوجود نابینا ہونے کے ان کی گفتگو اور چال ڈھال میں ایک تجبّر سا محسوس ہوتا تھا اس کے ساتھ ان کا لباس —— میلا سا پاجامہ، موٹے جھوٹے کپڑے کی میلی سی شیروانی جس کے کئی بٹن ٹوٹے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک پرانا بید کا ڈنڈا جس کے ریشے کئی جگہ سے کھل گئے تھے۔ مگر اپنے حلقۂ احباب میں ان کی گفتگو چھائی ہوئی رہتی تھی۔ ہمیں وہ ایک اجڈ سے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ میں آٹھویں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ دربار علم و ادب کے احاطے کے باہر کھڑا بعض اہل دربار کی شکلیں تو دیکھ لیتا تھا، مگر پہچانتا نہیں تھا کہ کون کیا ہے۔

اس زمانے میں میرے سر پر کسی ایسے صاحب علم بزرگ کا سایہ نہیں تھا جو دربار علم و ادب کے اکابر سے مجھے روشناس کرا دیتے ہمارا گھرانا سپاہیوں کا گھرانا تھا۔ سپاہ گری ہی کے وسیلے سے تلاش معاش میں ہمارے بزرگ دکن پہنچے اور آباد ہوگئے۔ ہمارا مکان ایسے محلّے میں تھا جہاں سے دُور دُور تک کسی انگریزی داں کا پتا نہ تھا۔ ہمیں یہ گمان تک نہیں ہوتا تھا کہ کبھی علم و ادب کے اس طلسمی محل میں داخل ہونے کا ہمیں بھی موقع ملے گا۔ کئی سال کے بعد —— یعنی عبداللہ خاں صاحب کی وفات کے کئی سال کے بعد مجھے اپنے مرحوم دوست حکیم شمس اللہ قادری سے ان کا نام معلوم ہوا اور ان کی خصوصیات کا علم ہوا۔ اس وقت اس عجیب علم دوست انسان سے ملنے کا بڑا اشتیاق پیدا ہوا مگر عبداللہ خاں تو بہت دُور جا چکے تھے۔

عبداللہ خاں نے تذکرۂ گلشن ہند کے علاوہ "سروآزاد" اور "مآثرالکرام" وغیرہ اور کئی اہم کتابیں بھی شائع کی تھیں۔ مولوی عبدالحق ہی کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب عماد الملک نے حضور نظام مرحوم سے سفارش کر کے ان کے نام پچاس روپے ماہوار وظیفہ جاری کرا دیا تھا اور مذکورۂ بالا کتابوں کی اشاعت کے لیے اپنے پاس سے ہزاروں روپے کی مدد کی تھی۔

عبداللہ خاں مرحوم نے "تذکرۂ گلشن ہند" کو دارالاشاعت پنجاب کے رفاہ عام پریس لاہور میں چھپوایا تھا۔ کتاب کی تصحیح اور تحشیہ کا کام مولانا شبلی نے کیا تھا جو اس زمانے میں حیدرآباد میں تھے۔ مولوی عبدالحق نے ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا، جو شاید مولوی صاحب کا پہلا مقدمہ تھا۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے بہت سی کتابوں پر مقدمے لکھے۔ مولوی صاحب کی بکثرت مقدمہ نگاری پر اُن کے کسی دوست نے (غالباً مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی صدر یار جنگ نے) انھیں "مقدمہ باز" کا خطاب دیا تھا۔ مولوی صاحب کے مقدموں کو ان کے ایک حیدرآبادی دوست مولوی محمد بیگ صاحب (اوّل تعلقدار) نے یکجا کر کے کتابی صورت میں "مقدمات عبدالحق" کے نام سے شائع کیا۔ چند سال ہوئے کہ محمد بیگ صاحب کا یہیں کراچی میں انتقال ہوا۔ محمد بیگ صاحب ایسے روشن خیال، علم دوست اور دیانت دار عہدے دار تھے جو حیدرآباد کے لیے باعث فخر تھے اور خود مجسّم شرافت تھے۔ حیدرآباد میں وہ مالگزاری (ریونیو) کے ایسے ایسے اہم عہدوں پر رہے جو "دست غیب" کے عاملین کے لیے "سونے کی کان" تھے۔ مگر مرزا صاحب اتنے بلند کردار کے آدمی تھے

کہ اس بہتی گنگا میں کبھی ہاتھ نہیں دھویا۔ مالگزاری کے سے غیر علمی محکمے میں ملازمت کرنے کے باوجود حیدرآباد کی علمی اور تعلیمی جدوجہد میں برابر حصّہ لیتے رہے۔ موصوف نے اپنے حالات زندگی کتابی صورت میں مرتب کیے ہیں جس سے اس دور کے حیدرآباد کی زندگی کا صحیح مرقع سامنے آجاتا ہے۔ تقسیم ہند سے بہت پہلے محمد بیگ صاحب محکمہ مالگزاری سے وظیفہ (پنشن) لے چکے تھے۔ مہاراجا کشن پرشاد کی وفات کے بعد حضور نظام میر عثمان علی خاں نے ان کو مہاراجا کے اسٹیٹ یعنی جاگیروں اور محلات وغیرہ کا ناظم (ایڈمنسٹریٹر) مقرر کیا تھا۔ اس زمانے میں انھیں حضور نظام سے بہت واسطہ پڑا۔ وہ حالات اس کتاب کی جان ہیں۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی۔ غالباً اُن کے داماد ڈاکٹر قیوم بیگ صاحب (پیر کالونی) کے ہاں اس کا مسودہ محفوظ ہے۔ اگر انجمن ترقی اُردو اس کو شائع کرسکے تو نہ صرف حیدرآباد کے اس دَور کی جس میں مولوی عبدالحق نے عمر کا بہترین حصّہ گزارا، ایک دلچسپ تاریخ محفوظ ہوجائے گی، بلکہ محمد بیگ صاحب نے مولوی عبدالحق کے منتشر مقدمات کو یکجا کرکے جو خدمت انجام دی ہے اس کا تقاضا بھی پورا ہوجائے گا کہ موصوف کی کتاب انجمن سے شائع ہو ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ قیمتی مسودہ کسی حادثے سے ضائع نہ ہوجائے۔

"تذکرۂ گلشن ہند" کے مقدمے میں مولوی صاحب نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی اُردو تصنیفات اور اُردو کے متعلق انگریز مصنّفوں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے جو ایک لحاظ سے تاریخ اَدب اُردو کی طرف پہلا قدم سمجھا جاسکتا ہے۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ اس مقدمے کی تحریر ہی کے سلسلے میں مولوی صاحب کو اُردو ادب کی تاریخ سے ایک مستقل لگاؤ پیدا ہوا ہوگا۔ یہ تذکرۂ شعرا جسے میرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء میں فارسی سے ترجمہ کیا تھا۔ ناشر کی حیثیت سے عبداللہ خاں مرحوم کی ایک یادداشت پر ۲۶ نومبر ۱۹۰۹ء درج ہے۔ غالباً یہی اس کتاب کا سنہ طبع ہوگا۔ لیکن اس کی اشاعت کے متعلق میرے مرحوم کرم فرما جناب نصیرالدین ہاشمی نے تحریر فرمایا ہے کہ ― "یہ کتاب طغیانی اور موسیٰ کے بعد شائع ہوئی ―" طغیانی رود موسیٰ ۱۹۰۸ء کا واقعہ ہے۔ ممکن ہے کتاب کی طباعت میں اتنی دیر ہوگئی ہو کہ سال دو سال کے بعد اس کی اشاعت ہوئی ہو۔

―――(۷)―――

مدرسہ آصفیہ کے شاگردوں میں مولوی صاحب کے ایک خاص شاگرد منظور احمد صاحب تھے، جو بعد میں منظور جنگ کے خطاب سے بہت مشہور ہوئے۔ وہ تعلیم ختم کرکے محکمہ فینانس میں ملازم ہوچکے تھے اور مولوی صاحب کے حلقۂ احباب خاص میں شامل تھے۔ منظور جنگ میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ (سُنا ہے کہ ان کے والد بھی بڑے ظریف تھے وہ ریاست حیدرآباد میں تحصیلدار کے عہدے پر مامور تھے) حکیم امتیازالدین، مولوی عبدالحق اور منظور جنگ کے علاوہ اور چند احباب پر مشتمل ایک پارٹی بنی ہوئی تھی جس میں حکیم صاحب کی حیثیت "قائد" کی تھی۔ اُس زمانے سے متعلق میں نے منظور جنگ کی شوخیوں اور انوکھی شرارتوں کے متعدد کارنامے سُنے تھے۔ ایک کارنامہ آپ بھی سن لیجیے جو میں نے حکیم امتیازالدین مرحوم کی زبانی سُنا تھا:۔

حیدرآباد میں ایک صاحب محمد پناہ نامی اس پارٹی کے ملاقاتیوں بلکہ احباب میں تھے، وہ محکمہ فینانس میں مددگار یعنی

اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ آدمی معقول، متین، محنتی اور دیانت دار تھے۔ غالباً انھی خوبیوں کی وجہ سے چھوٹی خدمت سے ترقی کر کے اسسٹنٹ سیکرٹری بنے تھے۔ محتاط اور کفایت شعار بھی تھے۔ ان کی کفایت شعاری کو ان کے احباب بخل پر محمول کرتے تھے۔ ان کی صاحبزادی کا عقد تھا۔ انھوں نے اس تقریب میں چند گنے چنے احباب کو مدعو کیا۔ مولوی عبدالحق کی پارٹی میں صرف ایک حکیم امتیاز الدین کو دعوت کا رقعہ بھیجا۔ حکیم صاحب سمجھے کہ دعوت تو سب ہی کی ہوگی اس لیے مولوی عبدالحق اور منظور جنگ وغیرہ کے سامنے اس دعوت کا تذکرہ کیا اور اپنا رقعہ دکھایا۔ سب کو بُرا لگا کہ محمد پناہ نے ہمیں دعوت نہیں دی۔ اس پر ان کی کفایت شعاری یا بخل پر فقرے چست کیے گئے۔ منظور جنگ چپکے سے حکیم صاحب کا دعوتی رقعہ لے کر غائب ہو گئے۔ بازار جا کر اسی قسم کے پچاس سادہ رقعے خریدے اور پھر اس پریس میں پہنچے جہاں وہ رقعہ چھپا تھا۔ پریس والے سے اس انداز سے جیسے محمد پناہ صاحب نے بھیجا ہو یہ کہا کہ کچھ رقعے کم پڑ گئے ہیں انھیں ابھی چھاپ دو۔ پریس والے نے چھاپ دیئے۔ وہ لے کر راتوں رات محمد پناہ صاحب کے دفتر کے اہلکاروں اور دوسرے دوستوں کو پہنچا دیئے۔ صبح شادی کی تقریب میں محمد پناہ صاحب کے مہمانوں میں وہ جعلی رقعے والے مہمان بھی موجود تھے اور اپنی شرارت کا لطف اٹھانے کے لیے یہ پارٹی بھی موجود تھی۔ دعوت کا مختصر سا انتظام تھا۔ اس بیچارے نے کس مصیبت سے اُن "منظور جنگی" مہمانوں کو کھانا کھلایا ہوگا! ــــ میرا گمان ہے کہ منظور جنگ کی ان شوخیوں میں مولوی صاحب کی شہ بھی ہوا کرتی ہوگی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ خود حکیم صاحب بھی اس سازش میں شریک رہے ہوں۔

(۸)

حضور نظام مرحوم میر محبوب علی خاں اگرچہ رعایا اور اہل ملک سے بےحد محبت رکھتے تھے اور رعایا کی تکلیف یا کسی مصیبت کا حال سن کر بےچین ہو جایا کرتے تھے۔ مگر وہ ریاست کے مقررہ فرائض سے آہستہ آہستہ دور ہوتے گئے۔ اپنی عمر کے آخری زمانے میں وہ مہینوں محل سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ضروری کاغذات جو اُن کی منظوری کے لیے جاتے تھے بہ مشکل واپس آتے اور بعض کارروائیاں تو برسوں پڑی رہتیں۔ جنسی عیاشی کے علاوہ ان کی شراب نوشی بھی بہت بڑھ گئی تھی جو غالباً بعد میں ان کی ہلاکت کا باعث ہوئی۔ ان حالات کی وجہ سے بعض حلقوں میں بےچینی پیدا ہونے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ عزیز مرزا صاحب ہوم سیکرٹری اور ان کے دفتر کے دو تین اہم افسر ایک مولوی صفی الدین جو اُن کے مددگار (اسسٹنٹ سکریٹری) تھے اور دوسرے ظفر علی خاں جو ہوم آفس کے مترجم تھے اور اب کئی ایک کتابوں کے مصنف ہو چکے تھے اور رسالہ "دکن ریویو" اور "افسانہ" کے ایڈیٹر تھے۔ مولوی عبدالحلیم شرر اور ان کے دو ایک اور شرکا نے مل کر ایک منصوبہ بنایا کہ مرحوم حضور نظام کو تخت سے اُتار کر ان کی جگہ میر عثمان علیخاں (موجودہ نظام) کو جو ولی عہد تھے، تخت نشیں کیا جائے۔ اس سازش کا راز کھل گیا۔ اس وقت مہاراجا کشن پرشاد دیوان ریاست یعنی وزیر اعظم تھے۔ وہ بچپن میں حضور نظام مرحوم کے ساتھ کھیلے ہوئے اور انھی کے ساختہ پرداختہ تھے۔ حضور مرحوم سے والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ انھیں یہ سازش کس طرح گوارا ہوتی چنانچہ ان لوگوں کو پنشن دے کر ریاست سے چلے جانے کا حکم ملا جیسے وہاں کی اصطلاح میں "شہر بدر" کیا جانا کہا جاتا ہے۔ اس طرح عزیز مرزا، مولوی صفی الدین اور مولانا ظفر علی خاں اور عبدالحلیم

منزر ایک سابقہ ریاست سے نکال دئیے گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۰۹ء کا ہے۔ مولوی صفی الدین کا تعلق مدراس سے تھا وہ غالباً مدراس چلے گئے۔ ظفر علی خاں پنجاب کے تھے وہ پنجاب گئے۔ وہاں انھوں نے پہلے "ستارۂ صبح" کے نام سے ایک اخبار نکالا اور پھر اپنے والد کے اخبار "زمیندار" کو کرم آباد سے لاہور منتقل کر کے روزنامہ بنا دیا۔ کچھ ہی مدت کے بعد "زمیندار" اخبار نے ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ حیدر آباد میں ہوم آفس کی مترجمی کی خدمت مولوی عبدالحق کو مل گئی۔

انجمن ترقی اُردو کا قیام ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں ہوا تھا۔ انجمن کے پہلے صدر علی گڑھ کالج کے مشہور انگریز پروفیسر ٹامس آرنلڈ اور پہلے معتمد (سکریٹری) مولانا شبلی نعمانی منتخب ہوئے تھے مگر مولانا شبلی اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج چھوڑ کر حیدر آباد دکن چلے گئے تھے۔ چند سال رہنے کے بعد انھوں نے ندوۃ العلما کی خاطر حیدر آباد کو بھی خیر باد کہا۔ غرض ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی کے بجائے مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی (صدر یار جنگ) انجمن کے معتمد بنائے گئے۔ مستقل آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے انجمن کا کام جیسا ہونا چاہیے تھا نہ ہو سکا۔ چند کتابیں علی گڑھ کالج کی انجمن "الفرض" سے شائع کیں۔ آخر ۱۹۰۹ء میں حبیب الرحمان خاں شروانی نے معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔ عزیز مرزا صاحب نے حیدر آباد چھوڑنے کے بعد قومی کاموں میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رنگون میں ہوا جس میں انجمن ترقی اُردو کی معتمدی عزیز مرزا صاحب کو دی گئی اور امید تھی کہ عزیز مرزا صاحب کی معتمدی میں انجمن پھولے پھلے گی۔ مگر دوسرے ہی سال ۱۹۱۰ء میں عزیز مرزا صاحب نے وفات پائی۔ ۱۹۱۲ء میں تعلیمی کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔

ط: سید ہاشمی فرید آبادی اپنے رسالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو" میں لکھتے ہیں :-

"۱۹۱۲ء میں برطانوی عہد کا دوسرا (اور آخری) دربار دہلی منعقد ہوا جس میں پہلی مرتبہ ایک فرنگی بادشاہ ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے دارالسلطنت میں اس کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔ اس موقع پر علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی دہلی میں کیا گیا تھا ... ترقی اُردو کا شعبہ عزیز مرزا مرحوم کے بعد لاوارث رہ گیا تھا۔ اس کا سکریٹری صاحب زادہ (آفتاب احمد خاں) مرحوم نے جناب مولوی عبدالحق کو نامزد کیا" (ص ۲)

دہلی دربار کی صحیح تاریخ ہمیں مارسڈن کے اس بیان سے معلوم ہوتی ہے :-

"شہنشاہ (جارج پنجم) نے ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی کے عظیم الشان دربار میں حکومت ہند کے دارالحکومت کی کلکتے سے دہلی کو منتقلی کا اعلان کیا اور ۱۵ دسمبر ۱۹۱۱ء کو نئے دارالحکومت کا سنگ بنیاد رکھا۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی — صدق جدید لکھنؤ۔ بابت یکم ستمبر ۱۹۶۱ء (منقول قومی زبان ۱۹۶۱ء) میں یہ لکھتے ہیں :-

"دسمبر ۱۹۱۲ء تھا کہ کانفرنس کا زبردست سالانہ اجلاس میجر سید حسن بلگرامی کی زیر صدارت، لکھنؤ، قیصر باغ، بارہ دری میں منعقد ہوا اور اس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تجویز پر شعبے کی نظامت پر باتفاق تقرر مولوی عبدالحق کا ہوا۔"

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

(۹)

سراکبر حیدری بمبئی کے سلیمانی بوہرا خاندان کے فرد تھے۔ اپنی محنت اور ذہانت کی بدولت انھوں نے سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں بمبئی یونیورسٹی سے بی اے آنرز کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس کے بعد وہ برطانی ہند کی فنانشل سروس میں منتخب ہوئے اور برطانی ہند کے محکمہ فنانس میں کسی اچھے عہدے تک ترقی کر چکے تھے کہ ریاست حیدرآباد نے اپنے محکمہ حساب کے لیے ان کی خدمات برطانی ہند سے مستعار لیں۔ وہ حیدرآباد آئے اور حسابات کی تنقیح کے افسر اعلیٰ بنائے گئے۔

حیدرآباد کے محکمہ پولیس کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر اے سی۔ ہینکن تھے جو اصلاً اسکاچ قوم کے تھے مگر انگریز سمجھے جاتے تھے۔ ان کا بڑا رعب داب تھا اور حقیقت میں ریاست کی پولیس کے محکمے کو ایک منتظم اور کارگزار محکمہ بنانے اور جرائم کے انسداد میں مسٹر ہینکن نے جس دل لگن اور جوش اور دیانت داری سے کام لیا، کسی انگریز (یعنی انگلش مین) سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اُس زمانے کا انگریز اپنی نسلی برتری کے نشے میں ایسا چور تھا کہ اس کو دیسی باشندوں سے کوئی دلی ہمدردی نہیں ہوتی تھی۔ مسٹر اکبر حیدری نے اپنی آمد کے کچھ ہی عرصے کے بعد مسٹر ہینکن کی تنخواہ سے کچھ رقم غلط واقعے کی وجہ سے کاٹ دی۔ اس واقعے سے حیدرآباد میں دھوم مچ گئی کہ مسٹر حیدری ایسے جری عہدے دار ہیں کہ انگریزوں سے بھی نہیں ڈرتے۔ ان کی تنخواہ بھی کاٹ دیتے ہیں۔ اس واقعے کے بعد ریاست کے تمام محکموں پر مسٹر حیدری کا بڑا رعب قائم ہوگیا۔

مسٹر حیدری کئی سال ریاست کے صدر محاسب (اکونٹنٹ جنرل) رہے اور پھر ترقی پاکر محکمہ فینانس کے سکریٹری بنے۔ اس وقت وزیر فینانس ایک انگریز سر جارج کیسن واکر تھے۔ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے حیدرآباد کا دورہ کیا تھا۔ ریاست کے مالیہ کی حالت خراب تھی۔ انھوں نے دباؤ ڈال کر واکر صاحب کو وزیر فینانس کے عہدے پر بھیجا۔ ویسے تو واکر صاحب کارگزار آدمی تھے مگر ہندوستانیوں پر انگریزوں کے اقتدار اعلیٰ کے عام نشے میں اتنے چور تھے کہ ان سے حیدرآباد کا اونچا طبقہ بیزار ہوگیا۔ ظفر علی خاں نے ان کے متعلق ایک مزاحیہ نظم "واکر نامہ" یا "واکر گردی" کہی تھی جو حیدرآباد میں بیحد مقبول ہوئی۔ یہ نظم واکر صاحب سے اہل حیدرآباد کی ایک عام بیزاری کا ثبوت تھی۔ شاید یہی سبب اس کی مقبولیت کا تھا۔ اب بھی بہت سے پرانے لوگوں کو اس کے اشعار یاد ہیں۔ اس نظم کے چند شعر یہ ہیں:۔

حاشیہ صفحہ ۱۷۴ مولانا عبدالماجد دریابادی کا بیان اس لیے قرین صحت ہے کہ وہ خود کانفرنس کے اس اجلاس میں موجود تھے۔ غرض ان بیانات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق کو انجمن ترقی اردو کی معتمدی، کانفرنس کے دہلی کے اجلاس میں نہیں بلکہ لکھنؤ کے اجلاس میں دہلی دربار کے ایک سال کے بعد دی گئی۔ "تاریخ انجمن ترقی اردو" میں جس کو خود انجمن نے شائع کیا ہو، مولوی صاحب کے معتمد بنائے جانے کا واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے اس لیے اس کے بیان میں پوری صحت ملحوظ ہونی چاہیے تھی۔ اگر مولانا عبدالماجد اس واقعے کو تفصیل کے ساتھ بیان نہ فرماتے تو "تاریخ انجمن" والا بیان ہی مستند رہتا۔ (رشدی)

نہ بنگالی سے گھبرا اور نہ مدراسی کی پروا کر — مگر سجدے میں جھٹ گر پڑ نظر آ جائے گر واکر
کہاں کے خانخاناں اور کہاں کی لشکر آرائی — صفیں اُلٹے ، نہتا بھی نکل جائے اگر واکر
دبک جاتے ہیں مسٹر حیدری مانند گیدڑ کے — گرجتا اور بپھرتا جب ہے مثلِ شیرِ نر واکر
تعلق صدر اعظم کا فقط واکر سے اتنا ہے — دعا ہے سرکشن پرشاد اور اس کا اثر واکر
پڑی پھرتی ہے ننگے سر نظام الملک کی دولت — اک انگلو انڈین کے ہاتھ سے چادر اتروا کر

(بنگالی سے مطلب غالباً بابو نندلال ریل سے ہے جو صدر محاسب اور فینانشل سیکریٹری رہے ۔ مدراسی سے مطلب غالباً مولوی احمد حسین نواب سر امین جنگ سے ہے جو حضور نظام کے معتمد پیشی یعنی پرسنل سیکریٹری تھے ۔ نواب خانخاناں ایک محکمے کے وزیر تھے ۔)

غالباً ۱۹۰۹ء سے کچھ پہلے واکر صاحب حیدر آباد سے رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ آر- آئی - آر گلانسی وزیر فینانس بن کر آئے ۔ (ان کے ایک بھائی بی جی گلانسی حکومت ہند کے پولیٹیکل سیکریٹری تھے جو بعد میں ریاستوں کے سلسلے میں بہت مشہور ہوئے[1]) مسٹر گلانسی کے وزیر بن کر آنے پر مسٹر حیدری نے یہ اعتراض کیا کہ وہ برٹش انڈیا میں مسٹر حیدری سے جونیر ہیں ۔ یہاں ان کے افسر کیسے بن سکتے ہیں ۔ دیسی ریاستوں میں ان باتوں کا کون لحاظ کرتا تھا ۔ انگریز تو انگریز تھا ۔ گلانسی بھی مسٹر واکر کی طرح انگریز حکومت کے بھیجے ہوئے تھے ۔ مگر مسٹر حیدری کا بھی بڑا رعب جما ہوا تھا اس لیے یہ سمجھوتا کیا گیا کہ مسٹر حیدری فینانشل سیکریٹری کے بجائے ہوم سیکریٹری بن جائیں جو اس زمانے میں بہت اہم محکمہ تھا ۔ عدالت ، پولیس ، تعلیمات کے علاوہ اور کئی محکمے اس کے تحت تھے ۔ عزیز مرزا صاحب کے "شہر بدر" کیے جانے کی وجہ سے یہ عہدہ خالی تھا ۔ ریاست کے ایک قدیم جاگیردار گھرانے کے امیر اس محکمے کے وزیر تھے جو اپنے محکمے کے سیکریٹری کے معاملات میں دخل دے کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے ۔

اس طرح عملاً مسٹر حیدری ہی ہوم ڈیپارٹمنٹ کے وزیر ، یعنی موجودہ اصطلاح میں وزیر داخلہ تھے ۔ اب مولوی عبدالحق کو مسٹر حیدری سے سابقہ پڑا ۔ بعض واقف کار حضرات سے یہ سُنا تھا کہ مسٹر حیدری کے کمرے کے باہر ہال میں مولوی عبدالحق کی نشست تھی ۔ مولوی صاحب مترجم تھے لیکن ترجمے کا کام شاید کچھ زیادہ نہیں تھا ۔ مولوی صاحب کے دوست احباب اکثر ملنے چلے آتے اور مولوی صاحب کی میز کے اطراف بیٹھے خوش گپیاں کرتے ۔ مسٹر حیدری بڑے محنتی اور دفتری ضابطوں کے پابند آدمی تھے ۔ انھیں مولوی صاحب کے احباب کا

---

[1] ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ سر علی امام نے ، جن کو حضور نظام میر عثمان علی خاں نے استرداد برار (ملک برار کی نظام کو واپسی) کی کارروائی کرنے کے لیے ریاست حیدر آباد کا وزیر اعظم بنایا تھا ۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کو حضور نظام کی طرف سے برار کی واپسی کے لیے ایک سرکاری مکتوب لکھا تھا ۔ لارڈ ریڈنگ نے اس کا نہایت سخت جواب دیا تھا (اس جواب کو غالباً اخبار خلافت بمبئی نے "گدھے کی آخری دولتی" قرار دیا تھا) ایک واقف کار بزرگ نے بتایا تھا کہ لارڈ ریڈنگ کے جواب کا مسودہ لکھنے والا یہی بی - جی گلانسی پولیٹیکل سیکریٹری حکومت ہند تھا ۔

مجمع دیکھ دیکھ کر کوفت ہوتی اور بعض اوقات اُن کی خوش گپیوں کی آواز سے حیدری صاحب کے کام میں خلل پڑتا تھا۔ یہ بات آدابِ دفتر کے خلاف تھی۔ غرض حیدری صاحب مولوی صاحب سے ناراض رہنے لگے اور ایک مرتبہ تو اتنے برہم ہوگئے کہ مولوی صاحب کی میز نچلی منزل میں طویلے کے برابر کسی کمرے میں رکھوادی تاکہ ان کے شور وشغب سے نجات ملے۔ معلوم نہیں اور کیا کیا رنجشیں پیدا ہوئیں، کہ مولوی صاحب زِچ ہوگئے اور اس ملازمت کو بلکہ حیدرآباد ہی کو خیرباد کہنے کا ارادہ کرلیا۔ ایک دوست کی معرفت لاہور کے پیسہ اخبار میں جو اُس زمانے میں عروج پر تھا مولوی صاحب کی ملازمت کا انتظام ہوگیا۔ کسی صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" میں ملازمت دی گئی تھی، مگر مجھے یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

مولوی صاحب کے ملنے والے ایک اورنگ آبادی بزرگ میر سعادت علی صاحب تھے، جو اس زمانے میں ڈاکٹر سراج الحسن ناظم تعلیمات (ڈائریکٹر آف پبلک ایجوکیشن) کے "پیشی کے منشی" (پرسنل کلرک) تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن نے انگلستان میں قانون کی تعلیم پائی تھی۔ بیرسٹر بھی ہوئے اور قانون ہی میں "ڈاکٹریٹ" کی ڈگری بھی لی۔ انھیں محکمہ عدالت میں کوئی خدمت ملنی چاہئے تھی، شاید اس وقت جب کہ یہ ولایت سے واپس آئے محکمہ عدالت میں کوئی خدمت خالی نہیں تھی۔ اورنگ آباد کے انسپکٹر آف اسکولس، مسٹر کرولی کے غالباً ریٹائر ہوجانے کی وجہ سے اورنگ آباد کی انسپکٹری خالی ہوئی اس خدمت پر ڈاکٹر سراج الحسن اورنگ آباد بھیجے گئے۔ میر سعادت علی صاحب اورنگ آباد کے انسپکٹر آف اسکولس کے دفتر میں کلرک ہوگئے۔ اپنی عمدہ کارگزاری سے انھوں نے ڈاکٹر سراج الحسن کو مطمئن رکھا ہوگا۔ جب سراج الحسن ناظم تعلیمات بن کر حیدرآباد آئے تو میر سعادت علی صاحب کو بھی دفتر نظامت میں بلالیا، چونکہ ان پر بڑا اعتماد تھا اس لیے انھیں اپنا پرسنل کلرک مقرر کیا

میر سعادت علی صاحب کے وسیع تجربے کی بنا پر ڈائریکٹر کے سارے فیصلے انھی کی رائے پر منحصر ہوتے تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے ڈاکٹر سراج الحسن (سراج یار جنگ) پر میر صاحب کا بڑا اثر تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس زمانے میں میر صاحب ہی نے نظامت (ڈائرکٹری) کی تھی۔ ڈاکٹر سراج الحسن محکمہ تعلیم کے فرائض ادا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ان کی بے توجہی کی وجہ سے نقصان اٹھانے والے دل جلوں نے ان پر ہجویہ اشعار کہے تھے۔ ایک شعر بہت مشہور تھا جو میرے کانوں تک بھی پہنچا مگر افسوس ہے وہ یہاں درج کرنے کے قابل نہیں۔

ایک مدت کے بعد میں ڈاکٹر سراج الحسن کے اس عجیب وغریب عقیدے سے واقف ہوا کہ "اگر ریاستوں میں زندہ رہنا ہے تو کام ہرگز نہ کرو۔ اپنی میز پر ہمیشہ مسلوں (فائلوں) کا انبار جمع رکھا کرو۔ کبھی میز خالی نہ رہے، مگر گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچاتے رہو کہ کام بہت ہے"۔ ڈاکٹر سراج الحسن بہت لائق اور ذہین آدمی تھے۔ خبر نہیں کن تجربات نے انھیں اس نتیجے پر پہنچایا تھا کہ ریاستوں میں کام کرنے والا آدمی نالائق ٹھہرایا جاتا ہے۔ بعد میں وہ نظامت تعلیمات سے ہائی کورٹ کی ججی پر منتقل ہوگئے۔ غالباً یہ منتقلی سر اکبر حیدری ہی کے ہاتھوں ہوئی ہوگی۔ محکمہ تعلیمات کی طرح محکمہ عدالت و کوتوالی بھی ان کے تحت تھی۔ ہائی کورٹ میں بھی ڈاکٹر سراج الحسن کا یہ حال بیان کیا جاتا تھا کہ وہ عموماً اپنے ساتھی جج کے فیصلے پر یہ منجھا ہوا فقرہ لکھ کر دستخط کردیا کرتے تھے — "مجھے اپنے شریک فاضل کی رائے سے اتفاق ہے" — خود فیصلے نہیں لکھتے تھے اور نہ "شریک فاضل" کی رائے سے اختلاف کرتے تھے کیونکہ اس صورت میں وجوہ اختلاف لکھنی پڑتی تھیں

غرض اس زمانے میں جب کہ مولوی عبدالحق کا جی ملازمت سے اچاٹ ہوگیا تھا ایک روز میر سعادت علی صاحب مولوی صاحب سے ملنے گئے۔ مولوی صاحب نے انھیں بتایا کہ وہ حیدرآباد سے چلے جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میر صاحب قدیم اورنگ آبادی شرافت اور مروّت کا نمونہ تھے۔ انھیں مولوی صاحب کے اس ارادے سے بڑی تکلیف ہوئی۔ انھوں نے ڈاکٹر سراج الحسن سے اس کا ذکر کیا، اور افسوس کیا کہ مولوی عبدالحق کا سا لائق آدمی حیدرآباد سے جارہا ہے۔ ڈاکٹر سراج الحسن کو بھی افسوس ہوا اور دونوں کے مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ مولوی صاحب کو کسی طرح محکمہ تعلیم میں لیا جائے۔ غرض میر سعادت علی صاحب کی کوششوں سے مولوی صاحب محکمہ تعلیم میں آ گئے۔ اور ایسے آئے کہ پنشن لے کر ہی جدا ہوئے۔ یہ ۱۹۱۱ء کی بات ہے۔

میں نے یہ واقعہ اپنی طالب علمی کے آخری زمانے میں جب کہ مولوی صاحب کی شہرت اور اثر و رسوخ انتہا پر تھا، کسی سے سُنا تھا، مگر اس کے سچ ہونے کا پورا یقین نہیں تھا کہ مولوی صاحب کا حیدرآباد میں قیام میر سعادت علی صاحب کا مرہونِ منت تھا۔ میر سعادت علی صاحب بوڑھے ہو چکے تھے، پنشن لینے والے تھے۔ مجھے ان سے کچھ ہلکا سا تعارف حاصل تھا۔ ایک روز مجھے موقع ملا کہ اس بات کی ان سے تصدیق کروں۔ انھوں نے منکسرانہ انداز میں مذکورۂ بالا واقعہ بیان کیا، مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس تذکرے ہی سے پہلو بچانا چاہتے ہیں۔

قومی زبان (کراچی) بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۳ء میں مولوی عبدالحق کے چہیتے کلرک مولوی محمد علی کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر مجھے چند بھولی بسری باتیں یاد آگئیں۔ یہاں ایک نکتے کو صاف کر دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ سر اکبر حیدری کے ہوم سیکرٹری بننے سے پہلے ریاست حیدرآباد کے محکمہ تعلیم کا سالانہ خرچ شاید آٹھ لاکھ روپے تھا جس کو سر اکبر نے چند ہی برسوں میں اسّی لاکھ تک پہنچا دیا تھا۔ ان کے دَور سے پہلے ہر ضلع میں صرف ایک یا دو مڈل اسکول اور صوبے کے صدر مقامات (اورنگ آباد، گلبرگہ، ورنگل، میدک) میں ایک ایک ہائی اسکول تھا۔ (ان کے علاوہ شہر اورنگ آباد اور شہر حیدرآباد میں مشرقی علوم یعنی رشدیہ، منشی، مولوی کی تعلیم دینے کے لیے ایک ایک مدرسہ فوقانیہ قائم کیا گیا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے وقت اورنگ آباد کے مدرسہ فوقانیہ کے صدر مدرس برہان پور کے ایک نہایت قابل بوہرہ عالم ملا شیخ داؤد تھے اور اورنگ آباد ہائی اسکول (یعنی انگریزی اسکول جس میں میٹرک تک تعلیم دی جاتی تھی) کے ہیڈ ماسٹر مسٹر کرک پیٹرک تھے جو بڑے کامیاب ہیڈ ماسٹر مانے جاتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں ان دونوں اسکولوں کو ملا کر عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج بنایا گیا جس کے اولین پرنسپل مولوی عبدالحق بنے۔ غرض سر اکبر کی معتمدی تعلیمات سے پہلے تعلیم اور اسکولوں کی نگرانی کا کام بہت کم تھا۔ اس لیے ہر صوبے میں ایک مہتمم تعلیمات (انسپکٹر آف اسکولس) ہوتا تھا۔ اس کا لقب "صدر مہتمم" نہیں تھا۔ ریاست میں چار صوبے تھے اس لیے چار مہتمم بھی تھے۔ جنگ کے خاتمے پر ایک طرف تو جنگی اخراجات اور قرضوں کے مصارف بند ہو گئے اور دوسری طرف جنگ کی وجہ سے رُکی ہوئی تجارت پھر ترقی کرنے لگی۔ ریاست کی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ ہونے لگا۔ اب سر اکبر کی کوششوں سے محکمہ تعلیمات کے اخراجات کے لیے ریاست کے موازنے (بجٹ) میں زیادہ رقمیں رکھی جانے لگیں۔ اس کے مطابق نئے نئے اسکول کھولے جانے لگے۔ جب اسکولوں کی تعداد بڑھنے لگی تو ہر ضلع میں ایک ایک مہتمم تعلیمات کا تقرر کیا گیا۔ ریاست میں سولہ ضلعے تھے۔ سولہ مہتمموں کا تقرر ہوا۔ چند ہی برسوں میں اسکولوں کی تعداد اور بڑھ گئی تو ان سولہ مہتمموں کے علاوہ ہر صوبے پر ایک "صدر مہتمم" اور شہر حیدرآباد کے لیے ایک خاص صدر

مہتمم یعنی پانچ صدر مہتمم مقرر ہوئے۔ بعد میں شہر حیدرآباد کے زنانہ اسکولوں کے لیے ایک صدر مہتممہ (انسپکٹرلیس آف اسکولس) بھی مقرر ہوئیں۔ شہر حیدرآباد کا محل وقوع صوبہ (گلشن آباد) میدک کے حدود ارضی میں ہے۔ اس لیے صوبہ میدک کے صدر مہتمم اور مستقر بلدہ کے صدر مہتمم (اور صدر مہتممہ کے) دفاتر شہر حیدرآباد ہی میں قائم تھے۔

مولوی محمد علی کے انٹرویو سے مولوی عبدالحق کی سوانح عمری کی چند اہم باتوں کا پہلی مرتبہ علم ہوتا ہے (کاش وہ کچھ اور تفصیلات سنہ دار دے سکتے) وہ کہتے ہیں کہ گوبند راجندر کالے صدر مہتمم نے تین ماہ کی رخصت لی تو مولوی صاحب منصرم بناکر بھیجے گئے۔ اس انٹرویو میں بعض باتیں واضح نہیں ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ کالے صاحب کہاں کے صدر مہتمم تھے۔ مستقر بلدہ کے یا صوبہ میدک کے ؟ البتہ مولوی صاحب کے دورۂ بھونگیر کے ذکر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ میدک کے صدر مہتمم تھے۔ (بھونگیر ضلع نلگنڈے کا تعلقہ ہے اور نلگنڈا، صوبہ میدک کا ضلع ہے) میرا یہ خیال ہے کہ کالے صاحب کے عہدے کا لقب "صدر مہتمم" نہیں تھا صرف "مہتمم" تھا کیونکہ اس وقت تک درمیانی مہتمیاں قائم نہیں ہوئی تھیں۔ تو گویا، فروری ۱۹۱۱ء کو مولوی صاحب نے مہتمی تعلیمات صوبہ میدک کا جائزہ (چارج) لیا تھا۔

دوسری بات یہ کہ مولوی محمد علی نے مولوی عبدالحق کے متعلق یہ سنا تھا کہ وہ "رجسٹرار مجلس وضع قوانین" تھے۔ مجلس وضع قوانین کا دفتر بھی ہوم سکریٹری یعنی سر اکبر حیدری کے ماتحت اور انھی کے دفتر کے احاطے میں واقع تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مولوی محمد علی کا بیان صحیح ہو مگر ہمیں اب تک متعدد راویوں سے یہی ایک بات پہنچی تھی کہ مولوی صاحب، ظفر علی خاں کی جگہ ہوم سکریٹری کے دفتر میں مترجم تھے۔ (رسالہ افسر بابتہ نومبر ۱۹۰۷ء میں جس کے ایڈیٹر مولوی عبدالحق تھے، حیدرآباد بک ایجنسی کا ایک اشتہار چھپا ہے جس میں ظفر علی خاں کی کتاب "سیر ظلمات" بھی فہرست کتب میں شامل ہے' اس میں مترجم کتاب ظفر علی خاں بی اے کے ساتھ "صدر مترجم" دفتر معتمدی عدالت و کوتوالی و امور عامہ لکھا گیا ہے)

مولوی محمد علی صاحب نے یہ مفید اطلاع مجھے بہم پہنچائی ہے کہ گوبند راجندر کالے صاحب نے تین مہینے کی رخصت کے بعد چھ مہینے کی اور رخصت لی اور اسی رخصت کے زمانے میں ان کا تبادلہ اورنگ آباد کیا گیا۔ ان کے منصرم کار ہونے کی وجہ سے مولوی عبدالحق کو اورنگ آباد جانا پڑا۔ گویا مولوی صاحب ماہ اپریل یا مئی ۱۹۱۱ء میں اورنگ آباد گئے۔

مجھ سے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے اورنگ آباد ہی میں یہ فرمایا تھا کہ وہ طالب علمی کے زمانے میں شاید علی گڑھ کے کسی ایسے وفد کے ساتھ، جو چندا وصول کرنے کے لیے مختلف شہروں کو بھیجے جاتے تھے، اورنگ آباد گئے تھے۔ وہاں کے مناظر اور وہاں کا موسم مولوی صاحب کو اتنا پسند آیا تھا کہ اس جگہ رہنے کی تمنا پیدا ہوئی۔ آخر ملازمت کے سلسلے میں یہ تمنا اچھی طرح پوری ہوئی۔

غرض محمد علی صاحب کے بیان کردہ سوانحی حالات میں ان مفید اطلاعات سے اس بات کا جوڑ مل جاتا ہے کہ ہوم آفس کی ملازمت سے مولوی صاحب کی بیزاری کے زمانے میں جب میر سعادت علی صاحب ان سے ملے ہوں گے۔ انھی دنوں میں گوبند راجندر کالے صاحب نے رخصت لی ہوگی۔ اس لیے ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کو مولوی صاحب کے منصرم مہتمم بنانے کا موقع مل گیا۔ ورنہ سرکاری ملازمت کے ضوابط کے لحاظ سے ناظم تعلیمات کو مہتمم تعلیمات یا اپنے ماتحت کسی گزیٹڈ آفیسر کے تقرر کا اختیار نہیں تھا۔ البتہ کسی گزیٹڈ آفیسر کے

رخصت پر جانے کی صورت میں، چند ماہ کے عارضی انتظام کے لیے ناظم تعلیمات جو کچھ سفارش کرتا اس کی منظوری عموماً ہوم سیکریٹری، یعنی وزارت تعلیمات سے مل جایا کرتی تھی۔ ۔

ظاہر ہے کہ مسٹر گوبند رام چندر کالے، مدرسی سے ترقی کرتے ہوئے مہتمم تعلیمات بنے ہوں گے۔ انھوں نے اپنے تجربے کی بنا پر اُردو، انگریزی کے ترجمے پر طالب علموں کے لیے ایک مفید کتاب لکھی تھی۔ جب راقم الحروف مڈل کی جماعت میں تعلیم پاتا تھا، یہ کتاب زیر استعمال تھی یہ اس زمانے میں اس موضوع کی تمام کتابوں میں سب سے اچھی مانی جاتی تھی۔ مولوی صاحب کی مہتمی تعلیمات کے زمانے کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ ریاست حیدرآباد نے محکمہ تعلیم کی اصلاح اور توسیع کے سلسلے میں مشورے دینے کے لیے صوبۂ مدراس کے ایک انگریز افسر تعلیمات مسٹر میہو کی خدمات عارضی طور پر حاصل کی تھیں۔ وہ "مشیر تعلیمات" یعنی "ایجوکیشنل اڈوائزر" کہلاتے تھے۔ ایک روز کوئی صاحب کسی کام سے مولوی صاحب سے ملنے گئے۔ مولوی صاحب کے کمرے کے سامنے مسٹر میہو سے مٹ بھیڑ ہوئی۔ انگریز کو دیکھ کر وہ کچھ ٹپٹا سے گئے۔ مسٹر میہو نے بڑی خوش اخلاقی سے اُردو میں کچھ اس طرح کا فقرہ کہا:۔

"آپ کس سے ملنا مانگتا؟ اڈوائزر سے ملنا مانگتا، ہم ہے ـــــ موٹا میم صاب سے ملنا مانگتا، اندر جانے سکتا"

یعنی آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ کو اڈوائزر سے ملنا ہے تو وہ میں ہوں۔ اگر مہتمم صاحب سے ملنا چاہتے ہیں تو وہ کمرے میں ہیں آپ جاسکتے ہیں۔"

مسٹر میہو کا یہ فقرہ مولوی صاحب کے احباب کے کانوں تک پہنچ گیا کہ مولوی صاحب "موٹا میم صاب" بن گئے ہیں۔

یہ لطیفہ میں نے اپنے بزرگ مولانا سید مختار احمد مرحوم (برادر بزرگ سید وقار احمد مرحوم) سے سُنا تھا، مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ مسٹر میہو صاحب سے یہ فقرہ سننے والے کون بزرگ تھے۔

ـــــ (۱۰) ـــــ

غالباً یہی دَور تھا، یا ممکن ہے اس سے کچھ پہلے (یعنی جب وہ ہوم آفس میں مترجم تھے) مولوی صاحب نے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سے ربط پیدا کیا ہوگا۔

نواب عماد الملک مرحوم کو ہندوستان کے ایک انگریزی اخبار نے "گرانڈ اولڈ مین آف حیدرآباد" (حیدرآباد کا عالیشان پیر مرد) لکھا تھا۔ نواب سر سالار جنگ نے حیدرآباد کی قدیم مغلیہ طرز حکومت کو نئے سانچے میں ڈھالا۔ اس عظیم الشان کام میں ان کو مدد دینے والے نواب محسن الملک (مہدی علی خاں)، نواب وقار الملک (مشتاق حسین)، نواب عماد الملک (سید حسین بلگرامی)، نواب اعظم یار جنگ (مولوی چراغ علی) اور کچھ مدت کے لیے ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ تھے۔ ان سب کی قابلیتیں اور ان کے کارنامے مسلّم تھے۔ مگر ان میں دو آدمی منفرد تھے، ایک تو نواب وقار الملک مشتاق حسین جو اعلیٰ کردار اور دیانت داری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور دوسرے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے جو اعلیٰ کردار اور دیانت داری کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی کی اعلیٰ قابلیت میں لاثانی تھے۔

سید حسین بلگرامی نے عربی تعلیم کے بعد انگریزی شروع کی تھی اور کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۸۶۲ء میں بی اے (آنرز) کا امتحان

درجہ اوّل میں پاس کیا تھا جب کہ سر سید مرحوم کے ذہن میں شاید علی گڑھ کالج کا تصور بھی قائم نہیں ہوا ہوگا اور غالباً مسلمان گریجویٹو یں، اوّلین نصف درجن میں ان کا شمار تھا ۔ حیدرآباد آنے سے پہلے وہ کیننگ کالج لکھنؤ کے پروفیسر رہ چکے تھے جہاں فسانۂ آزاد کے مشہور مصنف پنڈت رتن ناتھ سرشار ان کے شاگردوں میں تھے ۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے ایک انگریزی اخبار "لکھنؤ ٹائمز" کے ایڈیٹر بھی تھے ۔ ان کے بعض مضامین سے انگریز حکام ناراض ہو گئے ۔ اس پر نواب صاحب نے حیدرآباد جانے کا ارادہ کر لیا ۔

۱۸۷۳ء میں سید حسین بلگرامی حیدرآباد آ گئے ۔ سر سالار جنگ نے انھیں اپنے انگریز پرسنل سیکریٹری مسٹر آل فینٹ کا مددگار یعنی جوائنٹ سیکریٹری مقرر کیا ۔ سر سالار جنگ کی یہ دانائی کتنی قابلِ داد ہے ۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے اس لیے انگریز حکومت سے مراسلت کرنے کے لیے ایک انگریز پرسنل سیکریٹری مقرر کرنے پر مجبور تھے مگر احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ اس انگریز کے ساتھ اپنا ایک قابلِ اعتماد دیسی افسر بھی لگا رہے ۔ تین سال کے بعد ۱۸۷۶ء میں سر سالار جنگ انگلستان گئے تو سید حسین بلگرامی کو ساتھ لے گئے ۔ وہاں ملکہ وکٹوریہ نے سر سالار جنگ کے ساتھ والیانِ ریاست کا سا سلوک کیا ۔ سالار جنگ کے اس سفرِ انگلستان کا ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا تھا کہ ان کے قیامِ انگلستان کے زمانے میں ایک بنگالی طالب علم نے لندن یونیورسٹی سے ڈی ۔ ایس سی کی ڈگری لی ۔ یہ ہندوستان کا پہلا طالب علم تھا جس نے سائنس میں ڈاکٹریٹ کا اعزاز حاصل کیا تھا ۔ نواب سالار جنگ ، اس طالب علم کو حیدرآباد کے نظام کالج کے لیے سائنس کا پروفیسر مقرر کر کے اپنے ساتھ حیدرآباد لائے (بعض لوگ کہتے تھے ، کہ پروفیسری نہیں بلکہ پرنسپل کی خدمت پر تقرر کر کے ساتھ لائے تھے مگر بعد میں مدراس یونیورسٹی کی مخالفت کی وجہ سے انھیں پرنسپل پر نہ رکھا گیا ، پروفیسر بنا دیئے گئے ۔ نظام کالج کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے تھا) ممکن ہے کہ یہ مشورہ سید حسین بلگرامی ہی کا ہو ۔ کیونکہ سائنس کی اس اعلیٰ ڈگری کا صحیح اندازہ وہی کر سکتے تھے ۔ وہ بنگالی طالب علم ڈاکٹر اگھور ناتھ چٹوپادھیائے تھے ، جن کی صاحبزادی مشہور شاعرہ ، کانگریس کی صفِ اوّل کی لیڈر مسز سروجنی نائیڈو تھیں[1]۔

---

[1] ڈاکٹر اگھور ناتھ ساری عمر حیدرآباد ہی میں رہے ۔ ان کے سارے بچے حیدرآباد ہی میں تولد ہوئے ۔ ہندوستان آنے کے بعد وہ سخت قوم پرست بن گئے تھے جس کی وجہ سے مدراس یونیورسٹی کے انگریز حکام ان کے دشمن ہو گئے ۔ سروجنی تعلیم کے لیے انگلستان گئیں ۔ وہاں ان کی شاعری کی بڑی قدر کی گئی وہ انگریزوں کی دوستی کا دم بھرتی تھیں اس لیے ڈاکٹر اگھور ناتھ اپنی اس بیٹی سے اتنے ناراض تھے کہ یہ کہہ دیا تھا کہ میرے مرنے پر اس کو میری میت پر بھی نہ آنے دینا ۔

ڈاکٹر اگھور ناتھ کو کیمیاگری کا بڑا شوق ہو گیا تھا ۔ ایسے فقیر، سادھو، سنیاسی کی جستجو میں رہتے جو کیمیاگری جانتا ہو ۔ اس شہرت کا کوئی آدمی مل جاتا تو اس کی بڑی آؤ بھگت کرتے ۔ روپے پیسے سے اس کی خدمت کرتے ۔ شاید ان کا یہ خیال تھا کہ دیسی کیمیاگروں سے اگر کوئی صحیح نسخہ مل جائے تو اس کو جدید کیمیائی طریقوں سے جانچ کر دھاتوں کے استحالے کا کوئی نیا قانون دنیائے سائنس میں پیش کریں مگر انھیں کوئی واقعی کیمیا بنانے والا نہیں ملا ، ایسے تمام لوگ جھوٹے ، دغاباز ثابت ہوئے ۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انگلستان سے واپس آنے کے بعد سر سالار جنگ نے انھیں اپنا پرائیویٹ سیکریٹری اور معتمد صیغہ متفرقات بنا لیا تھا ۔۔۔ جس میں سررشتہ تعلیم اور بعض چھوٹے موٹے محکمے شامل تھے ۔حضور نظام مرحوم میر محبوب علی خاں کی تعلیم کا انتظام ہوا، تو ۔۔۔ سید حسین بلگرامی کو بھی ان کی تعلیم پر مقرر کیا ۔ سالار جنگ نے ۱۸۸۳ء میں وفات پائی ۔ ۱۸۸۴ء میں حضور نظام مرحوم کو اختیارات فرماں روائی ملے تو غالباً انگریز حکومت کی ہدایت پر کونسل آف اسٹیٹ قائم ہوئی جس کے صدر خود حضور نظام تھے اور معتمد سید حسین بلگرامی مقرر ہوئے ۔حضور نظام مرحوم نے انھیں علی یار خاں، موتمن جنگ، عماد الدولہ، عماد الملک کے خطاب دیے ۔ ۱۸۸۹ء میں کرنل مارشل کی علیحدگی کے بعد حضور مرحوم نے عماد الملک کو اپنا پرائیویٹ سیکریٹری مقرر کیا ۔ ۱۹۰۲ء میں ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن) بنے اور وظیفہ حسن خدمت (پنشن) لینے تک اسی خدمت پر رہے۔ ان کی پنشن کی کارروائی منظوری کے لیے حضور نظام مرحوم کے ملاحظے میں پیش ہوئی تو انھوں نے نصف تنخواہ کی پنشن کے بجائے پوری تنخواہ پنشن کر دی ۔ اس کی نظیر نہ پہلے کبھی تھی اور نہ بعد میں کبھی ہوئی ۔

سر سالار جنگ کی وفات کے بعد ریاست میں سازشوں کا دروازہ کھل گیا ۔حضور مرحوم نے سالار جنگ کے بڑے

(حاشیہ صفحہ سابق) ڈاکٹر اگھور ناتھ کی ایک لڑکی جو مسز سروجنی نائیڈو سے بڑی تھیں مدراس چلی گئی تھیں ۔ انھوں نے شادی نہیں کی ۔ گمنامی میں زندگی بسر کی ۔مسز سروجنی کے ایک چھوٹے بھائی ہریندر ناتھ انگریزی کے شاعر اور مشہور ادیب تھے ۔ شاید اب بھی بقید حیات ہوں ۔ ہمارے انگریزی کے پروفیسر ای ۔ اسپیٹ نے جو خود بھی شاعر تھے اور مشہور آکسفرڈ ڈکشنری کے عملے میں کام کر چکے تھے حیدر آباد آنے سے پہلے پندرہ برس تک ٹوکیو یونیورسٹی (جاپان) میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے تھے ۔ ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہریندرا ناتھ مسز سروجنی سے بہتر شاعر ہیں ۔ میری طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر اسپیٹ ہریندرا ناتھ کی نظموں اور ڈراموں کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے ۔ ان کے علاوہ مسز نائیڈو کے ایک بھائی سرکاری ملازم تھے ۔ شاید ایک بھائی اور بھی تھے ۔

مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی پسند سے ایک مدراسی ڈاکٹر میجر نائیڈو سے شادی کی تھی ۔ ڈاکٹر نائیڈو طب کے ڈاکٹر تھے ۔حیدر آباد کے معزز اور مقبول معالج مانے جاتے تھے ۔ وہ ہندوستان کے چوٹی کے ڈاکٹروں میں شمار ہوتے تھے ۔ انڈین میڈیکل کونسل کے صدر بھی رہ چکے تھے لیکن بیوی کی ہمہ گیر شہرت نے ان کی ذاتی شہرت کو گہنا دیا تھا ۔ بعض اوقات لوگ انھیں مزاحاً "مسز نائیڈو کے شوہر" کہا کرتے تھے یعنی ۔ ڈاکٹر نائیڈو کی بیوی کے شوہر ۔

مسز سروجنی نائیڈو دو یا تین مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کی صدر رہ چکی تھیں ۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ یوپی (اترپردیش) کی گورنر بنائی گئی تھیں ۔ ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد کی ریاست پر انڈین یونین کی فوج کشی کے بعد ہی اچانک فوت ہو گئیں ۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ریاست حیدر آباد کی تباہی کا صدمہ ہی ان کی موت کا باعث ہوا ۔ انھیں حیدر آباد سے بہت محبت تھی ۔ وہ کانگریس کی لیڈر بننے سے بہت پہلے سے حیدر آباد کی خواتین میں بڑی ہر دلعزیز تھیں ۔ پنڈت نہرو جب کبھی حیدر آباد آتے تو انھی کے (باقی اگلے صفحے پر)

صاحبزادے میر لائق علی کو دیوان (وزیر اعظم) بنایا۔ وہ خود حضور مرحوم کی طرح نوجوان تھے۔ وزارت عظمیٰ کا کام ان سے سنبھل نہ سکا۔ پھر مہاراجا نریندر (سرکشن پرشاد کے نانا) پھر سرآسمان جاہ۔ ان کے بعد اقبال الدولہ اور آخر میں مہاراجا کشن پرشاد دیوان بنے۔ یہ تمام زمانہ سازشوں اور پارٹی بندیوں کا زمانہ رہا۔ خود نواب عمادالملک کے چھوٹے بھائی، تمدن عرب اور تمدن ہند کے مترجم سیّد علی بلگرامی بھی سازشوں کے جال میں اُلجھ گئے تھے، شہر بدر کیے گئے۔ مگر عمادالملک چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے۔ سازشوں کی لہروں کو ان کے قدموں تک پہنچنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ان کے بلند کردار کا اثر حکمران ریاست پر بھی تھا اور انگریز رزیڈنٹ اور وائسرائے پر بھی۔ جب شہزادہ ولی عہد میر عثمان علی خاں کی تعلیم و تربیت کا وقت آیا تو حضور مرحوم میر محبوب علی خاں نے اپنے اس استاد کو بھی ولی عہد کی تعلیم پر مقرر کیا۔ تاریخ کی کتابوں میں "سادات بلگرام" کے حسن علم و فضل اور اعلیٰ کردار کی داستانیں مرقوم ہیں ان کی ایک زندہ مثال نواب عمادالملک تھے۔

۱۹۱۲ء میں جب مولوی عبدالحق کو انجمن ترقی اردو سپرد کی گئی تو ایک پرانا صندوق اور ٹوٹی دوات قلم اس کی کل کائنات تھی۔ مولوی صاحب کی تحریک اور کوشش ہی کی وجہ سے نواب عمادالملک نے انجمن کی صدارت قبول کی ہوگی۔ نواب صاحب کے صدر انجمن بن جانے سے انجمن کے مردہ جسم میں گویا جان پڑ گئی۔ انجمن کے لیے نواب صاحب نے اپنے پاس سے بھی روپیہ دیا اور حکومت سے بھی سالانہ امداد منظور کرائی۔

نواب عمادالملک نے بڑی عمر پائی۔ ان کی عمر کے آخری پچیس تیس سال ایسے تھے جن میں وہ کوئی عملی کام نہیں کر سکتے تھے ۱۹۰۷ء میں وزیر ہند کی کونسل کے ممبر بنائے گئے تھے۔ انگلستان گئے وہاں ایک حادثے میں ایسے زخمی ہوئے کہ ساری عمر اپاہج رہے ان کی پہلی بیوی سے ایک صاحبزادی (والدۂ علی یاور جنگ) سید محمد ہاشم۔ سیّد محمد عقیل (عقیل جنگ) سید زین العابدین اور سیّد مہدی حسین (مہدی یار جنگ) صاحبزادے تھے۔

۱۹۲۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے سال اول (فرسٹ ایر) میں تھا۔ کالج میں پروفیسر الیاس برنی مرحوم نے سر اکبر حیدری کی صدارت میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ "بزم معاشیات" کا افتتاح کرنے کا پروگرام بنایا۔ بعض بڑے آدمیوں کے دعوتی رقعے طالب علموں کے ہاتھ بھجوائے۔ میں نے دو رقعے اپنے ذمے لیے۔ ایک سر علی امام کا اور دوسرا نواب عمادالملک کا۔ یہ رقعہ لے کر میں نواب صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ نواب صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا کارڈ بھیجا۔ عمدہ سوٹ پہنا ہوا ایک سیاہ فام مدراسی ہندو باہر آیا۔ مجھ سے پوچھا میں کیا چاہتا ہوں۔ میں نے مطلب بیان کیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم تک لے گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دعوتی رقعہ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے رقعہ پڑھا اور رکھ لیا۔

(بقیہ حاشیہ ماسبق) گھر مہمان رہتے تھے۔ ان کی بڑی صاحبزادی مس پدمجا نائیڈو کو پنڈت نہرو نے (مغربی) بنگال کا گورنر بنا دیا تھا۔ شاید اب تک وہ اسی عہدے پر ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر سوریا نے جرمنی میں طب کی تعلیم پائی تھی اور ایک جرمن لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ کئی سال کے بعد حیدرآباد واپس آئے تھے شاید اب تک وہیں ہوں۔

میں نے طالب علمانہ جسارت سے کام لے کر عرض کیا کہ "جناب والا ضرور تشریف لائیں" فرمایا — کیا؟ میں؟ میں ہوں کہاں؟" مطلب یہ کہ مجھے زندوں میں شمار نہ کرو۔ میں نے گھبرا کر عرض کیا — "خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آپ کا وجود ہی ہمارے لیے باعث فخر ہے" یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس وقت تک مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ نواب صاحب اپاہج ہیں۔ چل پھر نہیں سکتے۔ دو تین سال گزر گئے۔ اس مدت میں میں نواب صاحب کی شاندار خدمات اور ان کی اہمیت سے بہت کچھ واقف ہو گیا اور جی چاہنے لگا کہ کسی صورت سے پھر ان کے ہاں حاضر ہوں۔

میرے بزرگ اور استاد مولانا سید مختار احمد صاحب پر نواب صاحب مہربان تھے۔ انھیں اپنے کتب خانے کی نایاب کتابیں مستعار دیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے مولانا مختار احمد سے نواب صاحب سے ملنے کی آرزو کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ "نواب صاحب کی ایک کتاب میرے پاس ہے جو انھیں واپس کرنی ہے۔ تم اسے لے جاؤ اور اسی بہانے سے نواب صاحب سے مل لینا۔" بہت اچھی تجویز تھی میں وہ کتاب لے کر بورڈنگ ہوس آیا۔ کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ کتاب عربی کی تھی۔ ایسے موضوع پر تھی جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میں عربی سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ کتاب کی جلد کے سادہ ورق پر کسی نے کچھ اُردو شعر لکھ دیے تھے۔ مجھے وہ شعر دلچسپ معلوم ہوئے، انھیں نقل کر لیا۔ جب وہ اشعار مولانا مختار احمد صاحب کو سُنا کر اپنا خیال ظاہر کیا تو انھوں نے میرے خیال کی تائید کی کہ وہ شعر خود نواب صاحب کے کہے ہوئے ہیں۔ پھر اس سلسلے میں انھوں نے موجودہ لیڈی عماد الملک کے حالات بیان کیے کہ وہ انگلو انڈین ہیں۔ ان کا پہلا نام مس لوبر ڈمن تھا، وہ لیڈی ڈاکٹر تھیں، ان کے بھائی مسٹر لوبرڈمن فوج میں کوئی افسر تھے۔ ان اشعار سے پتا چلتا تھا کہ نواب صاحب سے ان کی شادی کسی حد تک معاشقے کا نتیجہ تھی۔ اس واقعے سے بہت پہلے مولانا مختار احمد سے میں نے یہ بھی سُنا تھا کہ کسی روز نواب صاحب نے اُن کے رُوبرو یہ بیان کیا تھا کہ نوجوانی میں انھیں شعر کہنے کا شوق ہوا تھا۔ اس پر نواب صاحب کے والد نے فرمایا کہ اگر تم تمام شاعروں سے بلند تر مقام حاصل کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو تو ضرور شعر کہو ورنہ شعر کہنے کا خیال ترک کر دو۔ نواب صاحب نے اپنے والد کے اس بیش بہا مشورے کو دل سے قبول کیا اور شعر گوئی کا خیال ترک کر دیا۔

اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ اشعار نواب صاحب کے کس طرح ہو سکتے تھے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی سنجیدہ خواہش کے بغیر جذبات کی رَو میں وہ یونہی موزوں ہو گئے ہوں گے۔ اس وقت وہ کتاب زیر مطالعہ ہو گی اسی کے سادہ کاغذ پر انھوں نے شعر لکھ دیے۔ افسوس ہے کہ اس وقت ان اشعار کی نقل میرے سامنے موجود نہیں صرف یہ دو شعر یاد ہیں جو اس بحث کی حد تک کافی ہیں:۔

نظر آتا ہے مجھ کو قصرِ گل روِ سیرِ گلشن میں
تو دل کہتا ہے چل بیٹھو فتح میداں کے دامن میں

مریضِ عشق کی دارو مسیحا تیرے لب میں ہے
عبث تم امتحاں دینے چلے ہو شہر لندن میں

شعر بہت معمولی اور نومشق کا نتیجہ ہیں، خصوصاً پہلا شعر تو آتش کے مشہور شعر کی گونج ہے، اس لیے ان کو نواب عمادالملک سے منسوب کرنے کو جی نہیں مانتا مگر ان میں جو اشارے ہیں وہ واقعات سے مطابقت رکھتے ہیں، ان کو ملحوظ رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار کا کہنے والا نواب صاحب کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

مس بورڈمن کی کوٹھی" فتح میدان" کے اس پار" نوبت پہاڑ" کے دامن میں ہے۔ کوٹھی کی پشت پر نوبت پہاڑ کی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کوٹھی کا نام" راک لینڈس" رکھا گیا ہوگا۔ حیدرآباد کے خوبصورت "باغ عام" (پبلک گارڈنس) کا ایک گوشہ اس کوٹھی کے مقابل تک آجاتا ہے جہاں سے وہ سرخ کوٹھی صاف نظر آتی ہے۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس وقت بھی اس کوٹھی کا رنگ سرخ تھا۔ شاید مالکہ ہمیشہ یہی رنگ کوٹھی پر پھروایا کرتی تھیں۔ غالباً مس بورڈمن سے شادی کے بعد نواب صاحب نے اپنی ذاتی کوٹھی خالی کر کے کرائے پر اٹھا دی تھی اور خود بھی" قصرِ گل رو" میں رہنے لگے تھے۔ نواب عمادالملک اور لیڈی عمادالملک دونوں کی وفات کے بعد یہ کوٹھی حکومت حیدرآباد نے خرید لی تھی اور اس کو سرکاری مہمان خانہ بنا دیا تھا جو" راک لینڈس گیسٹ ہاؤس" کہلاتا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح تقسیم ہند سے کچھ پہلے جب آخری بار حیدرآباد گئے تو اسی مہمان خانے میں ٹھہرائے گئے تھے۔

غرض ان اشعار کا لطف اٹھانے کے بعد مجھے نواب عمادالملک کے علاوہ لیڈی عمادالملک کو بھی دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی کہ آخر وہ کیسا حسنِ عالم سوز ہوگا جس نے عمادالملک کے سے متین سنجیدہ عالم کے دل میں جگہ کر لی! ایک روز میں صبح سویرے ہی وہ کتاب لے کر کوٹھی پر پہنچا، بیرے کو اپنا کارڈ دیا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ایک گوری چٹی، چہرے پر سیاہ چھائیاں پڑی ہوئی مجھ سے کوئی تین چار انچ اونچی، بے پناہ موٹی تازی خاتون جس کی ٹھوڑی کے نیچے سیر دو سیر گلابی گوشت لٹک رہا تھا جس کی بانہیں میری رانوں سے زیادہ موٹی تھیں — دروازے پر کھڑی ہیں۔ میں نے گھبرا کر حیدرآبادی انداز میں جھک کر سلام کیا۔ مسکرا کر انگریزی میں پوچھا" کیا آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا" جی ہاں، اسی لیے حاضر ہوا ہوں" ۔" ابھی آتے ہیں" کہا، اور لکڑی کے زینے پر زلزلہ ڈالتی ہوئی اوپر چلی گئیں۔ یہ تھیں لیڈی عمادالملک سابق لیڈی ڈاکٹر مس بورڈمن جو اپنے لبِ نازک سے مریضانِ عشق کی مسیحائی کرتی تھیں! یہ تھی" قصرِ گل رو" میں رہنے والی پری — جس کو اگر بچے دیکھ لیں تو ڈر جائیں — ہائے، حسن آخر ہے کیا چیز؟ — رنگین تتلی سرسبز ڈالی پر بیٹھی نظر آتی ہے پلک جھپکتے اڑ جاتی ہے اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی ہے۔ ڈالی جھومتی رہے مگر تتلی واپس نہیں آتی — میں نے" حسن" کو دیکھ لیا اور بے چینی سے" عشق" کے انتظار میں صوفے پر پہلو بدلتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد بیرا حقہ لایا اور ایک گوشے میں رکھ کر چلا گیا۔ لکھنؤ کے خمیرے کی خوشبو سے سارا ڈرائنگ روم مہک اٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرا بیرا ایک پیتے دار کرسی ٹھیلتا لایا۔ اس میں بھورے رنگ کا شاندار اونی فرغل (ڈریسنگ گون) پہنے نواب صاحب تشریف فرما تھے۔ سفید فرنچ کٹ داڑھی، گورے لمبوترے چہرے میں دو عقابی آنکھیں — جو میرے دل میں دھنسی جا رہی

تھیں، عجیب شخصیت تھی! میرے بدن میں تھرتھری سی پیدا ہوگئی۔ اپاہج تھے، چل پھر نہیں سکتے تھے۔ اگر کھڑے ہو سکتے تو میرے اندازے میں لیڈی عماد الملک سے بھی اُونچے نکلتے۔ کرسی حقے کے قریب قاعدے سے لگا دی گئی۔ میں نے جھک کر سلام کیا، انھوں نے حقے کی منہال منہ میں لی۔ میں نے وہ کتاب پیش کی اور کہا مولوی مختار احمد صاحب نے یہ کتاب بھیجی ہے۔ کتاب پر ایک نظر ڈال کر بیرے کو دے دی، اور حقے کے کش لیتے ہوئے باتیں شروع کیں تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اگر میرے مرحوم نانا زندہ ہوتے تو وہ بھی اتنے محبت بھرے لہجے میں گفتگو نہ کرتے۔ حقے کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے میری تعلیم کا حال، کالج میں میرے مضامین، نصاب کی کتابوں کے اور پروفیسروں کے نام ایسی دلچسپی اور تعلق خاطر سے پوچھے جیسے میرے چچا یا والد پوچھتے۔ (اگر پوچھتے)

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ نواب صاحب اب اس مقام پر ہیں جہاں سے قوم کا ہر نوجوان انھیں اپنی ہی اولاد اپنا ہی جگر گوشہ نظر آتا ہے۔ ان چند لمحوں تک مجھ پر بھی یہ کیفیت طاری رہی کہ یہ بزرگ کوئی غیر نہیں ہیں بلکہ ان سے میرا خونی رشتہ ہے — ایک طرح کا مسمریزم تھا، جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ شاید قوم کی سچی محبت انسان کو آخر کار اتنے بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ ہماری قوم میں ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو اس بلند مقام تک پہنچ سکے۔

جی چاہتا تھا کہ ان کے پاس سے نہ ٹلوں، مگر اُن کے چہرے پر نظر ڈالنے کی اور ان کی نگاہوں کی تاب لانے کی ہمت نہیں تھی۔ — ہائے، کیسے لوگ تھے؟ کہاں چلے گئے۔

نواب عماد الملک کے علاوہ میں نے صرف ایک بزرگ میں یہی انداز پایا تھا، اگرچہ اس کا رنگ کسی قدر مختلف تھا۔ وہ تھے سر شیخ عبدالقادر مرحوم۔ میری سر عبدالقادر مرحوم سے ایک سرسری ملاقات، بیس پچیس برس پہلے حیدر آباد دکن میں ہوئی تھی جب وہ پریوی کونسل کی رکنیت کی مدت ختم کر کے انگلستان سے واپس ہوئے تھے اور اپنے صاحبزادے سے ملنے کے لیے حیدر آباد دکن تشریف لائے تھے۔ مگر تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء میں، مرحوم کی وفات سے چند ماہ قبل لاہور میں مجھے متعدد بار ملنے کا موقع ملا۔ پہلی ہی ملاقات میں، میں نے وہی بزرگانہ شفقت پائی جو نواب عماد الملک میں دیکھی تھی، مگر اب میں کالج کا وہ ناتجربہ کار نوجوان نہیں تھا اس لیے سر عبدالقادر کی اس شفقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ متعدد مرتبہ گھنٹوں ان کی خدمت میں حاضر رہ کر علم اور تجربے کے وہ موتی چن لیے جو اس سمندر کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتے تھے۔

نواب عماد الملک نے علم اور اہل علم کی جو جو سرپرستیاں کی ہیں، ان کی داستان بہت طویل ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہیں ہوگا کہ اس دور میں دربار آصفیہ کی علمی سرپرستیوں کے جتنے بھی واقعات ہیں۔ ان کا نوے فیصد حصہ نواب عماد الملک کے اعمالِ خیر کا نتیجہ تھا۔ ان کی شاید آخری علمی سرپرستی جناب جوش ملیح آبادی کو حضور نظام میر عثمان علی خاں سے سفارش کر کے دارالترجمے کی ملازمت دلانا تھا۔

مولوی عبدالحق نے نواب صاحب کے متعلق جو مضمون لکھا ہے وہ ان کی سیرت اور سوانح حیات پر بہت اچھی اجمالی نظر ہے۔ مگر وہ مضمون اس نقطۂ نظر سے بہت تشنہ اور نامکمل ہے کہ اس میں نواب عماد الملک کی علمی سرپرستیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

وہ محترم خاتون لیڈی عماد الملک، جن کا ذکر میں نے اپنے عجز بیاں کی مجبوریوں سے گستاخانہ انداز میں کیا ہے، انگریزی کی اچھی ادیبہ تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ ان کے علم نواز، عالم شوہر کی ہم نشینی کا اثر ہو۔ لیڈی عماد الملک نے ایک انگریزی ناول لکھا تھا، جس کا نام "زہرا" تھا۔ مولوی عبدالحق نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا یا ترجمہ کر رہے تھے۔ اس کا اشتہار کسی پرانی مطبوعہ کتاب یا رسالے میں میری نظر سے گزرا تھا، چھپا ہوا ترجمہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ممکن ہے یہی ترجمہ مولوی صاحب کے لیے نواب عماد الملک کا تقرب حاصل کرنے کا وسیلہ بنا ہو۔

—— (۱۱) ——

انسان کے حافظے میں اپنے بچپن کے واقعات میں سے صرف چند ہی کی تصویریں محفوظ رہتی ہیں، خواہ وہ واقعات اہم ہوں یا غیر اہم۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا خیال ہے کہ حافظہ ایک ایسا فن کار ہے جو صرف اپنی پسند کے واقعات کی تصویروں کو محفوظ رکھتا ہے، اور ان تصویروں میں اپنی پسند کے مطابق ردّ و بدل بھی کر دیتا ہے —— یعنی واقعات کے فوٹو نہیں بلکہ ان کی فن کارانہ تصویریں حافظے کے نگارخانے میں سجی رہتی ہیں۔

اسی طرح کی ایک تصویر میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ میری عمر اُس وقت سات آٹھ سال کی ہوگی۔ میرے والد ریاست حیدرآباد کے ملازم تھے اور اس وقت ضلع نل گنڈہ میں متعین تھے جو شہر حیدرآباد سے چالیس پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ دو تین سال پہلے میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے وہ مجھے اضلاع میں اپنے ساتھ رکھنے لگے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اسی زمانے میں میرا شعور زندگی بیدار ہو رہا تھا۔ دُنیا بڑی سہانی نظر آتی تھی۔ والد اپنے ساتھ دعوتوں میں مجھے بھی لے جاتے تھے۔ والد کے دوست شاید یہ سمجھ کر کہ بے ماں کا بچہ ہے میرے ساتھ کچھ زیادہ ہی دلجوئی سے پیش آتے تھے۔

اس زمانے میں نلگنڈے میں میں نے وہ عجیب و غریب آسمانی چیز دیکھی جس کو دُمدار ستارہ کہتے ہیں۔ سرِ شام لوگ جوق در جوق کھڑے اس کو دیکھتے تھے اور خوف زدہ لہجے میں اس کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ لوگ پورے چاند کو اتنے تعجب سے کیوں نہیں دیکھتے، اس مدھم سے دُمدار تارے کو اتنے انہماک سے کیوں دیکھ رہے ہیں حالانکہ چاند اس سے کہیں روشن ہوتا ہے۔ لوگ آپس میں کہتے تھے کہ یہ جھاڑو تارہ بادشاہوں کی صفائی کر دیتا ہے۔ برسوں کے بعد دُمدار تارے کی اہمیت میری سمجھ میں آئی۔ وہ تارہ ہیلی کامٹ (ہیلی کا دمدار تارہ) تھا۔

اسی زمانے کی ایک دعوت بھی خوب یاد ہے جو کسی عہدے دار کے ہاں تھی۔ یہ انگریزی طرز کا ڈنر تھا جو میرے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس کورس میں ڈنر پورے ضابطے کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ہر کھانے کے بعد بیرا رکابی چھچے کانٹے اٹھالے جاتا اور دوسری صاف رکابی چھچے کانٹے رکھ جاتا تھا۔ ایک کھانے کے بعد دوسرا کھانا اتنی دیر سے آتا کہ میں سو سو جاتا تھا —— ہم کس شدت سے دماغی غلامی میں مبتلا ہیں! سو برس سے انگریزوں کی نقالی کرتے رہے۔ اب آزاد ہو کر بھی نقالی ہی کیے جا رہے ہیں خواہ امریکہ کی ہو یا روس کی! برٹش امپائر کی کمر ٹوٹ گئی۔ انگریز کا وہ امیرانہ ٹھاٹ ختم ہو گیا۔ وہ پرانے باقاعدہ ڈنر بھی ختم ہو گئے۔ اب نیکے ڈنر کا رواج ہوتا جا رہا

ہے۔ ہم اس میں بھی نقالی ہی کر رہے ہیں۔ پہلے کے امیرانہ ٹھاٹ کے ڈنر ہندوستان کی غریب قوم کو کسی طرح زیب نہیں دیتے تھے لیکن یہ بفے ڈنر بھی ہمارے مزاج اور ہماری ثقافت سے ہم آہنگی نہیں رکھتے۔ اس میں بلا کی سادگی ہے مگر یہ سادگی کچھ ایسا منظر پیش کرتی ہے جیسے کسی امیر کی شادی میں کھانا بٹ رہا ہو اور تمام گداگر اپنا اپنا کاسۂ گدائی لیے بھیک پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ جو کچھ مل جاتا ہے اس کو گھر لے جانے کی تاب نہیں اس لیے کھڑے کھڑے زہر مار کر رہے ہیں کہ شاید پھر کچھ مل جائے! متین، مہذب، تعلیم یافتہ عہدے دار، خوش پوشاک لوگ اپنی اپنی رکابی لیے جب بفے کی میز پر ہلّا بول دیتے ہیں تو میرے ذہن پر کسی گاؤں کے باہر مُردہ جانور کی لاش پر گدھوں کے ٹوٹ پڑنے کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ ہم ایک شاندار تاریخ کے وارث ہیں۔ ہم تہذیب اور شائستگی کی انتہائی بلندیوں کو چھو چکے ہیں۔ اپنی روایات کی روشنی میں ہم اپنی معاشرتی زندگی کے نئے سانچے بنا سکتے ہیں۔ ہماری معاشرتی زندگی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ دوسرے کو کسی قسم کی ذہنی یا جسمانی تکلیف نہ پہنچے۔ کسی کی دعوت کریں تو نہ صرف اپنی بساط کے مطابق بہتر سے بہتر غذا مہیا کریں بلکہ اس کے استقبال میں، اس کی خاطر داری میں، اس کی دوسری ضروریات میں اس طرح آسانیاں بہم پہنچائیں کہ وہ کسی قسم کا ذہنی یا جسمانی تکدر محسوس نہ کرے۔ اس لحاظ سے ان قدیم انگریزی وضع کے ڈنروں کو دیکھیے کہ دس آدمیوں کی دعوت کے لیے سو آدمیوں کی دعوت کے برتنوں اور نوکروں کا انتظام کرنا پڑتا تھا جو امیرانہ خود فریبی اور حمق کا ایک عجیب آمیزہ تھا۔ اور آجکل کے بفے ڈنروں پر نظر ڈالیے کہ ایک ایک قاب پر بیک وقت متعدد آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں اور ہاتھ میں رکابی لیے کھڑے کھڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی شخص اس حرکت کو باعث ننگ نہیں سمجھتا۔ اس میں کوئی چھچھورا پن محسوس نہیں کرتا۔ اس متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کھانا کھایا جاتا ہے، جیسے سو لپشت سے ہم ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں۔ بہرحال دونوں طریقوں میں نقالی ہے جو ایک پست اور شکست خوردہ ذہنیت کی علامت ہے۔

اس قدیم ڈنر کی ذہنی تصویر نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا!— ڈنر شاید آدھا ہو چکا تھا، رات بھیگ چکی تھی۔ خبر نہیں میں کرسی پر بیٹھا بیٹھا کتنی مرتبہ سویا اور جگایا گیا کہ کوئی شخص اس ہال میں آیا اور غالباً ضلع کے سب سے بڑے عہدے دار، یعنی کلکٹر ضلع کے کان میں کچھ کہا۔ وہ کرسی چھوڑ کر باہر گئے اور دیر تک باہر ہی رہے۔ ان کا انتظار کر کے دوسرے عہدے دار باہر گئے وہ بھی واپس نہیں آئے۔ اس کے بعد دو دو چار چار آدمی اُٹھ اُٹھ کر باہر گئے وہ بھی واپس نہ ہوئے۔ میز پر تھوڑے سے لوگ رہ گئے۔ بیرے ہاتھوں میں پلیٹ لیے حیرانی سے خالی کرسیوں کو چھوڑتے باقی ماندہ دعوتیوں کے سامنے نیا کورس پیش کرتے رہے — اس کے بعد یاد نہیں کہ میز کا کیا حال ہوا۔ میرے والد صاحب مجھے باہر لے گئے۔ میں نے باہر برآمدے میں عجب حال دیکھا۔ وہ سارے معمر، متین عہدے دار کھڑے بچوں کی طرح رو رہے ہیں۔ کوئی منہ پر رومال رکھے بسور رہا ہے۔ کوئی سسکیاں بھر رہا ہے۔ کوئی آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ یا اللہ یہ کیا تماشا ہے؟ کیا انگریزی ڈنر میں یہ بھی ہوتا ہے۔

— بس اس کے بعد حافظے پر ڈراپ سین ہے۔

برسوں کے بعد، قرنوں کے بعد، والد صاحب سے اور دوسرے بزرگوں سے سلسلے کی کڑیاں ملا کر میں نے اس واقعے کے

سبب کو متعین کیا، بات کیا نکلی؟ حضور مرحوم میر محبوب علی خاں کی وفات کی خبر اس ڈنر کے موقع پر پہنچی تھی۔

وہ واقعہ ۱۹۱۱ء کا تھا۔ کس کو خبر تھی اُس غمناک ڈنر کا دن ریاست حیدرآباد کی زندگی کا ایک موڑ تھا۔ انیسویں صدی کی طرز زندگی کا اختتام تھا۔ سالار جنگ کی مقرر کردہ قدروں کا خاتمہ تھا۔ محنت، صلاحیت، دیانت داری کی قدردانی کا یوم وفات تھا۔ خوشامد، بددیانتی، ریاکاری اور بے غیرتی کی کامرانی کا یوم ولادت تھا۔ وہ کتنا اہم دن تھا وہ کتنا یادگار ڈنر تھا۔

حضور نظام میر محبوب علی خاں کی وفات سے کچھ پہلے انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کی وفات ہو چکی تھی اور جارج پنجم اپنے باپ کی جگہ انگلستان کے بادشاہ اور ہندوستان کے شہنشاہ بن چکے تھے۔ جھاڑو تارے نے اپنے معتقدوں کو مایوس نہیں کیا۔

مولانا ظفر علی خاں ریاست حیدرآباد سے ۱۹۰۹ء میں حضور نظام میر عثمان علی خاں کی حمایت کی وجہ سے نکالے گئے تھے۔ عثمان علی خاں کی تخت نشینی پر ان کا خوش ہونا فطری امر تھا۔ میر محبوب علی خاں کی وفات رمضان کی چوتھی تاریخ کو ہوئی تھی عید کے موقع پر ظفر علی خاں نے زمیندار کا ایک خاص نمبر "نظام نمبر" کے نام سے نکالا۔ اس میں یہ جدت کی کہ اس کا اڈیٹوریل نظم میں لکھا جس میں شہنشاہ جارج پنجم کو مخاطب کرکے یہ رائے پیش کی کہ حضور نظام کو "ہز مجسٹی" بنایا جائے چنانچہ کہتے ہیں

چال وہ چل شہنشہا کہ بڑھے
یورپ اور ایشیا میں رسم و راہ
چوم لے ایشیا قدم تیرے
دیں تجھے ہم دعائیں شام و پگاہ
تو ہز امپیریل مجسٹی ہے!
ہز مجسٹی نہ کیوں ہو آصف جاہ

نظم کے بعد نثر میں بھی یہ عملی تجویز پیش کی ہے کہ جارج پنجم کا ہندوستان آنا اور دہلی میں دربار کرنا طے ہو چکا ہے اس دربار کے موقع پر حضور نظام کو "ہز مجسٹی" کا خطاب دیا جائے اور ان کی سلامی کی توپیں ۲۱ کے بجائے ۳۱ کردی جائیں۔ اس اڈیٹوریل کے علاوہ ایک قطعہ تاریخ بھی کہا :-

جلوس نظام اور تاریخ میری
کرے گا کوئی اس پہ کیا نکتہ چینی
دکن بلکہ ہندوستاں کی طرف سے
مبارک ہو تم کو یہ مسند نشینی
(۱۳۲۹ ہجری)

اس پرچہ کے صفحۂ اوّل پر مولانا حالی کا قطعہ تہنیت بھی شائع ہوا ہے جس کا پہلا شعر ہے :-

فلک مرتبت میر عثماں علی خاں
مبارک تمہیں مسند شہر یاری

قطعے کے آخر میں فرماتے ہیں :-

دعا گوئے دیرینہ ناچیز حالی
کہ مدحت گری کے ہنر سے ہے عاری
دعا کے سوا کچھ نہیں پاس اس کے
ادا جس سے ہو فرض مدحت نگاری

اسی پرچہ میں منیجر زمیندار کے ایک نوٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمیندار کو ظفر علی خاں کے اہتمام میں آئے تین چار ہی مہینے ہوئے تھے اس سے پہلے انھوں نے لاہور سے "ستارۂ صبح" کے نام سے ایک اخبار نکالا تھا۔ حضور نظام میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی اور مولوی عبدالحق کی محکمہ تعلیمات میں منتقلی ایک ہی سنہ میں ہوئی۔ چند ماہ کے بعد مولوی صاحب اورنگ آباد کے مہتمم تعلیمات بنا کر بھیج دیئے گئے اور ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب انجمن کے سکریٹری نامزد ہوئے۔ اگرچہ چند ماہ کا فرق پڑتا ہے مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عثمان علی خاں کا دورِ حکومت اور مولوی صاحب کا دورِ معتمدی انجمن ایک ساتھ شروع ہوا اور ایک لحاظ سے دونوں کا خاتمہ بھی ایک ساتھ ہوا۔

—— (۱۲) ——

میر محبوب علی خاں کی وفات کے وقت میر عثمان علی خاں کی عمر بیس بائیس سال کی تھی۔ تخت نشین ہوتے ہی انھوں نے مہاراجا کشن پرشاد کو دیوانی یعنی وزارت عظمیٰ سے علیحدہ کر دیا اور ان کی جگہ سر سالار جنگ اوّل کے پوتے نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث کو دیوان بنایا۔ ۱۹۰۵ء میں حضرت داغ دہلوی نے حیدرآباد میں وفات پائی تھی۔ ان کے شاگرد اور بہت سے متوسلین حیدرآباد ہی میں تھے۔ حضرت داغ کے خاص شاگرد حضرت احسن مارہروی نے نواب یوسف علی خاں کے دیوان بننے پر ایک قطعہ تاریخ کہا تھا جس کا آخری مصرع بے مثل ہے :-

تھی صبح عید سے بڑھ کر کہیں وہ صبح نورانی
کہ جب دم آئے صادق جنگ لے کر حکم سلطانی
کہا یوسف علی خاں سے کہ لو تم کو مبارک ہو
وزارت کی عطا شہ نے بہ الطاف فراوانی
پڑھو یہ مصرع تاریخ اے احسن دعائیہ!
خود آئی گھر میں یوسف کے زلیخائے دیوانی

یہ قطعہ تاریخ مجھے نواب ابوالحسن بلگرامی مرحوم نے اسی طرح لکھ کر دیا تھا۔ اس سے تاریخ کے صحیح اعداد نہیں نکلتے۔ ممکن ہے، اصل مصرع تاریخ میں ایک آدھ لفظ بدلا ہوا ہو۔ میں نے حضرت احسن مارہروی کے صاحبزادے محبی جناب سید احسن سے اس باب میں استفسار کیا تھا۔ موصوف نے بتایا کہ حضرت احسن مارہروی کے مسودات میں یہ قطعہ ہی موجود نہیں۔

نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث بھی حضور میر عثمان علی خاں کی طرح نوعمر تھے۔ اس لیے حضور نے اپنے اور اپنے والد کے استاد، نواب عماد الملک کو ان کا مشیر مقرر کیا۔ اس نئے عہدے کا نام "مشیر المہام" رکھا گیا۔ نواب یوسف علی خاں تقریباً تین سال تک دیوان رہے۔ ۱۹۱۴ء میں حضور نظام میر عثمان علی خاں نے انھیں علیحدہ کر دیا اور دیوانی کا کام خود انجام دینے لگے۔ یعنی خود ہی حکمراں بھی تھے اور خود ہی وزیر اعظم بھی۔ ان کا حکم یہ تھا کہ منظوری کے لیے جو کارروائی ان کے ملاحظے میں پیش ہو وہ محکمہ فینانس کی رائے کے ساتھ پیش ہو۔ فینانس کے وزیر مسٹر آر۔ آئی۔ آر گلانسی تھے۔ اس لیے ہر اہم معاملے میں مسٹر گلانسی کی منظوری ضروری تھی۔ حضور نظام اکثر محکمہ فینانس کی رائے سے اتفاق کر کے فوراً کارروائی واپس کر دیتے تھے۔ لیکن اس ضابطہ عمل سے اکثر معاملات میں مسٹر گلانسی ہی عملاً وزیر اعظم تھے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ریاست کا خزانہ مسٹر گلانسی کے قبضے میں تھا انھیں اس کا اچھا موقع ملا کہ ریاست کے تمام اخراجات پر کڑی نظر رکھیں اور سخت کفایت شعاری سے کام لے کر خزانہ بھرا رکھیں، نہ وہ روپیہ حکومت برطانیہ کو جنگ کی امداد اور جنگی قرضوں میں دیا جا سکے۔ ریاست کے بہت سے ترقی کے منصوبے رکھے رہے۔ کروڑوں روپیہ حکومت برطانیہ کی نذر ہوتا گیا۔ نقد روپیے کے علاوہ ریاست کی فوج باقاعدہ بھی جس کو افسر جنگ نے انگریزی فوج کی طرح تربیت دی تھی، انگریزوں کی مدد کے لیے جنگ پر بھیجی گئی اس کے سارے اخراجات ریاست کے ذمے تھے۔ افسر جنگ اگرچہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے مگر کمانڈر انچیف وہی تھے۔ ایک مرتبہ وہ بھی محاذ جنگ پر جا کر اپنی فوج کو دیکھ آئے تھے۔

مسٹر حیدری جو موم سکریٹری ہو چکے تھے محکمہ تعلیم پر پورا اقتدار رکھتے تھے۔ انھیں ریاست میں تعلیم پھیلانے کی دھن تھی۔ نواب عماد الملک بائیس سال تک ناظم تعلیمات یعنی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن رہنے کے بعد پنشن لے چکے تھے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ڈاکٹر سراج الحسن ناظم تعلیمات تھے وہ محکمہ عدالت میں منتقل ہو گئے۔ مسٹر حیدری محکمہ تعلیمات کے بھی معتمد تھے اور محکمہ عدالت کے بھی۔ ڈاکٹر سراج الحسن کی محکمہ عدالت میں منتقلی انھی کی توجہ سے ہوئی ہوگی اس کے بعد مسٹر حیدری نے ڈاکٹر اما لطیفی کی خدمات کو صوبہ پنجاب سے مستعار لے کر محکمہ تعلیم کا ڈائرکٹر بنایا۔ ڈاکٹر اما لطیفی نے اس محکمے کی کارکردگی کو بہت بڑھایا اور اس کی ترقی اور توسیع کی داغ بیل ڈالی مگر سال دو سال کے بعد ہی وہ برٹش انڈیا میں اپنی اصلی خدمت پر واپس چلے گئے۔ ڈاکٹر اما لطیفی مسٹر حیدری کے سسرالی عزیز تھے۔ حیدر آباد میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ کسی خانگی رنجش کی وجہ سے حیدر آباد سے چلے گئے۔ محکمہ تعلیم کے لوگوں کو ڈاکٹر اما لطیفی کے واپس جانے کا بہت رنج ہوا۔ ان کی رخصت کے وقت لوگوں نے نظمیں کہیں جن میں اظہار رنج کیا گیا تھا۔

۱۹۱۵ء میں اما لطیفی حیدر آباد سے رخصت ہوئے۔ مولوی عبدالحق تین چار سال قبل محکمہ تعلیم میں منتقل ہو چکے تھے اور اب اورنگ آباد کے مہتمم تعلیمات (انسپکٹر آف اسکولس) تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت میں مسٹر حیدری سے مولوی صاحب کے تعلقات اچھے

ہو چکے تھے۔ ممکن ہے کہ مولوی صاحب نے خود، یا کسی اور ذریعے سے مسٹر حیدری کو یہ سمجھایا ہو کہ الما لطیفی کی جگہ محکمہ تعلیم کی نظامت (ڈائریکٹری) پر سرسید کے پوتے مسٹر سید راس مسعود کو بلایا جائے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ راس مسعود کو نظامت تعلیمات پر بلانے کے لیے مولوی صاحب نے نواب عماد الملک کو آمادہ کیا ہو اور نواب صاحب نے خود مسٹر حیدری کو یا حضور نظام کو راس مسعود کے متعلق کہا ہو۔ بہرحال مسٹر حیدری، راس مسعود کی نظامت تعلیمات پر آمد سے خوش تھے اور بارہ برس تک، جب تک کہ مسعود حیدرآباد میں رہے، کوئی اختلاف ان دونوں میں نہیں ہوا۔ سررشتہ تعلیم کی ترقی میں دونوں بڑی ہم آہنگی اور تعاون کے ساتھ کام کرتے رہے۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد علی گڑھ کالج کے پرنسپل سر تھیوڈور مارسین نے راس مسعود کو اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔ ان کے ولایت چلے جانے کے بعد مسعود نے علی گڑھ ہی سے میٹرک پاس کیا اور کالج کی جماعت میں زیر تعلیم تھے کہ گورنمنٹ نے انھیں وظیفہ دے کر تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ انھوں نے آکسفرڈ سے بی اے کیا اور بیرسٹر ہوئے۔ پانچ سال کے بعد ہندوستان آئے اور پٹنے میں وکالت شروع کی مگر کچھ ہی مدت کے بعد ان کا دل وکالت سے اچاٹ ہو گیا۔ جناب سید محی الدین بی اے بار ایٹ لا نے (جو مولوی عبدالحق کے بعد اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوئے) مجھے وہ واقعہ سنایا تھا جس کی وجہ سے راس مسعود نے وکالت ترک کر دی۔ ایک ہندو ٹھاکر کی وفات کے بعد اس کی بیوہ اور دوسرے وارثوں میں مقدمہ بازی شروع ہوئی۔ بیوہ کے خلاف دوسرے دعوے داروں نے راس مسعود کو اپنا وکیل بنایا۔ انھوں نے اتنی عمدگی سے مقدمہ چلایا کہ فیصلہ ان کے موکلوں کے موافق ہوا اور بیوہ اپنے شوہر کی املاک سے محروم ہو گئی۔ کسی نے اس بیوہ کو یہ کہہ دیا ہوگا کہ تو اس بیرسٹر کی وجہ سے مقدمہ ہار گئی۔ عورت ذات اپنی محرومی اور مایوسی کے عالم میں راس مسعود کی کوٹھی پر آئی اور باہر سے کھڑے کھڑے دلدوز انداز میں راس مسعود کو کوسنا شروع کیا کہ "او بیرسٹر تو نے مجھ بیوہ کو آج اپنے شوہر کی جائداد سے محروم کر کے بھکاری بنا دیا۔ بھگوان تجھے اس کی سزا دے گا"۔ بیوہ کی آہ و زاری اور دل خراش بد دعاؤں نے راس مسعود کی کامیابی کی ساری خوشی مٹی میں ملا دی۔ ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے وکالت کا پیشہ ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا اور محکمہ تعلیم میں ملازمت کر لی پہلے پٹنا ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے اور بعد میں گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۱۵ء میں ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) کی خدمت پر حیدرآباد بلائے گئے۔

راس مسعود کے حیدرآباد آجانے اور تعلیمات کے افسر اعلیٰ بن جانے سے مولوی صاحب کی قوت بہت بڑھ گئی۔ انھیں نہ صرف انجمن کے کاموں کو بڑھانے اور اس کی مالی حالت بہتر بنانے کا موقع ملا بلکہ اردو میں تعلیم دینے والی یونیورسٹی کے خیال کو قابل عمل بنانے میں بڑی امداد ملی۔

(۱۳)

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی اور علمی بیداری دو آدمیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ پہلے شخص نواب عماد الملک تھے، جن کے ہاتھوں گویا سررشتہ تعلیم کی بنیاد پڑی۔ شہر حیدرآباد اور اضلاع میں جدید وضع کے مدرسے کھولے گئے۔ اس ابتدائی زمانے میں ریاست کی آمدنی بہت کم تھی۔ سر سالار جنگ نے بڑی مشکل سے اس کے آمد و خرچ کو متوازن کیا تھا۔ محکمہ تعلیمات کا بجٹ آٹھ لاکھ روپے سالانہ سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ عماد الملک کے بعد سر اکبر حیدری نے تعلیم کو بہت ترقی دی۔ ان کی خوش قسمتی سے پہلی جنگ عظیم کے بعد ریاست کی آمدنی بہت بڑھ گئی۔

سراکبر حیدری ہوم سیکریٹری، یعنی محکمہ تعلیم کے سیکریٹری بھی تھے اور خود ماہر مالیات (فنانس) بھی تھے۔ محکمہ تعلیم کا خرچ اس انداز سے بڑھاتے گئے کہ وزیر فینانس مسٹر گلانسی کو روڑے اٹکانے کا موقع نہ ملے۔ محکمہ تعلیم کی حالت درست کرنے کے لیے انھوں نے ڈاکٹر سراج الحسن کو نظامت تعلیمات سے ہٹا کر ڈاکٹر الماطیفی کو بلایا۔ اگرچہ ڈاکٹر الماطیفی نے محکمہ تعلیم کی کارکردگی کو بہت اچھا بنا دیا تھا مگر حیدری صاحب کو اپنے عزائم میں ان کی مدد سے مایوسی ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں راس مسعود کو نظامت تعلیمات پر بلایا گیا۔ انھوں نے حیدری صاحب سے نہ صرف پورا پورا تعاون کیا بلکہ اپنی غیر معمولی شخصیت کی وجہ سے حیدری صاحب کے دست راست ثابت ہوئے۔ تعلیم کو وسعت دینے کا شوق تو گویا راس مسعود صاحب کو وراثت میں ملا تھا۔

مولوی عبدالحق ۱۹۱۲ء کے آخر میں انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری بنائے گئے تھے۔ کام کا آغاز ۱۹۱۳ء میں ہوا ہوگا۔ ۱۹۱۵ء تک مولوی عبدالحق اور حیدری صاحب میں بڑی ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ حیدرآباد میں یونیورسٹی کی ضرورت تو مدت سے محسوس کی جا رہی تھی کیونکہ ریاست کے تنہا ڈگری کالج یعنی نظام کالج سے بقول شخصے سالانہ ڈیڑھ دو گریجویٹ نکلتے تھے۔ یہ کالج مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ مدراس یونیورسٹی ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں ایک عجوبہ سمجھی جاتی تھی۔ تعلیمی نصاب اتنا مشکل رکھا گیا تھا کہ طالب علموں کی تمام ذہنی قوتوں کا خاتمہ کر دیتا تھا۔

یونیورسٹی میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا خیال مولوی عبدالحق اور صرف مولوی عبدالحق کا تھا۔ انھوں نے مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تائید میں کئی مشاہیر کی رائے حاصل کر لی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام جس طرح ہوا اس کا حال خود مولوی صاحب نے اپنے ایک یادگار خط میں بیان کیا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر رحیم الدین کمال کو لکھا تھا۔ ("اردو" بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء)

مولوی صاحب کا بیان " یہ بہت اچھا ہوا کہ روسی زبان میں عثمانیہ یونیورسٹی پر آپ سے مضمون لکھوایا جا رہا ہے۔

الماطیفی نے اس یونیورسٹی کے بنانے میں کوئی کام نہیں کیا۔ وہ اس تحریک کے مخالف تھے۔ وہ انگریزی کے بجائے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خیال کو ناقابل عمل سمجھتے تھے۔

سر راس مسعود جب آئے تو یہ تحریک چل چکی تھی یعنی دفتر کی مسل میں آ گئی تھی۔ ابتدائی کام ہو رہا تھا۔ راس مسعود کو ابتدا میں اس بارے میں بہت کچھ شبہ تھا۔ وہ قطعی طور پر کوئی رائے قائم نہ کر سکے۔

سراکبر حیدری اور مجھ سے اس کے متعلق گفتگو اور بحث ہوتی رہی۔ اور آخر میں وہ قائل ہو گئے۔ قائل ہونے کے بعد انھوں نے پوری مستعدی سے کام لیا۔ اصل کام سراکبر حیدری نے کیا۔ وہ اگر اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تو یہ تحریک چل ہی نہیں سکتی تھی۔

آپ پوچھیں گے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ ہوا یہ کہ، ایک بار سراکبر اورنگ آباد آئے اور میں نے ان کی صدارت میں ایک تقریر "مروجہ تعلیم اور طریقہ تعلیم" پر کی۔ اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اس کا اعتراف خود انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کیا جو انھوں نے اورنگ آباد کے ایک سالانہ جلسے میں کی تھی۔ ... وہ نورس (کالج کا رسالہ) میں چھپی تھی ....

خیر، حیدری صاحب تو آمادہ ہو گئے۔ وہ خود اس کی تحریک نہیں کر سکتے تھے، البتہ ان کے سامنے یہ تحریک آئے تو وہ کارروائی کرنے کو تیار تھے۔ الما لطیفی کے ذریعے اس تحریک کو پیش کرنا خلافِ مصلحت تھا۔ وہ اس کے مخالف تھے۔ اُس زمانے میں دارالعلوم کے پرنسپل مولوی حمیدالدین مرحوم تھے۔ انھوں نے میرے متواتر اصرار پر یہ عہدہ قبول کیا تھا۔ میں نے انھیں ہم خیال بنا لیا اور اُن سے کہا آپ بہ حیثیت پرنسپل دارالعلوم یہ تحریک کیجیے۔ انھوں نے کہا: "تم لکھ دو میں دستخط کر دوں گا" میں نے ہوم سیکریٹری کے نام چند سطریں لکھ کر درخواست پیش کر دی۔ ہوم سیکریٹری اس وقت سر اکبر حیدری تھے۔ اب بموجب انگریزی محاورے کے، گیند لڑھکنا شروع ہوئی۔ مجھے اورنگ آباد سے اسپیشل ڈیوٹی پر بلایا گیا۔ کام دھیرے دھیرے شروع ہوا۔ عرضداشت جو اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں منظوری کے لیے پیش کی گئی وہ میری ہی لکھی ہوئی تھی۔"

اُوپر میں نے عرض کیا ہے کہ حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اخباروں میں یونیورسٹی کی ضرورت اور مطالبے پر جو مضامین لکھے جاتے تھے۔ اُن میں یونیورسٹی کا مجوزہ نام کلکتہ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی کے نمونے پر "حیدرآباد یونیورسٹی" تھا۔ "عثمانیہ یونیورسٹی" کا نام کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ یونیورسٹیاں عموماً شہروں یا ملکوں کے نام سے موسوم کی جاتی تھیں نہ کہ حکمرانوں کے نام سے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جدت بھی خاص مولوی عبدالحق ہی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ میرے خیال میں اس میں ایک خاص مصلحت تھی جو ذرا قصہ طلب ہے:

مولوی احمد حسین (نواب سر امین جنگ) صوبہ مدراس کے ایک مقام وانم باڑی کے رہنے والے تھے۔ ان کو حضور مرحوم میر محبوب علی خاں کے زمانے میں نواب سرور جنگ معتمد پیشی حضور مرحوم (یعنی پرسنل سیکریٹری) نے اپنا مددگار (اسسٹنٹ) بنا لیا تھا۔ سرور جنگ انگریزی نہیں جانتے تھے اور مولوی احمد حسین مدراس یونیورسٹی کے ایم۔ اے، ایل ایل بی تھے۔ چند سال کے بعد نواب سرور جنگ نے مولوی احمد حسین کے کام سے خوش ہو کر اُن کی تنخواہ میں اضافے کی عرضداشت حضور مرحوم کی خدمت میں پیش کی۔ عرضداشت کچھ اس طرح کی تھی کہ — مولوی احمد حسین (شاید) تین سو تنخواہ پاتے ہیں۔ اس پر ایک سو کا اضافہ فرمایا جائے تو ان کی تنخواہ چار سو ہو جائے گی جس کے وہ مستحق ہیں — حضور مرحوم میر محبوب علی خاں نے اس پر حکم لکھا — مولوی احمد حسین کی تنخواہ پر چار سو کا اضافہ کیا جاتا ہے (تنخواہ کے صحیح اعداد مجھے یاد نہیں رہے) سرور جنگ نے اپنی سوانح حیات "کارنامہ سروری" میں یہ واقعہ اتنا ہی لکھا ہے مگر حیدرآباد کے معتبر آدمیوں سے اس کا "تکملہ" یہ سُنا تھا کہ حضور نظام کی اس تجویز کے جواب میں سرور جنگ نے مکرر عرضداشت لکھی کہ اصل عرضداشت میں صرف سو روپے کے اضافے کی درخواست کی گئی تھی تاکہ مولوی احمد حسین کی تنخواہ چار سو ہو جائے۔ حضور والا نے چار سو کا اضافہ منظور فرمایا ہے۔ اس سے ان کی تنخواہ سات سو روپے قرار پاتی ہے۔ اس کے جواب میں حضور مرحوم نے لکھا — میں نے جو کچھ لکھا لکھا مولوی احمد حسین کو سات سو روپے ہی تنخواہ ملے گی۔ آیندہ سے عرضداشت احتیاط کے ساتھ لکھی جائے — یہ تھا حضور مرحوم کی دریادلی کا رنگ۔

سازشوں کے ایک سلسلے میں انگریزی حکومت کے ایما بلکہ دباؤ سے حضور مرحوم نواب سرور جنگ کو "شہر بدر" (خارج البلد) کرنے پر

مجبور ہوئے ۔ ان کے جاتے ہی حضور مرحوم نے مولوی احمد حسین ہی کو معتمد پیشی بنالیا ۔ یہ بات مولوی احمد حسین کے بلند کردار اور اعلیٰ قابلیت کا ثبوت ہے کہ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد انھی کو اپنا معتمد پیشی رکھا ۔ ورنہ باپ کے زمانے کے اکثر لوگوں کو الگ کرچکے تھے ۔

حضور نظام میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی کے دو تین سال کے بعد غالباً ۱۹۱۴ء میں مولوی احمد حسین (سر امین جنگ) کے وطن وانم باڑی کے چند علم دوست حضرات نے مسلمان طلبہ کے لیے وانم باڑی میں ایک انٹر کالج قائم کرنا چاہا جس کا نام انھوں نے "اسلامیہ کالج وانم باڑی" رکھا ۔ اس کالج کی امداد کے لیے مولوی احمد حسین ، سر امین جنگ سے رجوع کیا ۔ سر امین جنگ نے وانم باڑی والوں کی درخواست اپنی سفارش کے ساتھ حضور نظام میر عثمان علی خاں کے ملاحظے میں پیش کی حضور نظام نے اس کالج کے لیے دس یا بارہ ہزار روپے سالانہ کی امداد منظور کی اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ اس کالج کا نام "عثمانیہ کالج" رکھا جائے ۔

وانم باڑی والوں کو کالج کے نام کی تبدیلی پسند نہ آئی ۔ وہاں کے مسلمان تاجروں نے اتنی رقم کا ذمہ لے لیا جو حضور نظام نے منظور کی تھی اور ان لوگوں نے حضور نظام کی امداد لینے سے انکار کردیا ۔ یہ بات اخباروں میں بھی آگئی ۔ ظاہر ہے اس پر حضور نظام میر عثمان علی خاں نے اپنی کتنی سبکی محسوس کی ہوگی ۔ ان کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ ہر یادگار چیز کو اپنے نام سے وابستہ کرنا چاہتے تھے ۔

فرماں روائے دکن کی اس ذہنی کیفیت کے عالم میں حیدرآباد کی یونیورسٹی کو فرماں روا کے نام پر "عثمانیہ یونیورسٹی" سے موسوم کرنا کس قدر برمحل مصلحت اندیشی تھی ۔ نام کی بدولت ، اس تجویز کے نامنظور ہونے کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا ، اور جیسا کہ سوچا گیا ہوگا ۔ حضور نظام میر عثمان علی خاں کو عثمانیہ یونیورسٹی سے آخری دم تک خاص لگاؤ رہا ۔ فرماں روا کے اس لگاؤ کی وجہ سے یونیورسٹی کے اور بہت سے کام آسان ہوگئے ۔

جیسا کہ مولوی صاحب نے لکھا ہے ، انھیں اسپشل ڈیوٹی پر سر اکبر حیدری نے حیدرآباد بلا لیا ۔ لیکن انجمن ترقی اردو کے کاموں کا لحاظ کرتے ہوئے انھیں مہینے میں دس روز اورنگ آباد میں رہنے کی اجازت دی گئی ۔ اُردو میں تعلیم دینے کے لیے یونیورسٹی کے افتتاح سے پہلے دو چیزوں کی تکمیل ضروری اور لابدی تھی ۔ اوّل تو نصاب کی کتابوں کی تیاری یعنی سائنس اور فنون کی تعلیم کے لیے معیاری انگریزی کتابوں کے ترجمے ۔۔۔ اور دوسرے ان طلبہ کی ابتدائی تعلیم جو کالج میں اُردو میں سائنس اور دوسرے علوم کی تعلیم پانے والے ہوں ۔

انگریزی کتابوں کے ترجموں میں کام آنے والے اُردو اصطلاحات کا کام سب سے مقدم تھا ۔ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب ہی کی تحریک ہوگی جس پر یہ کام انجمن ترقی اُردو کو دیا گیا اس کے لیے تین ہزار روپے منظور کیے گئے ۔ ترجموں کے کام کے لیے نظامت تعلیمات کے تحت ایک سررشتہ "دارالترجمہ" ۱۹۱۶ء میں قائم کیا گیا اور مولوی عبدالحق اس کے ناظم بنائے گئے ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے حال ہی میں میرے ایک استفسار کے جواب میں مطلع فرمایا تھا کہ منطق اور فلسفے کی کتابوں کے ترجمے کے لیے راس مسعود صاحب کی طرف سے ایک تار پر ان کا تقرر ہوا تھا اور وہ یکم ستمبر ۱۹۱۶ء کو حیدرآباد پہنچے اور اسی روز سے کام شروع کردیا ۔ یہ سررشتہ

اگست کے مہینے میں قائم ہو گیا ہوگا اور اُن مترجموں نے جو حیدرآباد میں پہلے سے موجود تھے کام شروع کر دیا ہوگا۔

اُردو میں ابتدائی تعلیم پائے ہوئے طلبہ کی فراہمی کے لیے اورنگ آباد کے مدرسہ فوقانیہ میں اور حیدرآباد کے مدرسہ دارالعلوم میں جہاں منشی اور مولوی کی تعلیم ہوتی تھی، ایسی جماعتیں کھول دی گئیں جہاں ایک مضمون انگریزی کے سوا عثمانیہ میٹرک کے سارے مضامین کی تعلیم اُردو میں دی جاتی تھی۔ یہ اندازہ کیا گیا ہوگا کہ دو سال کے اندر ایف اے (انٹرمیڈیٹ) کی نصابی کتابوں کا ترجمہ تیار اور شائع ہو جائے گا۔ ۱۹۱۸ء میں عثمانیہ میٹرک کا پہلا امتحان ہوا۔ بہت کم طلبہ کامیاب ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں میٹرک کا دوسرا امتحان ہوا۔ ان دو امتحانوں میں کامیاب ہونے والے طلبہ سے ۱۹۱۹ء میں کالج کھولا گیا۔

۱۹۱۸ء میں حضور نظام میر عثمان علی خاں نے "عثمانیہ یونیورسٹی" کے قیام کی منظوری کا فرمان جاری کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، اسی سال ریاست کا انتظامی ڈھانچا بدلا گیا۔ باب حکومت (مجلس وزرا) کا قیام عمل میں آیا۔ سر علی امام "صدراعظم" کے لقب سے باب حکومت کے صدر نشین قرار پائے۔ مسٹر آر۔ آئی آر گلانسی وزیر مالیات (فینانس) ریاست سے رخصت ہو گئے اور سر اکبر حیدری وزیر مالیات بنے۔ حکومت کی اس اہم تبدیلی کا حال کسی قدر تفصیل سے آگے بیان کیا جاتا ہے۔ بہرحال یونیورسٹی کے افتتاح سے کچھ ہی پہلے سر اکبر حیدری کا وزیر فینانس بن جانا، اس کے حق میں بے حد مفید ہوا۔

نظام الدین حسین مالک نظامی پریس کے نام کے جو خطوط محمد ایوب قادری صاحب نے مرتب کر کے رسالہ اُردو — بابائے اردو نمبر بابت ۱۹۶۲ء میں دیئے ہیں، ان میں مولوی عبدالحق اپنے ۳۰ر جولائی ۱۹۱۹ء کے مکتوب میں حیدرآباد سے لکھتے ہیں :۔

"یہ صحیح ہے کہ میں نے موجودہ ملازمت سے استعفا دے دیا ہے اور اپنی اصلی ملازمت اورنگ آباد پر واپس جا رہا ہوں۔"

اور پھر اورنگ آباد سے ۱۱ر اگست ۱۹۱۹ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں :۔

"میں اورنگ آباد آ گیا ہوں، آیندہ مراسلت اورنگ آباد ہی کے پتے پر ہوا کرے۔"

واضح رہے کہ ۲ر اگست ۱۹۱۹ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کالج کا افتتاح ہوا۔ کالج کے افتتاح کے دو تین دن ہی کے بعد مولوی صاحب دارالترجمہ کی نظامت چھوڑ کر اپنی اصل خدمت پر اورنگ آباد چلے گئے۔ عثمانیہ کالج کے افتتاح کے موقع پر راس مسعود حیدرآباد میں نہیں تھے۔ جاپان کے طریقہ تعلیم کا مطالعہ کرنے کے لیے چھ ماہ کے لیے جاپان بھیجے گئے تھے۔ ان کی جگہ نواب عمادالملک کے چھوٹے صاحبزادے نواب مہدی یار جنگ منصرم ناظم تعلیمات تھے۔ کالج کے لیے پرنسپل کا انتخاب بھی نہیں ہوا تھا اس لیے منصرم ناظم تعلیمات عارضی پرنسپل قرار دیئے گئے اور انہی کے ہاتھوں کالج کا افتتاح ہوا۔ یونیورسٹی کالج کے لیے جو کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی وہ نظامت تعلیمات کے دفتر کے قریب ہی تھی اس لیے مہدی یار جنگ آسانی سے گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اپنے دفتر سے کالج کو جا سکتے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کالج کے افتتاح کے بعد ہی مولوی عبدالحق دارالترجمہ چھوڑ کر اورنگ آباد کیوں چلے گئے۔ کالج تو کھل گیا تھا مگر نصاب کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ تیار نہیں ہوا تھا اور پھر مولوی صاحب کے جانے کے بعد تقریباً ایک سال تک دارالترجمے کی نظامت کے لیے کوئی موزوں آدمی نہیں ملا۔ مولوی صاحب کے اس طرح اچانک اورنگ آباد چلے جانے کا جو پس منظر ہے وہ یہاں عرض کرتا ہوں۔

انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری بننے کے بعد مولوی صاحب نے مولانا عبدالماجد دریا بادی سے دو کتابیں لکھوائی تھیں۔ فلسفہ جذبات اور فلسفہ اجتماع۔ یہ دونوں کتابیں الناظر پریس لکھنؤ سے شائع ہوئیں جس کو مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کا پبلشر مقرر کیا تھا فلسفہ اجتماع کی طباعت کا سنہ غالباً ۱۹۱۵ء بتایا گیا تھا مگر یہ کتاب ۱۹۱۶ء یا شاید ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر سخت لے دے ہوئی۔ اعتراض یہ تھا کہ اس میں دہریت بھری ہوئی ہے۔ بزرگان دین کا ذکر گستاخانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ ان اخباری تنقیدوں کی بنا پر یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ مولانا عبدالماجد کو حیدرآباد سے خارج البلد کر دیا جائے گا۔ ادھر مولانا عبدالماجد ملازمت کی پابندیوں سے گھبرا چکے تھے۔ وہ صرف گیارہ مہینے کام کرنے کے بعد جولائی ۱۹۱۷ء میں ایک ماہ کی رخصت لے کر حیدرآباد سے چلے گئے اور پھر استعفا دے دیا۔ مگر فلسفہ اجتماع پر تنقیدوں اور اعتراضوں کا سلسلہ ۱۹۱۸ء تک جاری رہا۔ کسی نہ کسی طرح یہ بات حضور نظام تک پہنچی یا پہنچائی گئی کہ فلسفہ اجتماع کے لکھوانے اور شائع کرانے کی ذمہ داری مولوی عبدالحق پر ہے۔ اس پر ۱۹۱۹ء میں حضور نظام نے حکم دیا کہ مولوی عبدالحق کو شہر سے باہر بھیج دیا جائے۔ یعنی وہ "ریاست بدر" نہیں کیے گئے بلکہ صحیح معنوں میں "شہر بدر" کیے گئے۔ اس حکم کی بنا پر مولوی صاحب اپنی اصل خدمت مہتممی تعلیمات (انسپکٹر آف اسکولس) اورنگ آباد کی خدمت پر لوٹا دیئے گئے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس زمانے میں قاعدہ یہ تھا کہ حضور نظام کے احکام محکمہ فینانس کے ذریعے جاری ہوتے تھے۔ مولوی صاحب کے "شہر بدر" ہونے کے سلسلے میں حیدرآباد کے واقف کار حضرات سے یہ سنا تھا کہ فخرالدین احمد خاں (نواب فخر یار جنگ) نے جو اس وقت معتمد فینانس (فینانس سیکریٹری) ہو چکے تھے، حضور نظام کے اس حکم کے ساتھ اس شرط کا اضافہ کر دیا کہ — مولوی عبدالحق اگر شہر حیدرآباد میں آئیں تو اجازت لے کر آئیں — لیکن سر اکبر حیدری وزیر فینانس تھے اس لیے مولوی صاحب کو اس شرط کا پابند کون کر سکتا تھا۔ مولوی صاحب جب ضروری ہوتی دھڑلے سے حیدرآباد آتے رہے۔ اس فرمان کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ آہستہ آہستہ لوگ بھی بھول بھال گئے۔

مولوی صاحب ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۹ء تک تقریباً تین سال ناظم دارالترجمہ کی حیثیت سے حیدرآباد میں رہے۔ انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد ہی میں تھا اس لیے مولوی صاحب ہر ماہ اورنگ آباد جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے مجھ سے ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ سر اکبر حیدری نے مولوی صاحب سے یہ کہا تھا کہ — دارالترجمے کو بھی اپنے ساتھ اورنگ آباد لے جاؤ۔ یہ لوگ (یعنی مترجمین) وہاں یا تو ترجمہ کریں گے یا اورنگ آباد کے پہاڑوں سے سر پھوڑیں گے۔ یہاں کی طرح عہدے داروں کے بنگلوں کا طواف نہیں کر سکیں گے۔ — یہ بات سر اکبر نے مولوی صاحب کی اورنگ آباد کو واپسی کے وقت کہی ہوگی۔

ان تین چار سالوں کے اندر محکمہ تعلیمات میں بڑے تغیرات رونما ہوئے۔ سر اکبر حیدری وزیر فینانس بنے تو محکمہ تعلیمات کے لیے خزانے کا منہ کھول دیا۔ راس مسعود پوری طرح سر اکبر کی منشا کے مطابق کام کرتے تھے۔ ہر سال مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کام بڑھ جانے کی وجہ سے صوبے بھر کے لیے ایک انسپکٹر آف اسکولس کے بجائے چار انسپکٹرس آف اسکول یعنی ہر ضلع کے لیے ایک ایک انسپکٹر مقرر ہوا۔ اس کے سال دو سال کے بعد ہر صوبے پر ایک صدر مہتمم تعلیمات یعنی ڈیویژنل انسپکٹر آف اسکولس مقرر ہوا۔ صوبہ اورنگ آباد کی صدر مہتممی پر محکمہ تعلیمات کے ایک قدیم تجربہ کار افسر مولوی اللہ بخش صاحب بھیجے گئے جو محکمہ تعلیم میں مولوی عبدالحق سے بہت پرانے (سینیئر) تھے۔ ان کی پنشن کے دن قریب تھے۔ ۱۹۱۹ء ہی میں مولوی اللہ بخش کو پنشن ہوگئی۔ اب مولوی صاحب اورنگ آباد کو لوٹائے گئے تو مولوی اللہ بخش کی جگہ صدر مہتممی اورنگ آباد کی خدمت پر لوٹے۔

مولوی اللہ بخش پنجاب کے رہنے والے بزرگ تھے۔ وہ مدتوں مدرسہ تعلیم المعلمین (ٹیچرس ٹریننگ اسکول) کے پرنسپل رہ چکے تھے۔ آخری زمانے میں انھیں ترقی پر اورنگ آباد کا صدر مہتمم بن کر جانا پڑا۔ پنشن لینے کے کچھ ہی عرصے کے بعد انھوں نے وفات پائی اور اپنا سارا پس انداز سرمایہ جو شاید پچیس تیس ہزار روپے سے زائد ہی تھا محکمہ تعلیم کے مفاد میں صرف کرنے کی وصیت کر گئے۔

اسی زمانے میں — یعنی ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد کی سیاسی اور انتظامی حالت میں بڑا تغیر واقع ہوا۔ مدارالمہام یعنی وزیر اعظم کا کام خود حضور نظام انجام دے رہے تھے۔ اب انھوں نے وہ کام مجلس وزرا (باب حکومت) کے سپرد کیا اور اس مجلس کا صدر "صدر اعظم" کے لقب سے سر علی امام کو بنایا۔ اس کا کچھ حال اگلے صفحات میں پیش کیا جاتا ہے۔

———— (۱۴) ————

نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی ایک عجیب افسانوی ہستی تھے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک حیدرآباد کے خاص خاص حلقوں میں ان کا ذکر بڑے مرعوب انداز میں کیا جاتا تھا۔ میں نے ان کے حالات زیادہ تر اپنے بزرگ مولانا سید مختار احمد مرحوم سے سنے تھے جو نواب کسمنڈوی کے ملاقاتیوں میں تھے۔ ان حالات اور واقعات میں سے جو کچھ اس وقت مجھے یاد ہے اور جو نتائج ان حالات کو سن کر میں نے اخذ کیے تھے یہاں لکھ رہا ہوں۔

شاید نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کی طالب علمی کا کچھ دور اورنگ آباد میں بھی گزرا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے والد یا کوئی اور بزرگ ریاست حیدرآباد کے ملازم رہے ہوں اور ان کی ملازمت کا مستقر اورنگ آباد رہا ہو۔ جوانی میں نواب کسمنڈوی کا کچھ زمانہ حیدرآباد میں ضرور گزرا ہوگا۔ ۱۹۱۸ء کے بعد وہ ریاست سے خارج البلد کیے گئے مگر ریاست سے انھیں دو تین سو روپے ماہوار وظیفہ جاری کیا گیا۔ یہ بھی سنا تھا کہ اسی طرح دو تین اور ریاستوں سے انھیں تنخواہ ملتی تھی مگر شرط یہ تھی کہ وہ ان ریاستوں میں داخل نہ ہوں۔

مذکورہ بالا زمانے میں یعنی ۱۹۱۸ء سے کچھ پہلے جب وہ حیدرآباد میں تھے۔ رزیڈنٹ حیدرآباد سے ملا کرتے تھے۔ تمام ریاستوں کی طرح حیدرآباد میں بھی انگریز رزیڈنٹ کی ہستی اتنی با اقتدار ہوتی تھی کہ اس سے نواب عبداللہ خاں کا ملاقات کرنا امرا کے طبقے کے لیے بڑا مرعوب کن تھا۔ نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کی اپنی کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اس زمانے میں موٹروں کا رواج اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ امیروں

کے ہاں شاندار دو اسپہ بگھیاں ہوا کرتی تھیں۔ خدا جانے نواب کسمنڈوی نے کس طرح یہ انتظام کر دیا تھا کہ ہر روز باری باری سے کسی بڑے جاگیر دار کے ہاں سے دو اسپہ شاندار بگھی آجایا کرتی اور وہ سوار ہو کر ملنے ملانے چلے جاتے تھے۔

حضور نظام کے درباری آداب یہ تھے کہ کوئی شخص ان کی موجودگی میں بیٹھ نہیں سکتا تھا لیکن حضور نظام میر عثمان علی خاں نواب کسمنڈوی کو اپنے برابر کرسی پر بٹھاتے اور گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ کسی اور مقام پر بھی یہ بیان کر چکا ہوں کہ حضور نظام میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی کے وقت یعنی ۱۹۱۱ء میں مہاراجا کشن پرشاد دیوان (وزیر اعظم) تھے۔ اس عہدے کا سرکاری لقب "مدار المہام" تھا۔ مختلف محکموں کے وزیر "معین المہام" کہلاتے تھے جنھیں بعد میں "صدر المہام" کہا جانے لگا۔ حضور نظام نے تخت نشینی کے بعد ہی مہاراجا کشن پرشاد کو معزول کر دیا (ان کا موروثی عہدہ "پیشکار" ریاست کا تھا، وہ اب محض "پیشکار" رہ گئے تھے) مہاراجا کشن پرشاد کی جگہ حضور نظام نے سر سالار اوّل کے پوتے نواب یوسف علی خاں سالار جنگ سوم کو "مدار المہام" بنایا لیکن ۱۹۱۴ء میں نواب یوسف علی خاں کو بھی معزول کر دیا، اور اب مدار المہام کا کام خود کرنے لگے تھے۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی۔ جنگ کے خاتمے تک تو انگریز حکومت دم سادھے بیٹھی رہی، ختم جنگ پر ضرور ہے کہ اس نے حضور نظام پر دباؤ ڈالا ہو کہ "مدار المہام" کا کام وہ خود نہ کریں بلکہ اس خدمت پہ کسی کا تقرر کر دیں۔

غرض، اختتام جنگ پر حضور نظام نے ایک فرمان کے ذریعے جو نیا انتظام کیا۔ وہ ریاست کی قدیم روایات سے بالکل مختلف تھا۔ "مدار المہام" کی جگہ وزیر اعظم کا لقب "صدر اعظم" مقرر ہوا۔ صدر اعظم کے ساتھ آٹھ دس وزیروں کا تقرر ہوا جن کا لقب "صدر المہام" قرار پایا۔ صدر اعظم کے اختیارات دیوان یا مدار المہام کی طرح وسیع نہیں تھے۔ وہ اپنے وزیروں کے مشورے کے بغیر قطعی فیصلے نہیں کر سکتا تھا۔ گویا مدار المہام کے اختیارات کلّی، پہلے کی طرح ایک شخص کو نہیں بلکہ وزیروں کی جماعت کو حاصل تھے جس کا لقب "باب حکومت" قرار پایا۔

اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے میں نے قطعی طور پر یہ رائے قائم کی تھی کہ یہ نیا انتظام بالکلیہ نواب کسمنڈوی کے مشورے پر ہوا ہوگا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت برطانیہ سے کوئی اس قسم کا اشارہ ملا ہو کہ "وائسرائے ان کونسل" کے نمونے پر ریاست کے انتظام کی ذمہ داری ایک شخص کے بجائے وزیروں کی جماعت پر ڈال دی جائے۔ میری اس رائے کی تائید اور واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ نئے انتظام کے تحت اوّلین صدر اعظم سر علی امام مقرر ہوئے۔ جنوبی ہند میں سر علی امام کی اتنی شہرت نہیں تھی جتنی شمالی ہند میں تھی۔ اگرچہ سر علی دو ایک عدالتی مقدموں میں وکیل کی حیثیت سے حیدر آباد آ چکے تھے مگر متعلقہ لوگوں کے سوا دوسروں کو سر علی امام کی شہرت یا ان کی غیر معمولی قانونی مہارت کا علم نہیں تھا۔ مجھے اس کا آج تک یقین ہے کہ سر علی امام کی سفارش حضور نظام سے نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی ہی نے کی ہوگی۔

اس کے علاوہ تین چار اور بڑے عہدے داروں کا تقرر بھی نواب کسمنڈوی کی سفارش پر ہوا۔ مالگزاری (ریونیو) کی صدر المہامی (وزارت) پر علامہ عبداللہ یوسف علی بلائے گئے۔ صدر المہامی امور مذہبی پر مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) کا تقرر ہوا۔ مرزا سمیع اللہ بیگ (نواب مرزا یار جنگ) ریاست کے چیف جسٹس (میر مجلس عدالت العالیہ) بنائے گئے۔ حیدری صاحب (سر اکبر حیدری) جو ہوم سکریٹری تھے اب "باب حکومت" کے قیام پر صدر المہام فینانس بنائے گئے۔ اگرچہ حیدری صاحب پندرہ بیس برس سے ریاست کے اہم عہدوں پر کام کر چکے تھے مگر اس موقع پر وزارت فینانس کے لیے عبداللہ خاں کسمنڈوی ہی نے سفارش کی ہوگی یا کم از کم حضور نظام سے

خیال کی تائید کی ہوگی۔ اس خدمت کے لیے کسی دوسرے کا نام نہیں پیش کیا۔ سر اکبر حیدری کے وزیر فینانس بن جانے سے ہوم سیکریٹری کی خدمت خالی ہوئی تو اس پر نواب سرور جنگ (آغا مرزا بیگ) کے بڑے صاحبزادے نواب ذوالقدر جنگ کا تقرر ہوا۔ نواب ذوالقدر جنگ مدت سے ریاست کے باہر تھے۔ وہ نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کے دوست تھے۔ غرض مجھے یقین ہے کہ یہ سب تقررات نواب کسمنڈوی کی سفارش یا مشورے سے ہوئے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور نظام میر عثمان علی خاں پر نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی نے آخر کیا جادو کر دیا تھا کہ حضور نظام انھیں اپنے برابر بٹھاتے تھے اور ان کے مشورے سے اتنے سارے اہم عہدوں پر باہر کے لوگوں کا تقرر کر دیا۔ میرے خیال میں نواب کسمنڈوی کا حضور نظام کو برار کا علاقہ انگریزوں سے واپس لینے کا شوق دلانا اور اس کے امکانات کے عملی طریقے سمجھانا ہی وہ جادو تھا جس کی وجہ سے نواب کسمنڈوی ایک دم حضور نظام کی نظروں میں چڑھ گئے۔ البتہ اس کا کوئی اشارہ کہیں سے نہیں ملا کہ خود عبداللہ خاں کسمنڈوی کی رسائی حضور نظام تک کس طرح ہوئی۔ میرا ایک ہلکا سا قیاس ہے کہ ممکن ہے کہ ظفر علی خاں نے انھیں حضور نظام سے متعارف کرایا ہو۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، ظفر علی خاں ۱۹۰۹ء میں میر عثمان علی خاں کی ہوا خواہی کے جرم میں عزیز مرزا، مولوی عبدالحلیم شرر اور مولوی صفی الدین کے ساتھ ریاست بدر کیے گئے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں جب دارالترجمہ کا قیام ہوا تو حضور نظام نے اپنے ان تینوں ہوا خواہوں کو دارالترجمہ میں ملازمتیں دیں۔ ظفر علی خاں اور عبدالحلیم شرر چند مہینے حیدرآباد ٹھہر کر واپس چلے گئے۔ مولوی صفی الدین کئی برس تک دارالترجمہ میں ناظر مذہبی رہے جن کا فرض یہ تھا کہ ترجمہ کی ہوئی کتابوں کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ ان میں کوئی بات دینِ اسلام کے خلاف تو نہیں۔

غرض حضور نظام کے دل میں واپسی برار کا اشتیاق پیدا کرنے کے بعد نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی نے اس سلسلے میں انگریز رزیڈنٹ سے بہ حیثیت اخبار نویس بات چیت کی ہوگی۔ اس زمانے میں واپسی برار کے متعلق اخباروں میں اچانک مضامین آنے شروع ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مضامین نواب کسمنڈوی ہی کا کارنامہ ہو۔ بہرحال، جب حضور نظام واپسی برار کی تحریک کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کام کو سرانجام دینے کے لیے ایک باوقار ماہر قانون کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہو گیا۔ یہ باتیں سر علی امام میں موجود تھیں اس کے علاوہ برطانوی حکومت پر ان کا اثر و رسوخ بھی تھا۔ اس لیے اس مقصد کے لیے سر علی امام سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں مل سکتا تھا۔

حیدرآباد کی صدر اعظمی سے سر علی امام کے اچانک استعفا دے دینے کے متعلق بھی لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی ہیں۔ بعضوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ سر علی سے حضور نظام ناراض تھے اور ریاست سے نکال دیا تھا اس لیے کوئی شخص سر علی سے ملنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ سر علی امام کے استعفے کی خبر واقعی خلاف توقع تھی۔ میں اس زمانے میں الف اے میں پڑھتا تھا۔ ایک معمر بزرگ جن کا نام غالباً امیر علی صاحب تھا میرے ملاقاتی تھے۔ وہ ایک روز دس گیارہ بجے راستے میں ملے اور سر علی کے استعفے کی خبر سنائی۔ میں نے ان بیچارے کا مضحکہ اڑا کر اس خبر کو غلط قرار دیا۔ مگر دوسرے ہی دن اس خبر کی تصدیق ہو گئی۔ بعد میں مجھے ان بزرگ سے بڑی شرمندگی رہی۔ سر علی امام نے جونہی استعفا دیا اسی وقت انھوں نے سرکاری کوٹھی "ہلا دستا" چھوڑ دی اور

سکندر آباد کے منٹگمری ہوٹل میں اٹھ گئے۔ ہم پر ان کے اس بلند کردار کا بڑا اثر پڑا۔ سُنا یہ گیا کہ حضور نظام نے ان سے استعفا واپس لینے کے لیے بہت کچھ کہا مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔ آخر حضور نظام نے انھیں برار کا مقدمہ چلانے کے لیے اپنا وکیل مختار مقرر کیا۔ اس سے پہلے لارڈ ریڈنگ وائسرائے کی طرف سے حضور نظام کے مکتوب کا سخت جواب وصول ہو چکا تھا۔ اب انگلستان میں پیروی کرنے کی ضرورت تھی۔ تین چار سال تک انگلستان میں یہ کارروائی چلتی رہی۔ آخری مرتبہ ناکام ہو کر سر علی امام انگلستان سے حیدرآباد آئے تاکہ وہاں کی سرگزشت سے حضور نظام کو مطلع کریں۔ مجھے سر علی امام سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کی صدر اعظمی کے زمانے میں دو مرتبہ مل چکا تھا۔ اب میں گرائجویٹ ہو چکا تھا اس مرتبہ بھی اسی عقیدت کی بنا یہاں سے ملاقات کی۔

سر علی امام کے استعفے کے کچھ ہی دنوں کے بعد، مختلف ذرائع سے یہ حال معلوم ہوا کہ سر اکبر حیدری وزیر فینانس نے نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کو ایک نجی خط لکھا تھا، جس میں سر علی کے انتظامی معاملات پر تنقید تھی۔ نواب ذوالقدر جنگ جو ہوم سیکریٹری بن چکے تھے، کسی ضرورت سے شمالی ہند گئے، نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی سے ملاقات کی تو حیدری صاحب کے شکایتی خط کا حال معلوم ہوا ہوگا۔ ذوالقدر جنگ نے کسی ترکیب سے وہ خط نواب کسمنڈوی سے لے لیا اور حیدرآباد لاکر سر علی امام کے حوالے کر دیا۔ سر علی امام نے باب حکومت کے اجلاس میں مسٹر حیدری پر الزام لگایا کہ انھوں نے باہر کے اخبار نویس کو سر علی کی شکایات لکھ بھیجی۔ مطلب غالباً یہ ہوگا کہ انھیں جو کچھ اعتراض کرنا ہوتا، باب حکومت کے اجلاس میں کرتے۔ مسٹر حیدری کو گمان بھی نہیں ہوا ہوگا کہ ذوالقدر جنگ وہ منحوس خط نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی سے لے آئے ہیں۔ انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ ایسا کوئی خط انھوں نے نہیں لکھا۔ سر علی امام نے وہ خط پیش کر دیا اور غصے میں کہا کہ وہ ایسے وزیروں کے ساتھ کام نہیں کر سکتے جن کا کردار یہ ہو۔ یہی وجہ تھا کہ انھوں نے اپنا استعفا حضور نظام کے ہاں بھیج دیا۔ غالباً انھیں یہ توقع تھی کہ حضور نظام بھی مسٹر حیدری کی اس حرکت پر بگڑیں گے اور انھیں وزارت فینانس سے علیحدہ کر دیں گے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تب تو ماننا پڑے گا کہ سر اکبر حیدری سے یہ اخلاقی کمزوری ضرور سرزد ہوئی کہ خط لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ انگلستان کی روایات کے لحاظ سے اگر کوئی وزیر یہ حرکت کرتا اور بات کھل جاتی تو فوراً خود ہی استعفا دے دیتا، مگر ہندوستان کی سیاسیات میں ایسی روایات کہاں تھیں مسٹر حیدری کئی سال سے ریاست میں ملازم تھے اور بڑے نیک نام تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم کر چکے تھے۔ ریاست میں تعلیم کو بڑا فروغ دے چکے تھے۔ ان کی ان خدمات کو حضور نظام اور اہل ملک نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ذوالقدر جنگ نے وہ فتنہ انگیز حرکت تو صریحاً مسٹر حیدری کو زک پہنچانے کے لیے کی تھی۔ مگر نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کا مسٹر حیدری کے خط کو ذوالقدر جنگ کے حوالے کر دینا بھی اصول اخلاق کے خلاف تھا۔ ہاں یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ خود نواب کسمنڈوی کی نیت بھی مسٹر حیدری کو نقصان پہنچانے کی تھی۔ اس صورت میں نواب کسمنڈوی پر "ریاکاری" اور منافقت کا الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف تو مسٹر حیدری کو اپنی دوستی کا یقین دلا کر ان کا اعتماد حاصل کرتے تھے۔ اور درپردہ ان کی بیخ کنی کی فکر میں رہتے تھے۔ بہرحال ہمارے زمانے میں حیدرآباد کے سیاسی میدان میں سازش کا وہ قدیم ڈراما ایک مرتبہ پھر کھیلا گیا جو نواب سرسالار جنگ کی وفات کے بعد اکثر کھیلا جاتا تھا۔ سر علی امام اور سر اکبر حیدری دونوں اپنی اپنی جگہ حیدرآباد کے مفاد کے لیے بہت ضروری عناصر تھے۔ سر علی امام کا اعلیٰ کردار اور ان کی سیاسی بلند نظری حیدرآباد کے وقار میں اضافہ کرنے والی چیزیں تھیں،

سر اکبر حیدری مالیات (فنیانس) کے مسلمہ ماہر تھے۔ انھوں نے ریاست کی مالی حالت اتنی مضبوط بنادی تھی کہ ان کے دور میں بھی، اور ان کے بعد بھی ریاست کو کبھی مالی مشکلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ تعلیمی ترقی اور علمی بیداری پیدا کرنے میں ان کا کارنامہ اتنا بلند ہے کہ اس کا صحیح اعتراف اب تک نہیں کیا گیا۔ اگر عبداللہ خاں کسمنڈوی، حیدری صاحب کا وہ خط ذوالقدر جنگ کو نہ دے دیتے تو شاید ان دونوں مدبروں کے تعاون سے حیدرآباد کو غیر معمولی فائدہ پہنچتا۔ بہرحال نواب کسمنڈوی اور ذوالقدر جنگ کی یہ چال اُلٹی پڑی اور حیدرآباد کی سیاسی بساط پر انھی کا اپنا مُہرہ پٹ گیا۔

نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی ایک انجمن کے صدر تھے۔ وہ انجمن "ریلوے کے تیسرے درجے کے مسافروں کی انجمن تھی۔ غالباً اس کا وجود کاغذ کے باہر کہیں نہیں تھا۔ ہندوستانی ریلوے نے اس انجمن کے صدر کو، سارے ہندوستان کے لیے ایک اجازت نامہ (پاس) دے رکھا تھا جس کی رُو سے ایک اوّل درجے کا اور دو تیسرے کے مسافر ہندوستان میں ہر جگہ مفت سفر کر سکتے تھے۔ میرے بزرگ مولانا سید مختار احمد مرحوم نے یہ واقعہ بیان کیا کہ وہ مصر و شام کی عربی مطبوعات کی تلاش و حصول کی خاطر (غالباً ۱۹۱۹ء میں) بمبئی گئے تھے۔ وہاں ایک روز نواب عبداللہ کسمنڈوی سے، کئی سال کے بعد ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں انھوں نے پوچھا۔ حیدرآباد کب جارہے ہو؟ مولانا مختار احمد مرحوم نے بتایا کہ وہ کل روانہ ہورہے ہیں۔ نواب کسمنڈوی نے کہا، کل کے بجائے پرسوں چلو تو ہم ساتھ چلیں گے۔ میں مدراس جارہا ہوں۔ واڑی جنکشن تک تمھارا ساتھ رہے گا۔ ٹکٹ نہ خریدنا میرے ہاں پاس ہے۔ مولانا مختار احمد مقررہ روز مدراس ایکسپریس پر پہنچے، نواب کسمنڈوی کو تلاش کرتے رہے۔ فسٹ کلاس کے ایک ڈبّے پر ریلوے کی ایک چِٹ لگی ہوئی تھی — "محفوظ برائے نواب عبداللہ خاں" — مولانا مختار احمد اپنا سامان اس ڈبے میں رکھ کر بیٹھ گئے، اور نواب کسمنڈوی کا انتظار کرنے لگے۔ آخر گاڑی روانہ ہونے لگی۔ نواب عبداللہ خاں نہیں آئے۔ مختار احمد صاحب بڑے پریشان ہوئے کہ اب کیا ہوگا۔ مگر یہ طے کرلیا کہ ریلوے والے پوچھیں گے تو اصل واقعہ بتادیں گے۔ پھر جو ہو، سو ہو۔ چند اسٹیشنوں کے بعد اس ریل کا گارڈ آیا اور ادب کے ساتھ سلام کرکے انگریزی میں کہا۔ اچھا، نواب اگر کوئی ضرورت ہو تو بتائیے میں حاضر ہوں۔ مولانا نے شکریہ ادا کرکے اسے رخصت کیا۔ بعد میں ایک اسٹیشن پر وہ ڈنر کا آرڈر لینے آیا۔ مولانا نے عذر کیا کہ میں دیسی کھانا کھاتا ہوں، توشہ میرے ساتھ ہے۔ غرض، واڑی جنکشن تک وہ نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی بنے ہوئے آرام سے پہنچ گئے۔

مولانا مختار احمد مرحوم سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی پر حیدرآباد میں ایک وقت ایسا بھی پڑا تھا کہ ممتاز دوم کنڈہ کے والی راجا راجیسور راؤ اصغران کے لیے اپنے ہاں سے آٹا، دال وغیرہ جنس بھجوایا کرتے تھے۔ ان متفرق اور بے جوڑ واقعات سے نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کی شخصیت کی کوئی واضح تصویر ذہن میں نہیں جم سکتی تھی۔ یہ واقعہ ۱۹۱۳ء، ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ کا ہوگا۔ نواب کسمنڈوی کا وہ شاندار دور شروع نہیں ہوا تھا کہ وہ حضور نظام کے مقرب خاص بنے اور ان کی سفارش پر وزیروں کا تقرر ہوا۔ یہ خاص دور ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کا ہوگا جس کا حال اُدپر لکھ چکا ہوں۔

میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں مختلف لوگوں سے نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کے کارنامے سُن سُن کر ان کو دیکھنے اور

ان سے ملنے کا بہت مشتاق تھا مگر ریاست میں ان کا داخلہ بند تھا۔ ستمبر ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں نواب عبداللہ خاں نے لکھنؤ کا مشہور اخبار "ہمدم" خرید لیا تھا۔ جالب مرحوم مدت سے اس کے ایڈیٹر تھے۔ اب وہ "ہمدم" سے الگ ہو گئے اور اپنا ایک نیا اخبار جاری کیا جس کا نام "ہمت" رکھا۔ ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد میں نستعلیق ٹائپ کانفرنس ہوئی۔ حضرت جالب بھی مدعو تھے۔ اس کانفرنس میں ریاست کے وزرا، بڑے بڑے عہدے دار، اخباروں کے ایڈیٹر اور طباعت کے ماہر موجود تھے۔ باتیں نستعلیق ٹائپ کے متعلق ہو رہی تھیں۔ جناب جالب نے ایک لمبی تقریر کی جس میں حکومت نظام کے علمی کارناموں کی بڑی تعریف کی۔ تعریف میں خوشامد کا پہلو نہیں تھا مگر وہ ان مرحوم کے دلی جذبات کا پرخلوص اظہار تھا۔ اتفاق سے مولوی عبدالحق کو نواب سرامین جنگ کے برابر والی کرسی ملی۔ میں بھی مولوی صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ نواب سرامین جنگ جیسا کہ اور جگہ عرض کر چکا ہوں بڑے عالم اور علم دوست بزرگ تھے اور اس زمانے میں "صدرالمہام پیشی" (وزیر دربار) تھے۔ کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے پر انھوں نے مولوی عبدالحق سے پوچھا کہ وہ تقریر کرنے والے کون صاحب ہیں۔ مولوی صاحب نے جالب صاحب کا نام لیا۔ نواب سرامین جنگ نے ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مولوی صاحب حضرت جالب کو نواب صاحب کے پاس لے آئے اور فوراً تعارف کرایا "یہ آپ جالب صاحب ہیں ہمدم کے پرانے ایڈیٹر۔ مگر اب کچھ نہیں صرف ہمت ہی ہمت ہے۔"

اس فقرے پر نواب امین جنگ اور آس پاس کے تمام حضرات نے بڑا لطف لیا۔ نواب صاحب بڑی مہربانی اور احترام کے ساتھ حضرت جالب کے حالات پوچھتے رہے۔ اگر مولوی صاحب اس وقت یہ تعارف نہ کراتے تو شاید مجھے کبھی علم نہ ہوتا کہ وہ تقریر کرنے والے بزرگ حضرت جالب تھے۔

مذکورہ بالا باتوں کو پینتیس (۳۵) سال سے زیادہ مدت ہوتی ہے۔ یہ مضمون زیر تحریر تھا کہ رسالہ ہمدرد صحت کا جون ۱۹۶۷ء کا پرچا ملا۔ اس میں "تاثرات" کے عنوان سے واجب التعظیم بزرگ حضرت ملا واحدی کا ایک مضمون چھپا ہے جس میں نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کے بہت سے حالات درج ہیں۔ ان حالات سے نواب کسمنڈوی کی شخصیت اچھی طرح اجاگر ہو جاتی ہے، اور ان کی اس پوشیدہ قابلیت کا بھی حال کھلتا ہے جس کی وجہ سے والیان ریاست اور برطانوی افسروں کے ہاں انھیں ایسا غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل ہو جاتا تھا۔ نواب کسمنڈوی کو حضرت خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۱۰ء میں ملا واحدی صاحب سے ملایا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے اپنی کسی تحریر میں نواب عبداللہ کسمنڈوی کی اس پوشیدہ قابلیت کا ذکر کیا تھا۔ جناب ملا واحدی صاحب کا یہ مضمون چھوٹا سا ہے۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ پورا مضمون یہاں نقل کر دوں لیکن کچھ حصے حذف کر کے بقیہ سارا مضمون یہاں پیش کر رہا ہوں۔

"نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی، اب بہت کم لوگوں کو یاد ہوں گے۔ وہ ایک اخبار نویس تھے اور اخبار نویس بھی غیر معمولی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں کوئی پوشیدہ قابلیت ایسی دی تھی کہ اپنے زمانے کے ممتاز شخص کہے جا سکتے ہیں۔

۱۹۱۱ء میں جرمنی کا ولی عہد ہندوستان کی سیاحت کرنے آیا تھا۔ ولی عہد جہاں جاتا تھا، اردو اخبار نویسوں کے

نمائندے کی حیثیت سے نواب کسمنڈوی اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ نواب صاحب اخبار نویس برائے نام سہی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ولی عہد جرمنی کے ساتھ رکھنے کے لیے ان سے بہتر اخبار نویس کا انتخاب انگریزی حکومت نہیں کرسکتی تھی۔

۱۹۱۱ء[1] میں جارج پنجم کا دربار دہلی میں ہوا۔ جارج پنجم کے ساتھ بھی نواب صاحب نتھی کیے گئے۔ نواب صاحب کا خیمہ جارج پنجم کے خیمے کے بالکل نزدیک تھا۔ بے حد آراستہ و پیراستہ، مگر نواب صاحب نے خیمے کی آرائش اور آسائش چھوڑ کر میرے گھر میں قیام فرمایا تھا۔

میرے ہاں دربار کی وجہ سے کافی مہمان تھے۔ بیس پچیس آدمیوں کا قافلہ تو فقط لاہور کے زبدۃ الحکما حکیم غلام نبی مرحوم کا تھا۔ سب زمین پر بستر بچھاتے تھے۔ نواب کسمنڈوی کو بھی زمین پر سونا پڑتا تھا۔ مگر وہ زمین پر سونے سے خوش تھے۔

ہر شاہی تقریب میں نواب کسمنڈوی کی شرکت لازمی تھی۔ تقریبات عموماً رات کے گیارہ بجے تک رہتی تھیں۔ نواب صاحب ایک ایک بجے واپس پہنچتے تھے، لیکن پہنچتے تھے ضرور تھے۔ اور ایک بجے لیٹیں یا دو بجے، اٹھ جاتے تھے ہمیشہ اندھیرے سے۔ میں جاگتا تو نواب صاحب کو نماز پڑھتے یا قرآن مجید پڑھتے یا مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ پڑھتے پاتا۔ قرآن اور مثنوی اتنے موثر لحن سے پڑھتے تھے کہ سن کر دل چوٹ کھاتا تھا۔ عبادت ختم کرکے نواب صاحب داڑھی مونڈتے، کپڑے بدلتے اور ہلکا سا ناشتہ کرتے اور رات کے ایک بجے تک کے واسطے رخصت ہو جاتے۔

کپڑے نواب صاحب کے سوٹ کیس میں زیادہ نہیں تھے۔ دو گرم شیروانیاں، چھ سات ٹھنڈی قمیصیں، چھ سات لٹھے کے آڑے پاجامے۔ جوتوں کا شاید ایک ہی جوڑا تھا۔ جامہ زیب جوانِ رعنا تھے۔ گٹھا جسم، اور موزوں قد۔ لباس ان پر کھلتا تھا مگر قمیص پاجامہ جو نکلتا پھٹا اور اُدھڑا نکلتا۔ کپڑوں کی کمی اور کپڑوں کے پھٹے اور اُدھڑے ہونے نے ان کی زندگی غیر نوابانہ بنادی تھی اور صبح کی عبادتوں کو شامل کر لیجیے تو زندگی کو غیر نوابانہ نہیں درویشانہ کہنا چاہیے۔

۱۹۱۱ء میں نواب صاحب میرے مکان میں ٹھہرے تھے تو بعد میں کیوں نہ ٹھہرتے۔ مدتوں یہ وضع جاری رکھی۔ ان کے سلام کو ریاست حیدرآباد کے "جنگ" اور "دولہ" آتے تھے۔ اور وہ سیدھی سادی آرام کرسی پر پڑے پڑے خطاب کے بجائے نام لے کر سلام کا جواب دیتے تھے[2]۔

نواب صاحب سواری کبھی نہیں منگاتے تھے۔ بے سواری اور بے کروفر کے دیسی لباس پہنے جہاں چاہتے تھے

---

[1] ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دربار دہلی منعقد ہوا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۱ء کو جارج پنجم نے نئی دہلی کا سنگ بنیاد رکھا۔ (رشدی)

[2] مذکورہ بالا باتیں غالباً ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء کے بعد کی ہوں گی۔ (رشدی)

گھس جاتے تھے۔ دو رویہ گورا فوج استادہ ہے ..... اِدھر کا آدمی اُدھر نہیں جا سکتا۔ اُدھر کا آدمی اِدھر نہیں آسکتا لیکن نواب صاحب گورے کے کان میں چپکے چپکے کچھ فرماتے اور دوسری سمت پہنچ جاتے .....

نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کی زندگی کا ایک رُخ یہ تھا کہ پھٹے اور اُدھڑے کپڑے پہننے اور زمین پر سونے میں مطمئن ہیں۔ بات بات پر آیات قرآنی اور اشعار مثنوی پڑھتے ہیں۔ زبان سے اللہ، رسول اور بزرگان دین کے سوا دوسروں کا ذکر نہیں کرتے۔ بے داڑھی کے چہرے پر تہجد گزاری کا نور چمکتا ہے۔ بے حد منکسر، بے حد بے تکلف بے حد با اخلاق، چہرہ ہر حال میں پھول کی طرح شگفتہ ـــــ لکھنؤ سے تار وصول ہوا کہ فلاں بنک ڈوب گیا۔ تار پڑھا اور کہاـــ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میں نے پوچھا آپ کا کتنا روپیہ تھا؟

بولے ساٹھ ہزار۔

لیکن ذرا ملال نہیں، وہی قرآن کی آیتیں، وہی مثنوی کے اشعار! غرض نواب کسمنڈوی کی زندگی کا ایک رُخ تو یہ تھا اور دوسرا رُخ یہ کہ امیروں اور رئیسوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔

نواب کسمنڈوی کی بڑائی اور شہرت خواص میں محدود تھی۔ انھوں نے بڑائی خواص پر جمائی۔ عوام پر دھونس نہیں جمائی خواص کو بھی ان کی ذات سے فائدہ پہنچتا تھا۔ نقصان پہنچانا ان کا کام نہیں تھا۔

میں نے انگریزی دانوں میں اچھے اچھے خدا شناس اور پابند شعائر اسلام دیکھے ہیں۔ نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کا شمار میرے نزدیک انھی اچھے مسلمانوں میں ہے۔ اور ان کا اچھا مسلمان ہونا ہی، ممکن ہے وہ پوشیدہ قابلیت ہو، جس نے انھیں دنیا میں بھی کامیاب کیا تھا.....

نواب کیوں کہلاتے تھے، میں نے نہ کبھی پوچھا نہ مجھے معلوم۔ میں انھیں اخبار نویس کی حیثیت سے جانتا تھا۔"

سر علی امام کے حیدرآباد سے جانے کے بعد باب حکومت (مجلس وزرا) پر سر اکبر حیدری کا پورا اقتدار قائم ہوگیا۔ حضور نظام نے ایک امیر پائیگاہ نواب ولی الدولہ کو عارضی طور پر منصرم صدر اعظم بنا دیا تھا۔ وہ انتظامی امور سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ باب حکومت کے اجلاسوں کے صدر نشین ضرور رہتے تھے مگر کسی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے۔

سر اکبر حیدری کی خدمات حکومت ہند سے مستعار لی گئی تھیں۔ ہر مرتبہ شاید تین تین سال کے لیے اس مستعار خدمت کی توسیع کی جاتی تھی۔ سر اکبر حیدری کا اپنی اصل خدمت پر واپس جانے کا حق باقی تھا۔ اس کے لیے حکومت حیدرآباد حکومت ہند کو قاعدے کے مطابق

کنٹری بیوشن ادا کرتی تھی۔ اب حکومت ہند کی ملازمت سے سر اکبر حیدری کو پنشن لینے کا وقت آگیا۔ ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں وہ چند ماہ کے لیے اپنی اصل خدمت پر واپس چلے گئے جو اس وقت بمبئی میں تھی۔ چند ماہ بمبئی میں کام کرکے انھوں نے حکومت ہند سے پنشن لے لی اور پھر حیدرآباد میں وزیر فینانس کی خدمت پر واپس آگئے۔ وہ اتنی تھوڑی مدت کے لیے حیدرآباد سے باہر رہے کہ لوگوں کو ان کی حیدرآباد سے غیر حاضری کا زمانہ یاد بھی نہیں رہا۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اورنگ آباد میں دو ہائی اسکول تھے۔ ایک انگریزی ہائی اسکول تھا جہاں پہلی جماعت سے میٹرک تک ساری تعلیم انگریزی میں ہوتی تھی۔ یہاں کے طلبہ میٹرک پاس کرکے نظام کالج میں داخلہ لیتے تھے۔ دوسرا ادارہ مدرسہ فوقانیہ کہلاتا تھا جہاں فارسی کے امتحان منشی اور عربی کے امتحان مولوی کی تعلیم ہوتی تھی۔ یہاں کے لڑکوں کو انگریزی سے مطلق سابقہ نہیں پڑتا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں ان دو مدرسوں کو ملاکر عثمانیہ کالج اورنگ آباد بنایا گیا اور مولوی عبدالحق اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مولوی صاحب تقریباً چھ سال تک اس کالج کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے کالج کی پرنسپلی سے پنشن لی۔ اس وقت مولوی صاحب کی عمر ساٹھ سال کی ہوری تھی۔

(۱۵)

۱۹۲۷ء میں ایم اے کے امتحان کے بعد مجھے اور میرے عزیز دوست سید وقار احمد مرحوم کو ایک ہفتہ وار اخبار نظام گزٹ کی ادارت کا موقع ملا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں وہ سیاسی شعور پیدا نہیں ہوا تھا جو ۱۹۳۵ء کے بعد نواب بہادر یار جنگ اور ان کی قائم کردہ انجمن اتحاد المسلمین کی وجہ سے پیدا ہوا۔ وہاں کے سارے اخباروں کی اشاعت بہت کم تھی۔ ہمارے اخبار کے سلسلے میں حوصلہ افزائی تو بہت کی جاتی تھی مگر اخبار کی اشاعت نہیں بڑھتی تھی۔ بعض تجربہ کار ہمدردوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ اخبار کی اشاعت بڑھانے کے لیے اضلاع کا دورہ کرنا چاہیے چنانچہ ۱۹۲۹ء میں ہم دو تین دوست، کاروبار اور تفریح دونوں کے مرکب ارادے کے ساتھ اورنگ آباد گئے۔ اورنگ آباد سے مجھے ایک طرح کا جذباتی تعلق تھا۔ دکن میں میرے دادا مرحوم کی ملازمت وہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنی عمر کا آخری حصہ وہیں بسر کیا۔ وہیں مکان بھی بنا لیا تھا اور وہیں مدفون ہیں۔ میرے والد اور چچا کی ولادت بھی اورنگ آباد ہی کی ہے۔ اس طرح دکن میں ہمارا پہلا وطن شہر اورنگ آباد ہی تھا مگر مجھے اس سے پہلے وہاں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ میرا پہلا سفر اورنگ آباد تھا۔

اورنگ آباد شہر حیدرآباد سے بہت مختلف شہر تھا۔ حیدرآباد کی ملکی زبان تلنگی ہے لیکن اورنگ آباد کی ملکی زبان مرہٹی ہے۔ ان دونوں شہروں کی اُردو زبان میں بھی اختلاف ہے۔ تاریخی اعتبار سے اور، ایرولا (ایلورا[1]) اور اجنتا کے غاروں کی فن کاری کی عظمت کی وجہ سے بھی اورنگ آباد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہم لوگ وہاں بہت دن ٹھیرے۔ مختلف مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ ملاقاتوں کا

---

[1] انگریزوں نے جس طرح دلی کو بگاڑ کر دلہی (DELHI) کردیا اسی طرح ایرولا (AEROLA) کو ایلورا (ELLORA) بنادیا۔ ان مشہور غاروں کے سامنے جو گاؤں ہے اس کا نام "ایرولا" ہے۔ اورنگ آباد والے ان غاروں کو "ایرولے کے غار" کہتے تھے مگر اب انگریزی داں ان کو "ایلورا کے غار" کہتے ہیں۔

سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایک روز مغرب سے کچھ پہلے ہم لوگ مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ مولوی صاحب اس زمانے میں اورنگ آباد کے "بے تاج کے بادشاہ" تھے۔ کھدر کا کرتا کھدر کا پاجامہ پہنتے تھے اور شہر سے دور ایک جنت ارضی میں رہتے تھے۔

ہم مولوی صاحب کے ساتھ باتیں کر رہے تھے میز پر چائے لگائی جا رہی تھی کہ مولوی صاحب کے چند اور ملاقاتی آ گئے ان میں چودھری ڈگمبرداس اجنبانی بھی تھے۔ چودھری صاحب کانگریسی تھے اور اورنگ آباد کے چوٹی کے وکلا میں گنے جاتے تھے۔ چائے کے ساتھ میز پر "نیلم" آم رکھے گئے۔ ان آموں کو دیکھ کر چودھری ڈگمبرداس نے کچھ اس طرح کا فقرہ کہا — "اوہو، مولانا نیلم آ گئے"۔ یہ فقرہ سن کر مجھے عجیب طرح کی کمتری کا احساس ہوا۔ میں آموں کو مطلق نہیں پہچانتا تھا۔ دکن کے آموں میں مجھے صرف دو آموں کی پہچان تھی۔ ایک "ملغوبہ" جو وہاں کا سب سے اچھا آم تھا اور دوسرے "توتا پری" جو سب سے بدتر آم تھا۔ ان دونوں کو بچہ بھی پہچان لے گا۔ دونوں آم جسامت میں بڑے ہوتے ہیں۔ "توتا پری" لمبوترا ہوتا ہے اور "ملغوبہ" گول مول۔ میں اصل میں آموں کے معاملے میں بالکل بدذوق تھا (اور اب بھی ہوں) غرض چودھری ڈگمبرداس کے اس فقرے کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ آموں کو غور سے دیکھنے اور ان کی شکل اور مزے کو یاد رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مولوی صاحب کے دربار میں مجھے "اپنہ شناسی" کا پہلا سبق ملا۔

۱۹۲۷ء میں مہاراجا سرکشن پرشاد "صدر اعظم" تھے۔ یہ ان کی وزارت عظمیٰ کا دوسرا دور تھا۔ انھوں نے ریاست کے ایک لائق عہدے دار مہدی نواز جنگ کو اپنا پرسنل سیکریٹری بنا لیا تھا۔ اُن دنوں مہدی نواز جنگ اورنگ آباد آئے ہوئے تھے اور مولوی صاحب ہی کے ہاں مہمان تھے لیکن اس روز شام کو چائے پر موجود نہیں تھے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں مہدی نواز جنگ کا بڑا اثر تھا۔ دفتری اور سرکاری معاملات میں عملاً گویا وہی صدر اعظم تھے۔ تمام سرکاری عہدے دار ان سے بہت مرعوب رہتے تھے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ مہدی نواز جنگ اپنی ابتدائی ملازمت کے زمانے میں اورنگ آباد کے دوم تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) رہ چکے تھے۔ اس صحبت میں چودھری ڈگمبرداس نے مہدی صاحب کے اس زمانے کے حالات بیان کیے۔ رعایا سے ان کی ہمدردی اور حسن سلوک کے واقعات سنانے کے بعد کہا کہ — دیہات کے مرہٹہ کاشتکاروں نے ان کا نام "دیو تعلقدار" (یعنی دیوتا) رکھ دیا تھا۔ شاید یہ مہدی نواز جنگ کی انسان دوستی ہی کا پھل تھا کہ حیدرآباد پر انڈین یونین کے قبضے کے چند سال کے بعد پنڈت جواہرلال نہرو نے انھیں صوبۂ گجرات کا گورنر بنایا تھا — ایسے زمانے میں جب کہ ان کے آقا حضور نظام میر عثمان علی خاں تخت و تاج سے محروم ہو چکے تھے۔

مولوی صاحب نے ہمیں دوسرے دن صبح ناشتے پر بلایا۔ غالباً انھیں اسی روز حیدرآباد جانا تھا ورنہ شام کے کھانے پر بلاتے۔ غرض اس شام کو ہم خاصی دیر کے بعد مولوی صاحب سے رخصت ہو کر "مقبرہ" کی جنت سے باہر نکلے۔

ہم نے مولوی صاحب کو ایسے ماحول میں دیکھا کہ گویا مولوی صاحب اسی ماحول کے لیے پیدا کیے گئے تھے یا مولوی صاحب کی خاطر فطرت نے صدیوں سے اس کا انتظام کر رکھا تھا۔ فرماتے تھے کہ طالب علمی کے زمانے میں وہ شاید علی گڑھ کے کسی وفد کے ساتھ اورنگ آباد گئے تھے۔ اس وقت یہ مقام انھیں اتنا پسند آیا تھا کہ ان کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش یہاں رہنے کا موقع ملتا۔

اورنگ آباد شہر کے باہر کچھ فاصلے پر شہنشاہ اورنگ زیب کی بیگم رابعہ دورانی کا عالیشان مقبرہ ہے جس کو لوگ صرف "مقبرہ" کہتے تھے۔ یہ مقبرہ تاج محل آگرہ کے نمونے پر بنایا گیا ہے اگرچہ اس سے بہت چھوٹا ہے اور عمارت بھی سنگ مرمر کی نہیں ہے بلکہ چونے بجگ کی ہے مگر اطراف کی پہاڑیوں کے ساتھ اس کا منظر نہایت خوبصورت ہو گیا ہے۔ عمارت، باغ اور احاطہ وغیرہ تاج محل کے نقشے پر ہے۔ ممکن ہے تفصیلات میں کچھ اختلاف ہو۔ مقبرے کے احاطے کے باہر دائیں جانب کھلی زمین پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ شاید مقبرے کے محافظ کے لیے محکمہ تعمیرات عامہ نے بنوایا ہو۔ ۱۹۱۱ء میں مولوی صاحب مہتمم تعلیمات (انسپکٹر آف اسکولس) تھے ان کا تبادلہ حیدر آباد سے اورنگ آباد کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کو مقبرے کا ماحول پسند آیا۔ انھوں نے کوشش کر کے اس کمرے میں رہنے کی اجازت اور مقبرے کی نگرانی اور انتظام کا کام اپنے ذمے لیا۔ مولوی صاحب نے ایک کمرے کا اضافہ کیا اور سامنے کا ایک برآمدہ بنوا لیا۔ اب دو کمرے اور ایک برآمدے میں مولوی صاحب خوش خوش رہنے لگے۔ ہم لوگ برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ برآمدے کے ستونوں کو دیکھ کر میں نے مزاحاً کہا کہ مولانا مجھے تو یہ ستون بھی تاریخی معلوم ہوتے ہیں۔ قہقہہ لگا کر فرمایا ــــ "یہ ستون ہنگولی کی فوجی چھاؤنی کے انگریز کمانڈر کے بنگلے کے ہیں۔ چھاؤنی کب کی برخاست ہو چکی تھی۔ وہ بنگلا ویران پڑا تھا، دیواریں ڈھے رہی تھیں۔ وہاں کے سپرنٹنڈنٹ پولیس سے میری دوستی تھی۔ میں نے ان سے کہا۔ یہ ستون تم اورنگ آباد بھجوا دو۔ انھوں نے بھیج دیئے۔ میں نے یہ برآمدہ تیار کر لیا۔" وہ ستون بہت اونچے تو نہیں تھے مگر ڈھلے ہوئے لوہے کے تھے۔ جس زمانے میں انگریزوں نے ہنگولی میں فوجی چھاؤنی بنائی تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان میں کوئی ایسا کارخانہ نہیں تھا جہاں لوہا پگھلایا جاتا ہو اس لیے ضرور ہے کہ وہ ستون انگلستان کے بنے ہوئے ہوں گے۔

صدیوں پہلے یعنی دکن پر مغلیہ سلطنت کا قبضہ ہونے سے پہلے احمد نگر کی نظام شاہی حکومت کے ایک حبشی امیر ملک عنبر نے مٹی کے نلکوں کے ذریعے شہر اورنگ آباد کو پانی پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔ آب رسانی کا یہ نظام قدیم انجنیئرنگ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ میلوں دور، پہاڑوں کے چشموں سے مختلف نلکوں سے پانی آتا ہے اور پھر شہر کے مختلف حصوں میں طبعی قوانین کے بموجب تقسیم ہوتا ہے۔ پانی دن رات جاری رہتا ہے۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ مقبرے کے قریب ایک نل مدت سے ٹوٹا پڑا تھا۔ اس کا پانی یوں ہی بہا جاتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس نل کو ٹھیک کرایا۔ اس کا پانی مقبرے میں آنے لگا۔ غالباً وہ نل مقبرے ہی کا تھا۔ پانی نہ ہونے سے مقبرے کے چمن سوکھ گئے تھے۔ پانی آنے لگا تو سارے چمن شاداب ہو گئے۔

مقبرے کے چار طرف چار دروازوں کے ساتھ ڈیوڑھیاں سی بنی ہوئی ہیں۔ ڈیوڑھیاں کیا ہیں، نہایت اونچے وسیع ایوان (ہال) ہیں۔ ان ایوانوں کے اندر چھت اور دیواروں پر پہلے کبھی رنگین خطوط سے خوبصورت ڈیزائن بنے ہوئے تھے جو زمانے کے امتداد سے مٹ چکے تھے۔ مولوی صاحب نے دائیں جانب کے ایک دیوان کی ضروری مرمت کی اور ان ڈیزائنوں میں نئے سرے سے رنگ بھروا دیا۔ ایوان اس قدر خوبصورت ہو گیا کہ اس کے سادہ حسن کو دیکھ کر طبیعت پھڑک جاتی تھی۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ ریاست کے انگریز وزیر مالگزاری کرنل ٹرنچ نے جب پہلی مرتبہ ان ڈیزائنوں کو دیکھا تو ناچنے لگا۔

تاج محل کی طرح یہ مقبرہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ عمارت میں گنبد کے نیچے جو قبر ہے وہ نقلی ہے۔ اصل قبر نیچے تہ خانے میں ہے۔ اس تہ خانے میں ملکہ رابعہ دورانی کی تمام ذاتی چیزیں متعدد قرآن شریف اور مذہبی کتابیں۔ تانبے کے برتن، چینی کے سینکڑوں ظروف وغیرہ بند پڑے تھے۔

چینی کے پیالے اور رکابیاں وغیرہ قدیم اصل چینی صنعت کا نادر نمونہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں خریدی گئی ہوں گی اس زمانے میں چینی مٹی کے ظروف چین کے سوا کسی اور ملک میں نہیں بنائے جاتے تھے۔ آج کل یورپ میں اُن اصل چینی ظروف کی بڑی قدر ہے۔ عام آدمی کو وہ قدیم ظروف یورپ اور جاپان کی نئی مصنوعات کے مقابلے میں، بھدّے معلوم ہوتے ہیں مگر یورپ کے قدرشناس ان قدیم ظروف کی اصلیت پہچانتے ہیں اور ان کو نادرات میں شمار کرتے ہیں اس لیے ان کو بھاری قیمت دے کر خرید لیتے ہیں۔ بہت سے یورپی تاجر اور یورپی سیاح ایسی نادر چیزوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ مقبرے کے نگہبانوں کو جب ان ظروف کی قدر و قیمت معلوم ہوئی تو انھوں نے ان نادرات کو غائب کرنا شروع کیا۔ یہ خبر کسی طرح مولوی صاحب کے کانوں تک پہنچی۔ مولوی صاحب نے متعلقہ محکمے سے اجازت لے کر اس تہہ خانے سے ساری چیزیں باہر نکلوائیں انھیں صاف ستھرا کر کے اُس ایوان میں عمدہ الماریوں اور شوکیسوں میں سجا دیا۔ لیجیے مقبرے میں مقبرے ہی کی چیزوں کی ایک نمائش گاہ بن گئی۔

جس زمانے میں ہم اورنگ آباد گئے تھے اس وقت تک مولوی صاحب یہ سب کام کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے سکونتی کمروں کے سامنے چند کمرے اور بنوا دیئے تھے جن میں انجمن ترقی اُردو کا دفتر اور پریس قائم تھا۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان بہت اچھا چمن لہلہا رہا تھا جس میں شام کو نشست رہا کرتی تھی۔

ناشتے کی دعوت پر ہم دوسرے دن سویرے ہی مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مہدی نواز جنگ برآمدے میں یا اس کے سامنے صحن میں پلنگ پر سو رہے تھے نذ ایک آدمی اور آ گئے جنھیں مولوی صاحب نے بلایا تھا۔ ہم سب مولوی صاحب کے ساتھ برآمدے میں ایک طرف بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ناشتے کے لیے مہدی نواز جنگ کے جاگنے کا انتظار تھا۔ ہم کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے۔ یکایک مولوی صاحب نے فرمایا — "بھئی وہ جاگ چکے ہیں۔ مگر ہمیں یہاں بیٹھا دیکھ کر بستر نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ چلو اندر چلو۔ دیکھو ابھی اُٹھ بیٹھتے ہیں۔" ہم سب اندر ناشتے کی میز پر جا بیٹھے۔ چند ہی منٹ میں مہدی نواز جنگ جاگ بھی، غسل خانے بھی گئے۔ نہا دھو کر تازہ دم ہو کر مسکراتے ہوئے ناشتے کی میز پر آ بیٹھے۔ مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے فتح مندانہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا — مطلب یہ کہ — "دیکھا، میں نہ کہتا تھا؟"

ناشتہ لگایا گیا۔ طرح طرح کی چیزیں تھیں۔ دلچسپ گفتگو اور لطیفے ہو رہے تھے۔ ناشتہ نصف کے قریب ہو چکا تھا کہ مولانا منظور محمد صاحب لیکچرار دینیات اورنگ آباد کالج آ گئے اور مولوی صاحب کو برآمدے ہی سے سلام کر کے وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب نے انھیں دیکھتے ہی بلایا — "اندر آئیے۔ ناشتہ کیجیے۔" انھوں نے جواب دیا میں ناشتہ کر کے گھر سے چلا ہوں۔ مولوی صاحب نے اصرار کیا، انھوں نے انکار کیا۔ دو تین بار اصرار اور انکار کے بعد مولوی صاحب نے یکدم لہجہ بدل کر کہا۔ "شہد ہے شہد! شہد تو کھا لیجیے۔" اس پر مولانا منظور محمد کرسی سے کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "اچھا شہد ہے" یہ کہہ کر میز پر آ گئے۔ مولوی صاحب کی آنکھوں میں دبی فتح مندانہ چمک پیدا ہوئی۔ ہم سب نے مولوی صاحب کے اس موثر فقرے کا بڑا لطف لیا۔

میز پر بیٹھ کر مولانا نے شہد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مولوی عبدالحق نے کہا — "پہلے کوئی نمکین چیز تو چکھ لیجئے"۔ اس پر کسی نے کوئی چیز مولانا منظور کے سامنے بڑھا دی۔ مجبوراً انھوں نے لے لی۔ پھر کوئی اور چیز بڑھائی گئی اور پھر دوسری چیز بڑھائی گئی۔ غرض ناشتے کا پورا سلسلہ دہرایا گیا۔ آخر میں سب کے ساتھ مولانا منظور کو شہد ملا۔

اس موقع پر نواب مہدی نواز جنگ نے مہاراجا کشن پرشاد کی ایک خاص ادا کا حال سنایا، جس سے مغلیہ تہذیب کے اس آخری نمائندے کی افتادِ طبیعت کا اندازہ ہوتا تھا۔ انھوں نے کچھ اس طرح بیان کیا :-

"مجھے مہاراجا بہادر کا سیکریٹری بنے کچھ ہی دن ہوئے تھے، ایک روز میں صبح کو مہاراجا بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھا، تیوری چڑھی ہوئی ہے، ملازموں پر بات بات پر برہم ہو رہے ہیں۔ مجھ سے بھی سیدھی طرح بات نہیں کی۔ میں پریشان ہو کر ان کے کمرے سے باہر نکل آیا اور ایک خاص شاگرد پیشہ سے پوچھا، کیا بات ہے آج سرکار کا موڈ بہت خراب ہے۔ اس نے کہا آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے کوئی مولانا آئے تھے وہ کہیں مسجد بنوا رہے ہیں۔ اس کے لیے سرکار سے چندے کی درخواست کی۔ سرکار نے ان مولانا کے رومال میں اپنا پورا قلمدان آلٹ دیا۔

یہ قلمدان ایسا تھا جس میں مختلف خانے بنے ہوئے تھے۔ کسی خانے میں سو سو روپے کے نوٹ، کسی میں دس دس کے نوٹ، کسی میں پانچ پانچ کے نوٹ، کسی میں روپے، کسی میں اٹھنیاں، چونیاں، دوانیاں وغیرہ رکھی رہتی تھیں۔ اس طرح قلمدان میں پانچ ہزار روپیہ رکھا رہتا تھا۔ یہ قلم دان مہاراجا بہادر کی کرسی کے پاس ایک تپائی پر رکھا رہتا تھا — غرض شاگرد پیشہ سے یہ بات سن کر میں نے فوراً ایک ساہوکار کو ٹیلیفون کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان خانوں میں کتنے کتنے سکے اور نوٹ درکار ہوتے ہیں۔ میں نے فون پر اس کی تفصیل لکھوا دی اور کہا یہ سب لے کر فوراً یہاں آجاؤ — وہ ساہوکار میری تفصیل کے مطابق پانچ ہزار کے مختلف سکے اور نوٹ لے کر چند منٹ میں حاضر ہو گیا۔ میں نے پیش خدمت سے وہ قلمدان اٹھوا منگایا اور سارا روپیہ خانوں میں ترتیب سے جا کر قفل لگا دیا۔ پھر قلم دان کو اسی تپائی پر رکھوا دیا۔ اس ساری مدت میں مہاراجا بہادر کسی گہری فکر میں حقہ گڑگڑاتے رہے۔ جب قلم دان تپائی پر رکھ دیا گیا تو میں نے ادب کے ساتھ کان میں کہا۔ سرکار ذرا قلم دان ملاحظہ فرمالیں — یہ کہہ کر کنجی سامنے رکھ دی۔ مہاراجا بہادر نے قفل کھولا، قلم دان کو بھرا ہوا دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ مجھے بلایا اور کہا — مہدی تم بڑے سمجھ دار آدمی ہو — اس کے بعد وہ ہر شخص سے جھک جھک کر باتیں کرنے لگے۔ اس روز سے میرا یہ طریقہ ہو گیا ہے کہ ڈیوڑھی (محل) میں جاتا ہوں تو سب سے پہلے قلم دان کو دیکھ لیتا ہوں کہ خالی تو نہیں ہے"۔

ناشتے کے بعد مہدی نواز جنگ اور دوسرے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ مولوی صاحب کا ایما پا کر ہم لوگ بیٹھے رہے اور دیر تک مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ ان دو ملاقاتوں میں جو قابلِ ذکر باتیں ہوئیں ان میں سے کچھ تو اوپر عرض کر چکا ہوں کچھ یہاں پیش کرتا ہوں۔

مولوی صاحب کے ہاں بعض ایسے تازہ پھل بھی موجود رہتے تھے جو اورنگ آباد یا حیدر آباد میں نہیں ملتے تھے۔ میں نے ان پھلوں

کے متعلق دریافت کیا کہ وہ مولوی صاحب کو کس طرح مل جاتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ صوبہ سرحد اور دُوسرے مقامات سے منگواتے ہیں۔ میں نے اس پر تعجب کیا کہ وہ مولوی صاحب تک پہنچ کس طرح جاتے ہیں۔ کیونکہ ریلوے سے پھلوں کا پارسل شاذ ہی صحیح سالم وصول ہوا کرتا تھا۔ اس پر مولوی صاحب ہنسے اور فرمایا مجھے یہاں کوئی پارسل صحیح سالم نہیں ملتا تھا۔ آخر ایک روز میں نے ریلوے کے جنرل منیجر کو ایک درخواست بھیجی جس میں اپنی موجودہ ملازمت اور تنخواہ کا حال لکھ کر بتایا کہ میری غذا کا جزوِ اعظم تازہ پھل ہیں۔ وہ میں دُور دُور سے منگواتا ہوں مگر مجھے پھلوں کا کوئی پارسل بھرا ہوا نہیں ملتا۔ اس لیے اگر آپ مجھے اورنگ آباد کا پارسل کلرک بنا دیں تو میں اپنی موجودہ ملازمت ترک کرنے کے لیے تیار ہوں کیونکہ اس سے میری غذا کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس درخواست پر ریلوے کے جنرل منیجر نے انھیں اطمینان دلایا کہ آیندہ سے آپ کے پارسلوں کے پھل غائب نہیں ہوں گے۔ چنانچہ یہی ہو رہا ہے کہ پارسل مجھے صحیح سالم مل رہے ہیں۔

مولوی سیّد وحید الدین سلیم پانی پتی پروفیسر اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کا کچھ ہی مدّت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی۔ کوئی ایسا موزوں آدمی نظر نہیں آتا تھا جو پروفیسر سلیم کا بدل ثابت ہو۔ میں نے مولوی صاحب سے سوال کیا کہ کیا آپ کے خیال میں کوئی موزوں شخص ہے۔ مولوی صاحب نے اس سوال پر بڑی مایوسی کا اظہار کیا۔ اس پر میں نے کہا کہ اس خدمت پر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی بہت موزوں رہیں گے۔ اس تجویز پر مولوی صاحب اچھل پڑے۔ کہا "کیفی اُردو کی پروفیسری کے لیے بہترین شخص ہیں"۔ مولوی صاحب نے اس انداز سے کہا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور یہ نام پیش کر کے منظور کرا لیں گے۔ مولوی صاحب اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی سے پنشن پا چکے تھے اور ہمیں کسی ذریعے سے اس کا علم ہو چکا تھا کہ وہ اب انجمن کو دہلی لے جانا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں مولوی صاحب کے کارنامے اور ملک میں ان کا مقام اُردو کی پروفیسری سے بالاتر تھا۔ البتہ عثمانیہ یونیورسٹی کالج کی پرنسپلی ان کے لیے موزوں ہو سکتی تھی۔ مولوی سلیم کو اُردو لکچراری دلوانے والے اور اپنے اثر سے درجہ بہ درجہ انھیں پروفیسری کے گریڈ تک پہنچانے والے مولوی عبدالحق ہی تھے۔ اس لیے میں یہ تجویز پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ وہ خود پروفیسر بن جائیں۔

ہم اورنگ آباد کے بعد مختلف اضلاع کا دورہ کر کے حیدر آباد پہنچے۔ چند ہی روز کے بعد اطلاع ملی کہ یونیورسٹی کی اُردو کی پروفیسری کے لیے پنڈت کیفی کا نام زیرِ غور ہے۔ جب یہ خبر پھیلی تو حیدر آباد کے اخباروں نے ملکی غیر ملکی کا سوال اٹھایا۔ حیدر آباد کا مقبول روزنامہ "رہبرِ دکن" اس میں پیش پیش تھا۔ پنڈت کیفی نے عثمانیہ یونیورسٹی میں زبان و ادب کے موضوع پر توسیعی لکچر دیے، ظاہر ہے کہ یہ لکچر مولوی صاحب ہی کی تحریک پر ہوئے ہوں گے۔ ان سے غالباً مولوی صاحب کا یہ مقصد ہو گا کہ شہر کا دانش ور طبقہ اور یونیورسٹی کے لوگ پنڈت کیفی کی اعلیٰ قابلیت کا اندازہ کر سکیں۔ چند روز کے بعد معلوم ہوا۔ یونیورسٹی کے اربابِ اقتدار مولوی صاحب ہی کو اُردو کی پروفیسری قبول کرنے کے لیے اصرار کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سر اکبر حیدری کو مولوی صاحب کا حیدر آباد سے جانا پسند نہیں تھا۔ مہاراجا کشن پرشاد اگرچہ صدرِ اعظم تھے مگر بابِ حکومت اور یونیورسٹی کونسل پر سر اکبر ہی کا اقتدار تھا اور مہاراجا سر کشن پرشاد مولوی عبدالحق کے بڑے قدر دان تھے۔ ان کو مولوی صاحب کا قدر دان بنانے میں ظاہر ہے مہدی نواز جنگ کا ہاتھ ہو گا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مولوی صاحب اورنگ آباد کالج سے پنشن لینے کے بعد قطعی طور پر یہ ارادہ کر چکے تھے کہ انجمن کو دہلی لے جائیں تاکہ وہاں سے

انجمن کا کام موثر طریقہ پر انجام دیا جاسکے ۔

روزنامہ رہبر دکن نے پنڈت کیفی کے تقرر کی خبر یا افواہ کو بہانا بنا کر غیر ملکیوں کے تقرر کے خلاف مضامین لکھنے شروع کیے ۔ میں نے ان مضامین کا جواب دیا اور بتایا کہ یونیورسٹی میں تقرروں کا معیار صرف قابلیت اور موزونیت ہونا چاہیے ، ویسے بھی ریاست کے قدیم احکام میں تعلیمات اور پولیس کے دو سررشتوں میں ملکی ہونے کی شرط سے استثنا موجود تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس کے لیے باہر کے تجربہ کار لوگ اور تعلیمات کے لیے قابل غیر ملکی لوگ لیے جاسکتے ہیں۔ اُردو کی پروفیسری کے مسئلے سے کچھ ہی پہلے "ملکی" تحریک کی ایک لہر پیدا کی گئی تھی۔ اس کے پیدا کرنے والے محکمہ تعلیمات کے چند ملکی عہدے دار تھے جو سر راس مسعود کے چلے جانے کے بعد ان کی جگہ نظامت تعلیمات پر اپنا حق سمجھتے تھے لیکن حکومت نے (یعنی سر اکبر حیدری نے) خان فضل محمد خاں کو ناظم تعلیمات بنا دیا تھا۔ خان فضل محمد خاں، سر راس مسعود کے زمانے میں نائب ناظم (ڈپٹی ڈائرکٹر) تھے۔ وہ برسوں حیدر آباد کے ایک قدیم ہائی سکول ـــ سٹی ہائی اسکول کے پرنسپل رہ چکے تھے۔ انھوں نے اس مدرسے کو اتنی ترقی دی تھی کہ وہ ایک معیاری ہائی اسکول بن گیا تھا۔ انھوں نے نہ صرف طلبہ میں تعلیم کا صحیح ذوق پیدا کیا بلکہ طلبہ کے اخلاق و آداب کی تربیت پر بھی خاص توجہ کی تھی۔ خاں صاحب کے اس زمانے کے شاگرد بعد میں حیدر آباد کے بڑے بڑے ذمے دار عہدوں پر فائز ہوئے ۔

غرض اس ملکی تحریک کو جو خان فضل محمد خاں کے تقرر کے بعد چلائی گئی تھی۔ اُردو کی پروفیسری کے سلسلے میں پھر تیز کیا گیا۔ میں نے بھی رہبر دکن کے جواب میں متعدد مضامین لکھے۔ مولوی مجیب احمد تمنائی سہارن پوری ایک پرانے اخبار نویس تھے۔ وہ مدت سے سرکاری ملازمت میں منسلک تھے لیکن درپردہ روزنامہ مشیر دکن کے ایڈیٹر تھے۔ مشیر دکن ہمارے زمانے کے زندہ روزناموں میں حیدر آباد کا قدیم ترین روزنامہ تھا۔ اس کے مالک اورنگ آباد کے ایک مرہٹہ برہمن پنڈت کشن راؤ تھے۔ پہلے یہ اخبار "دکن پنچ" کے نام سے نکلتا تھا۔ پنڈت کشن راؤ نے اس کو خرید لیا اور عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم کو جو مطبع نول کشور میں ملازم تھے، اور حیدر آباد آئے ہوئے تھے، اس کی ادارت پیش کی۔ شرر مرحوم نے کہا مجھے پنچ قسم کے اخبار کی ایڈیٹری پسند نہیں اس کا نام بدل کر "مشیر دکن" رکھو۔ چنانچہ اس کا نام مشیر دکن ہوگیا۔ عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ جاکر مطبع نول کشور سے قطع تعلق کیا اور پھر حیدر آباد آکر مشیر دکن کو ایڈٹ کرنے لگے۔ شرر مرحوم بھی عزیز مرزا کے دوست تھے۔ مولانا شبلی تو عزیز مرزا کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ تقریباً روزانہ شام کو ظفر علی خاں، عبدالحلیم شرر اور مولوی صفی الدین وغیرہ عزیز مرزا کے مکان پر جمع ہوتے اور شام کا کھانا ایک ساتھ کھایا کرتے تھے۔ پہلے عرض کرچکا ہوں، کہ ۱۹۰۹ء میں اس پارٹی کے تمام افراد، ولی عہد میر عثمان علی خاں کو تخت نشین کرانے کی کوشش کے الزام میں شہر بدر کیے گئے تھے، شاید شرر مرحوم کے چلے جانے کے بعد، کشن راؤ صاحب نے مشیر دکن کی ادارت مولوی تمنائی کے سپرد کی ہوگی۔ مولوی تمنائی اس اخبار کا صرف اداریہ لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ اس روزنامے کا ریاست کے تقریباً تمام حلقوں پر بڑا اثر تھا۔ غرض رہبر دکن سے ملکی غیر ملکی کے مسئلے پر ہماری یہ بحث بھی مولوی تمنائی کو پسند نہیں آئی۔ انھوں نے رہبر دکن کے خلاف ایک سخت مضمون لکھا۔ اس ایک ہی مضمون نے رہبر دکن کا منہ بند کردیا۔ اسی اثنا میں خبر ملی کہ مولوی صاحب نے اُردو کی پروفیسری قبول کرلی۔ اس طرح یہ ہنگامہ ختم ہوگیا۔

رہبر دکن یعنی ملکی تحریک کے خلاف مضامین لکھنے پر مجھے بعد میں نقصان اٹھانا پڑا۔ بعض حلقوں میں یہ بات پھیلائی گئی کہ میں خود غیر ملکی ہوں، لیکن ان باتوں کا علم مجھے برسوں کے بعد ہوا۔

(۱۶)

مولوی عبدالحق ۱۹۳۰ء سے شہر حیدرآباد میں رہنے لگے۔ ویسے تو وہ ہر ماہ اورنگ آباد جایا کرتے تھے، کیونکہ انجمن کا دفتر اور پریس وغیرہ تمام کاروبار اورنگ آباد میں تھا لیکن اب حیدرآباد میں ان کا قیام مستقل ہوگیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں مجھے حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ بعض خانگی وجوہ سے میں نے اخبار نویسی ترک کردینے کا ارادہ کرلیا۔ اس زمانے میں مجھے آسانی سے اگر کہیں ملازمت مل سکتی تھی تو وہ محکمہ تعلیمات تھا۔ جس میں آئے دن توسیع ہورہی تھی اور اس محکمے کے عہدے داروں سے میری شناسائی تھی۔ چنانچہ میں نے جناب خان فضل محمد خاں ناظم تعلیمات سے ملازمت کی درخواست کی۔ موصوف کا بڑا ممنون احسان ہوں کہ انھوں نے فوراً مجھے مامور کرلیا۔ قسمت کی بات کہ اس وقت تعلقہ پٹن کے مدرسے کی ہیڈماسٹری خالی تھی۔ جناب خاں صاحب نے مجھے پٹن بھیج دیا۔ پٹن اورنگ آباد ضلع کا ایک تعلقہ ہے اور شہر اورنگ آباد سے تیس میل کے فاصلے پر دریائے گوداوری کے کنارے، صوبہ بمبئی کے ضلع احمد نگر کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ ایک تاریخی قصبہ ہے۔ کہا جاتا تھا کہ دکن پر مسلمانوں کے اقتدار سے پہلے یہ قصبہ ہندو سلطنت کا مغربی مرکز حکومت تھا۔ پٹن جانے کے لیے اورنگ آباد تک ریل پر اور پھر موٹر بس میں جانا پڑتا تھا۔ اس طرح مجھے ہر مرتبہ اورنگ آباد سے گزرنا پڑتا تھا۔ اکثر مرتبہ وہاں قیام بھی رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اورنگ آباد میں مجھے تعلیمی حلقوں ہی سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان حلقوں سے مجھے مولوی عبدالحق کی بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔

قصبہ پٹن شیخ چاند ایم۔ اے مرحوم کا وطن تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے ایک مکان خریدا تھا جس میں میں کچھ مدت تک مقیم بھی رہا۔ جب کبھی شیخ چاند پٹن آتے۔ ان سے ملاقاتیں رہتیں۔ شیخ چاند کے ایم اے پاس کرلینے کے بعد مولوی صاحب نے انھیں انجمن سے وابستہ کردیا تھا۔ کچھ مدت حیدرآباد میں اور کچھ مدت اورنگ آباد کا کام ان کے سپرد کیا تھا۔ شیخ چاند سے جو باتیں ہوتی تھیں وہ زیادہ تر مولوی صاحب، اور انجمن ہی کے متعلق ہوتی تھیں۔ قدیم دکنی مخطوطات کے حاصل کرنے میں شیخ چاند نے مولوی صاحب کی بڑی مدد کی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض لطیفے بھی سنائے تھے۔ اور جن جن ترکیبوں سے مخطوطات حاصل کیے گئے تھے ان کا حال بھی سنایا تھا۔

شیخ چاند مرحوم نے ایک واقعہ یہ سنایا تھا کہ انھیں یہ پتا چلا کہ کسی شخص کے ہاں بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل کی تصنیف "نورس نامہ" کا اصل نسخہ موجود ہے۔ شیخ چاند نے انجمن کے لیے اس کو خریدنے کی بہت کوشش کی مگر وہ شخص کچھ اس قسم کا کتاب پرست تھا کہ کسی قیمت پر اس کو فروخت کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ کچھ مدت کے بعد اس شخص کا انتقال ہوگیا۔ اس کا لڑکا اس نسخے کو فروخت کرنے پر تیار ہوگیا۔ شیخ چاند نے اس سے تین سو روپے قیمت ٹھہرائی اور وہ نسخہ لے کر خوش خوش مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خبر نہیں مولوی صاحب کس موڈ میں تھے۔ تین سو روپے میں بھی وہ نسخہ خریدنے پر راضی نہیں ہوئے۔

شیخ چاند کو بڑی حیرت اور مایوسی ہوئی۔ مجبوراً شیخ چاند نے وہ نسخہ مولوی خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی کو دکھایا۔ انھوں نے دیکھتے ہی خریدنے پر آمادگی ظاہر کی۔ قیمت پوچھی شیخ چاند نے شاید بھاؤ تاؤ کے لیے بڑی گنجائش رکھ کر اس کی قیمت نو سو روپے بتائی۔ خورشید علی صاحب نے اسی وقت نو سو روپے ادا کردیئے اور کتاب پر قبضہ کرلیا۔ اگر شیخ چاند اس کی قیمت دو ہزار بھی بتاتے تو شاید خورشید علی صاحب کو اس نادر نسخے کے لیے دو ہزار ادا کرنے میں بھی تامل نہ ہوتا۔ بہرحال شیخ چاند نے تین سو روپے تو کتاب کے مالک کو ادا کیے اور بقیہ رقم اپنی جیب میں اتاری۔ اب ان کو مولوی صاحب کے انکار پر رنج نہیں تھا خوشی تھی۔ وہ کہتے تھے یہ روپیہ ان کی شادی میں کام آیا۔

میں فن تعلیم اور مدرسے کے انتظامی کاموں سے بالکل نابلد تھا، اس لیے بڑی غلطیاں کر بیٹھتا تھا۔ وہ تو جناب سیّد ساجد علی صاحب مہتمم تعلیمات کی بزرگانہ شفقت تھی کہ میری غلطیوں سے چشم پوشی کرکے ایک شفیق استاد کی طرح میری اصلاح کرتے رہتے تھے۔ آخر ایک ترکیب یہ سمجھ میں آئی کہ اپنی معلومات کی کمی کو پورا کرنے کے لیے میں پرانی مسلوں (فائلوں) کو دیکھوں کہ پہلے کے ہیڈ ماسٹروں کا کیا طریقہ کار تھا۔ اس سلسلے میں مجھے مدرسے کے دفتر میں ایک موٹا سا رجسٹر نظر آیا، دیکھا تو معلوم ہوا یہ "کتاب الرائے" ہے۔ ہر سال مدرسے کا معائنہ کرنے کے لیے جو مہتمم تعلیمات آتے وہ اس رجسٹر میں اپنی رائے اور ہدایتیں لکھ دیا کرتے تھے۔ یہ طریقہ بعد میں متروک ہوگیا تھا۔ غرض اس رجسٹر کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس میں مولوی عبدالحق کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی ہدایتیں بھی ملیں۔ مولوی صاحب کی یہ تحریریں بھی بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ مثلاً:-

ایک سال مولوی صاحب نے جب اس مدرسے کا معائنہ کیا، ایک معمر مدرس صاحب کے کام سے ناراض ہوئے۔ ان کے لیے چند ہدایتیں لکھیں۔ دوسرے سال دیکھا کہ اُن حضرت نے مولوی صاحب کی ہدایتوں پر کوئی عمل نہیں کیا۔ اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے سابقہ ہدایتوں کی تعمیل کرنے کی تاکید کی۔ تیسرے سال آئے تو وہی حالت پائی۔ اب ان مدرس صاحب کے متعلق مولوی صاحب نے صرف ایک فقرہ لکھا:-

"خدا ان معصوموں کے سروں سے ان بزرگ کا سایہ جلد اٹھالے"

خبر نہیں دوسرے اسکولوں کی کتاب الرائے میں اس قسم کے کتنے فقرے ہوں گے جو دفتری انباروں میں دفن ہوگئے۔

سیّد حسین صاحب مولوی صاحب کے تحت ایک ضلع کے مہتمم تعلیمات تھے۔ یہ علی گڑھ کے قدیم طالب علم تھے۔ اپنے زمانے کے بڑے اچھے اسپورٹس مین رہے ہوں گے۔ کسرتی بدن کے مضبوط آدمی تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے۔ تعلیمات کے افسر کے بجائے فوجی افسر نظر آتے تھے۔ سنا تھا کہ انھوں نے لڑکیوں کے کسی مدرسے کی ایک معلّمہ کو گھر ڈال لیا تھا جس کی وجہ سے مولوی صاحب ان سے ناراض ہوگئے کہ انھوں نے اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس کی شکایت ناظم تعلیمات کو کردی۔ وہاں سے جواب طلب ہوا۔ سیّد صاحب نے جواب دیا کہ اس خاتون نے پہلے اپنی ملازمت سے استعفا دے دیا تھا تب انھوں نے گھر ڈال لیا۔ اس وقت وہ محکمہ تعلیمات کی ملازم نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ سیّد صاحب نے مولوی صاحب پر بھی کچھ چوٹیں کیں۔ غرض مولوی صاحب سے ان کے تعلقات اچھے نہیں

رہے تھے۔

ایک مرتبہ دفتر نظامت تعلیمات میں میرے کرم فرما سر محمد خاں صاحب ڈپٹی ناظم کے ہاں سید حسین صاحب کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ مولوی عبدالحق کے سلسلے میں سید صاحب نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ مولوی صاحب دورے پر ان کے ضلع میں آئے اور ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ شام کے پانچ بجے مولوی صاحب ٹہلنے کے لیے نکلے۔ سید صاحب بھی ساتھ ہو لیے۔ اس روز شام کو سید صاحب نے مولوی صاحب کی آمد کی تقریب میں ڈاک بنگلے ہی میں مقامی عہدے داروں کی دعوت کی تھی۔ مغرب کے وقت مولوی صاحب اور سید صاحب ایک لمبی سیر کے بعد واپس آئے جب ڈاک بنگلے کے قریب پہنچے تو مولوی صاحب ایک درخت کے نیچے پتھر پر بیٹھ گئے۔ سید صاحب نے کہا دعوت کا وقت قریب آگیا لوگ آتے ہی ہوں گے۔ بنگلے میں چلیے۔ مولوی صاحب نے دعوت میں شریک ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ سید صاحب نے منت سماجت کی کہ تعلقدار ضلع (کلکٹر) مہتمم کوتوالی (سپرنٹنڈنٹ پولیس) سول سرجن وغیرہ تمام عہدے دار آرہے ہیں۔ اصل مہمان ہی موجود نہ ہوگا تو انھیں کیا جواب دوں گا۔ مگر مولوی صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اتنے میں لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ سید صاحب بڑے سٹ پٹائے کہ اب کیا کیا جائے۔ مولوی صاحب کسی طرح ماننے ہی نہیں تھے۔ تنگ آکر سید صاحب نے کڑے لہجے میں کہا "مولوی صاحب ہم تو ہر طرح آپ کا احترام کرتے ہیں۔ آپ سے محبت رکھتے ہیں۔ مگر آپ ہماری سبکی کا کچھ بھی خیال نہیں کرتے۔ اگر آپ نہیں چلیں گے تو میں آپ کو گود میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ پھر جو کچھ ہوگا، اس کے آپ ذمے دار ہیں" سید صاحب کا یہ چیلنج سنتے ہی مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور سر جھکائے ڈاک بنگلے میں پہنچے۔ وہاں لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مولوی صاحب چہکنے لگے۔ کسی کو یہ خبر بھی نہیں ہوئی کہ درخت کے نیچے کیا واقعہ گزرا۔

مولوی صاحب فرض شناس اور محنتی معلموں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک دور دراز کے چھوٹے سے گاؤں میں صبح صبح پہنچے وہاں صرف مرہٹی کے دو ایک جماعتوں کی تعلیم ہوتی تھی اور ایک ہی مرہٹہ ماسٹر مقرر تھا۔ مولوی صاحب مدرسے میں پہنچے تو دیکھا کہ ماسٹر صاحب جماعت میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے ہیں اور ان کی بیوی چائے کے برتن لیے بیٹھی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر مولوی صاحب جھلا گئے اور کہا — "یہ مدرسہ ہے یا چائے خانہ ہے"؟ ماسٹر کو مولوی صاحب کا اعتراض برا لگا، اس نے بھی جھلا کر کہا "مولانا صاحب! میرے ہاں آپ کی طرح چار چار نوکر نہیں جو صبح سویرے ہی مجھے چائے پلادیں۔ سارا کام میری بیوی کرتی ہے۔ آج صبح کا مدرسہ ہے۔ چائے بننے میں دیر تھی اس لیے میں، چائے پیئے بغیر مدرسے میں آگیا۔ کیا مدرسے میں چائے پینا کوئی جرم ہے"؟ اس جواب پر مولوی صاحب خاموش چلے گئے۔ بیل گاڑی پر مولوی صاحب کا سامان سفر، چپراسی اور منشی پیچھے آرہے تھے۔ جب وہ پہنچ گئے تو مولوی صاحب نے ناشتہ کر کے مدرسے کا معائنہ کیا۔ ماسٹر کے کام کو قابل تعریف پایا۔ اس کی داد دی۔

چائے کا رواج عام ہو جانے کے متعلق مولوی صاحب نے فرمایا تھا کہ ایک مرتبہ وہ اورنگ آباد کے پہاڑی علاقے میں جنگلی بھیلوں کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ بھیلوں نے چائے بنا کر پیش کی۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ مجھے اس پہاڑی علاقے میں چائے کا رواج دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی

—— (۱۷) ——

۱۹۳۵ء میں انگریز حکومت کو شدید سیاسی ہیجانوں کو دبانے کی کوشش میں ناکام ہو کر، ہندوستان کے لیے ایک دستور الحکومت منظور کرنا پڑا جس کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کہا جاتا ہے ۔ کانگریس اگرچہ بظاہر اس سے مطمئن نہیں تھی مگر اندر اندر اس کو قبول کر لینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار تھی ۔ اس قانون کی رُو سے ان صوبوں میں جہاں کانگریس کا اثر زیادہ تھا ۔ چند محکموں پر کانگریسی وزرا کا تقرر ہونا لازمی تھا ۔ اب کانگریس اور گاندھی جی کو ہندوستان کی آئندہ کی سرکاری زبان کے متعلق تصفیہ کرنا تھا کہ وہ کیا ہو ۔ گاندھی جی نے چند سال پہلے کانگریس سے یہ تجویز منظور کرائی تھی کہ ہندوستان کی سرکاری زبان " ہندوستانی " ہوگی ۔ اُردو داں طبقہ مطمئن تھا ، کیونکہ بعض انگریز مصنفین نے اُردو ہی کو " ہندوستانی " کا نام دیا تھا اور اس نام سے اُردو کی کئی ایک کتابیں رومن ٹائپ میں شائع کی تھیں ۔ لیکن اب جو کانگریس کو اقتدار کا حاصل ہونا یقینی نظر آیا تو " ہندوستانی " کی اصطلاح کو ترک کر کے خالص ہندی کو سرکاری زبان قرار دینے کا فیصلہ کر انہ وری معلوم ہوا ۔ چنانچہ گاندھی جی کی صدارت میں ۲۴ را پریل ۱۹۳۶ء کو ناگ پور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ہوا جس میں مولوی صاحب بھی مدعو کیے گئے ۔ غالباً مولوی صاحب کے جاننے والوں کا یہ خیال ہوگا کہ مولوی صاحب برسوں سے کھدر پہن رہے ہیں وہ ضرور اندرونی طور پر کانگریسی یا کانگریس کے ہمنوا ہیں ۔ اس لیے انھیں مولوی صاحب کی طرف سے کسی مخالفت کا اندیشہ نہیں ہوا ہوگا ۔ مگر کمیٹی میں مولوی صاحب نے بڑی جرات کے ساتھ گاندھی جی کی اصطلاح " ہندی ہندوستانی " کی مخالفت کی ۔ اب مولوی صاحب کو کانگریس کی اس ذہنیت نے بہت برہم کر دیا ۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں ہی خواہان اُردو کا ایک جلسہ طلب کیا اور جلسے سے یہ فیصلہ منظور کرالیا کہ انجمن ترقی اُردو کو مرکزی دارالحکومت دہلی میں منتقل کرنا چاہیے ۔ انجمن کی مالی حالت مولوی صاحب نے بہت اچھی بنا دی تھی اس لیے انجمن کو دہلی منتقل کرنا کچھ مشکل نہیں تھا ۔ آخر حیدر آباد میں انجمن کی مالی امداد میں دس ہزار روپے سالانہ اضافے کے لیے ضروری کوشش کر کے ۱۹۳۸ء میں مولوی صاحب نے حیدر آباد کو خیر باد کہا ۔ انجمن کا دفتر دہلی منتقل کر دیا گیا ۔ اسی زمانے میں چھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں ۔

ریاست حیدر آباد میں ۱۹۳۵ء تک کوئی سیاسی ہیجان نہیں تھا لیکن ۱۹۳۶ء سے نواب بہادر یار جنگ کی قیادت میں انجمن اتحاد المسلمین نے ریاست کے مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنا شروع کیا ۔ اب حیدر آباد کی معاشرتی زندگی میں بھی تبدیلی رونما ہونے لگی ۔

جیسا کہ میں نے اُوپر عرض کیا ۔ ۱۹۳۳ء سے ملازمت تعلیمات اور شہر حیدر آباد سے دُور رہنے کی وجہ سے مجھے مولوی صاحب سے ربط باقی نہیں رہا تھا ۔ مولوی صاحب کے دہلی چلے جانے کے بعد تو اس کا امکان ہی باقی نہیں رہا ۔ غرض پندرہ سولہ برس کے بعد ۱۹۴۹ء میں مولوی صاحب سے یہاں کراچی میں نیاز حاصل ہوا تو مولوی صاحب کو بالکل بدلا ہوا انسان پایا ۔

—— (۱۸) ——

مولوی عبدالحق کا نوّے سال سے زیادہ عمر پانا کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آخری علالت سے پہلے تک ان کے اندر کام کرنے کا دَم خم باقی تھا ۔ اگر اُس علالت سے شفا پا جاتے تو یقین ہے کہ وہ اپنا کام جاری رکھتے ۔ ایسی طویل العمری جس میں کام کرنے کی صحت اور طاقت باقی رہے ضرور قابل تعجب ہے ۔ ہمارے ملک میں ساٹھ ستر سال کی عمر کے بعد لوگ عموماً اس قابل نہیں رہتے کہ کوئی دماغی

کام کرسکیں۔ دُنیا کے ماہرِ فن ڈاکٹروں نے طویل العمری کا راز دریافت کرنے کی بڑی کوششیں کیں مگر وہ کسی خاص نتیجے تک نہیں پہنچ سکے۔ مولوی صاحب کی طرزِ زندگی میں بھی چند ایسی خاص باتیں نظر آتی ہیں جن کے وہ بڑے پابند تھے۔ اس طرح کی مستقل مزاجی کے ساتھ کسی بات کی پابندی عام آدمیوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ راقم الحروف کو تو ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو مولوی صاحب کی طرح سال ہا سال تک مستقل مزاجی کے ساتھ کسی اصول یا قاعدے کا پابند رہا ہو۔

مولوی صاحب صبح سویرے ہی ہوا خوری کے لیے بستی سے باہر نکل جاتے تھے اور میلوں پیدل چل کر ناشتے کے وقت سے پہلے گھر آجاتے تھے۔ دُوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ التزاماً روزانہ تازہ پھل کھایا کرتے تھے۔ اور یہ تو خبر نہیں کتنے سال سے انھوں نے دوپہر کا کھانا ترک کر رکھا تھا۔ دوپہر کو وہ صرف کچھ میوے بسکٹ وغیرہ اور چائے کا ناشتہ کیا کرتے تھے۔ ان کے باورچی بشیر کا جو انٹرویو چھپا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صبح ناشتے میں حلوا ضرور کھاتے تھے۔ ان کے دسترخوان پر گوشت کی کئی چیزیں ہوتی تھیں مگر وہ خود گوشت کم کھاتے تھے۔ ایک بات یہ بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ مولوی صاحب نے عمر بھر شادی نہیں کی۔

ہوسکتا ہے کہ ان خاص پابندیوں میں سے کوئی ایک یا چند یا تمام پابندیاں ان کی طویل العمری اور دماغی توازن کا باعث ہوں۔ مجھے تو دو چیزیں خاص طور پر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو صبح کی ہوا خوری اور پیدل چلنا اور دوسرے تازہ پھلوں کا استعمال۔

مولوی صاحب کے کردار اور طرزِ عمل کی چند خصوصیتیں بھی قابلِ توجہ ہیں۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھے۔ ذرا سے اشارے پر بات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ ہمارے ملک کے لحاظ سے ان کی ایک یہ خصوصیت بھی غیر معمولی تھی کہ وہ ہر شخص کے خط کا جواب ضرور دیا کرتے تھے۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ انھوں نے کسی کے خط کا جواب نہ دیا ہو۔

البتہ ایک نقص ان کی ذات میں یہ تھا کہ وہ خالص علمی کام مستقل مزاجی کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ ان کے تقریباً تمام علمی کام ایسے ہیں جو نسبتہً کم وقت میں نمٹائے گئے ہیں۔ ان کے مزاج میں ایک بات یہ بھی پائی جاتی تھی کہ انگریزوں کی طرح کسی شخص یا چیز یا مسئلے کے متعلق اچھی یا بُری جو رائے بھی قائم کرلیتے تھے اس پر ہمیشہ قائم رہتے تھے اور کسی صورت میں اس رائے کو بدلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ خصوصیت مشہور فلسفی ایمرسن کے اس مقولے کی ضد ہے کہ ـــــ صرف مُردے اپنی رائے نہیں بدلتے ـــــ ایمرسن کا مطلب یہ ہے کہ اس بدلتی ہوئی دنیا میں حالات بدلتے رہتے ہیں۔ چونکہ ہر چیز بذاتہٖ اچھی یا بُری نہیں ہوتی۔ صرف حالات کے لحاظ سے وہ اچھی یا بُری قرار پاتی ہے۔ اگر حالات بدل جائیں تو اچھی چیز بُری ہوجاتی ہے اور بُری چیز اچھی بن جاتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کے متعلق بھی کوئی قطعی رائے قائم کرلینا بڑا غلط ہوتا ہے۔ بعض حالات میں کوئی آدمی اچھا ثابت ہوتا ہے لیکن حالات بدل جانے پر وہی آدمی بُرا ہوجاتا ہے۔ انگریز عہدے داروں کے متعلق یہ بات مشہور ہوچکی تھی کہ وہ ایک مرتبہ جو رائے قائم کرلیتے تھے اسے نہیں بدلتے تھے۔ اس بات کی وجہ سے بعض چالاک لوگ ایسی ایسی کوششیں کیا کرتے تھے جن سے انگریز عہدے دار کی رائے ان کے متعلق اچھی ہوجائے۔ جب ایک بار اچھی رائے قائم ہوجاتی تو پھر وہ چالاک لوگ بے فکری سے اپنی من مانی کرتے۔ صاحب کے سامنے اُن کی ہزار شکایت کی جائے۔ صاحب سب کو غلط سمجھتا تھا اور اپنی رائے پر قائم رہتا تھا۔

مولوی صاحب بحد دوست نواز تھے۔ اس وجہ سے بعض مسلمہ اصولوں سے انحراف کرجاتے تھے۔ اپنے چہیتوں کے ناجائز افعال بلکہ جرائم

تک سے نہ صرف چشم پوشی کرتے تھے بلکہ بعض اوقات اُن کی حمایت پر کمربستہ ہوجاتے تھے۔ اس کے علاوہ دوستی یا سفارش یا اپنی ذاتی پسندیدگی کے مقابلے میں کسی قسم کی قابلیت یا اہلیت کو نہیں دیکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے اس طرح برتاؤ کرتے تھے جیسے وہ عزیز رشتے دار ہو (یہ بات میں مولوی صاحب کے قیام حیدرآباد کی حد تک کہہ رہا ہوں۔ دہلی میں بعض لوگوں کو مولوی صاحب سے شکایت پیدا ہوچلی تھی) مولوی صاحب کے غصّے میں بھی ایک بزرگانہ ادا تھی۔ اورنگ آباد میں مولوی صاحب کے ساتھ کام کرنے والوں کا یہ خیال تھا کہ کبھی کبھی مولوی صاحب کسی معمولی بات پر جو جھلا جاتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ مزاحاً ان لوگوں کی تجویز یہ تھی کہ کسی بوڑھی یورپین خاتون سے مولوی صاحب کی شادی کرادی جائے تو یہ بات جاتی رہے گی۔ مولوی صاحب یورپی ڈگریوں سے بحد متاثر ہوتے تھے۔ بہت سے لوگ مختلف ہتھکنڈوں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے آتے تھے۔ مولوی صاحب ان کی اصل قابلیت جانچنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ ایسے لوگ مولوی صاحب کے ہاں اچھا رسوخ حاصل کرلیتے تھے۔ مولوی صاحب کی تقریر نہایت دل نشین، سلجھی ہوئی اور پُرلطف ہوتی تھی۔ ویسے نجی صحبتوں میں بھی مولوی صاحب کی گفتگو بڑی دلچسپ اور متاثر کرنے والی ہوتی تھی۔

انیسویں صدی کی اخلاقی قدروں میں ذاتی وفاداری کی بڑی اہمیت تھی۔ حکومت برطانیہ بھی وفاداری کی طالب تھی اور تمام دیسی ریاستیں بھی وفاداری کو انتہائی اہم قرار دیتی تھیں۔ حق و انصاف یا اصول کو وفاداری کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے تمام اکابر قوم بھی اپنے متبعین سے مکمل وفاداری کی توقع رکھتے تھے اس لیے ذرا سے اختلاف رائے کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے خواہ وہ اختلاف رائے کتنے ہی اہم اصول کے تحت ہو۔ اس سلسلے میں ایک قصہ یاد آتا ہے کہ جب سرسید نے مجلس امناسے علی گڑھ کالج کی معتمدی کے لیے اپنے بعد اپنے صاحبزادے جسٹس سیّد محمود کی جانشینی منظور کرالی تو محسن الملک نے اس سے اختلاف کیا اور سُنا ہے کہ انھوں نے سرسیّد کو اپنے اس اختلاف سے آگاہ کرتے ہوئے یہ لکھا کہ تاریخ اسلام میں یا تو امیر معاویہ نے اپنی جانشینی کے لیے یزید کی بیعت لی تھی یا اب وہی نظیر آپ نے قائم کی ہے۔ اس پر سرسیّد بہت بگڑے۔ آپ اپنے قدیم وفادار معاون کا اختلاف رائے برداشت نہ کرسکے۔ کچھ مدت کے بعد سرسیّد حیدرآباد دکن آئے تو محسن الملک نے کالج کے لیے چندہ فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی اور ایک روز اپنے ہاں سرسیّد کی باقاعدہ دعوت کا انتظام کیا۔ سرسیّد نے دعوت قبول کرکے کہا کہ دعوت میں تم جو کچھ رقم خرچ کروگے وہ رقم مجھے دے دو۔ میں کالج کے فنڈ میں جمع کرلوں گا۔ محسن الملک نے کہا وہ رقم بھی لے لیجیے اور دعوت میں بھی تشریف لائیے۔

محسن الملک نے حیدرآباد کے معززین اور اعلیٰ عہدے داروں کو بھی مدعو کیا تھا۔ کھانے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ حاضرین محفل میں سے کسی نے شرارتاً سرسیّد سے مخاطب ہوکر کہا۔ غالباً اب تو آپ محسن الملک کو معاف کرچکے ہیں۔ سرسیّد نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ وہ تو ان کی بڑی غلطی تھی۔ اس پر محسن الملک اپنی جگہ سے اُٹھے اور سرسیّد کا جوتا سامنے رکھ کر کہا۔ "سرکار! یہ آپ کا جوتا ہے اور یہ میرا سر حاضر ہے، مگر غلطی تو سرکار ہی کی تھی"۔ حاضرین محفل محسن الملک کی اس اصول پرستی پر دنگ رہ گئے۔

وفاداری کے مطالبے میں مولوی عبدالحق کا بھی یہی مزاج تھا۔ ان کا کوئی پرستار خواہ کتنا ہی قدیم اور جاں نثار ہو، اگر کسی اصول کی خاطر ان سے اختلاف رائے کرتا تو اس کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی سے مولوی صاحب کے چالیس پچاس سال سے

مراسم خلوص و محبت تھے۔ اس طویل مدت میں مولوی سیّد ہاشمی نے انجمن کی اور مولوی صاحب کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں لیکن یہاں کراچی میں مولوی صاحب سے اتنا شدید اختلاف ہوگیا کہ ہاشمی صاحب کراچی چھوڑ کر لاہور چلے گئے۔

مولوی عبدالحق دراصل انیسویں صدی کے آدمی تھے۔ یہ ان کی یا انجمن کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بیسویں صدی کے نصف اوّل سے بھی آگے گزر گئے۔ پہلی جنگ عظیم نے دنیا کے افکار اور اقدار میں جو عظیم انقلاب پیدا کیا تھا اس کا مولوی عبدالحق پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ مولوی صاحب اثر پذیری کے دور سے گزر چکے تھے۔ اس جدید دور میں شخصی وفاداری کوئی چیز نہیں رہی اس کے مقابلے میں اصول پرستی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

ایک خاص نقطہ نظر سے مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق اُردو ادب کے بڑے محسن ہیں۔ گزشتہ تین چار صدیوں سے مسلمانوں میں وہ علمی ذوق تقریباً مفقود ہوچکا تھا جس نے خلافت عباسیہ کے زمانے میں مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ پیدا کیا تھا۔ اور درجہ اوّل کے علما پیدا کیے تھے۔ مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز عربی علوم کے مطالعہ سے ہوا۔ اس دور میں یورپ کے مستشرقین نے عربی علوم پر بڑا تحقیقی کام کیا۔ بعد کے ادوار میں عربی کے بعد فارسی اور پھر اُردو پر بھی انھوں نے توجہ کی۔ یورپ کے ان تمام کارناموں کی ہندوستان کے اہل علم کو ہوا تک نہیں لگی تھی۔ مولانا شبلی نے غالباً پروفیسر آرنلڈ کی رہبری سے مسلمانوں کے شاندار علمی دور کے کارناموں سے اُردو ادب کو روشناس کیا۔ اگرچہ ان کا یہ کام اصل تحقیقی کام کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ لیکن اُردو کی سی بے بضاعت زبان کے لیے ان کارناموں کی اطلاع اور ان کا تعارف بھی بڑی قابلِ قدر چیز ہے۔

اُردو ادب پر یورپی مصنفوں نے جو کام کیا تھا اس سے مولوی عبدالحق نے اُردو داں طبقے کو آگاہ کیا۔ میں اس کو مولوی صاحب کا بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں ورنہ مولوی صاحب سے پہلے مشرقی تعلیم یافتہ لوگ جو محض اُردو، فارسی عربی جانتے تھے یا ایسے انگریزی تعلیم یافتہ جو کالجوں سے ڈگریاں لے کر نکلتے تھے، یورپ کے محققین خصوصاً انگریزوں۔ فرانسیسیوں کی تحقیقات کا کوئی علم و احساس ہی نہیں رکھتے تھے۔ لا ماشاء اللہ

غالباً اُردو کے متعلق یورپی محققین کے کارناموں سے واقفیت کی وجہ سے مولوی عبدالحق کو اُردو زبان اور ادب کی تاریخ کا احساس ہوا، اور دکن میں رہنے کی وجہ سے انھیں اس کا بہت اچھا موقع ملا کہ اُردو ادب کے قدیم مخطوطوں کا پتا چلائیں، انھیں حاصل کریں اور اہم مخطوطوں کو شائع کریں۔ اُردو ادب پر مولوی صاحب کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اُردو کے ابتدائی ادب سے اہل اُردو کو واقف کرایا اور اس سے دلچسپی پیدا کرادی۔

دوسرے مصنفوں کی کتابوں پر مولوی صاحب کے مقدمے اور عام مضامین جو "چند ہم عصر" میں جمع کیے گئے ہیں مولوی صاحب کا ادبی کارنامہ ہیں۔ مولوی صاحب کا اسلوب نگارش خاص ہے۔ مولوی صاحب کی اُردو ایک معیاری اردو ہے

مکتوبات

بنام مولوی وقار احمد صاحب ایم اے اڈیٹر نظام گزٹ،

مکرمی و عزیزی سلمہ،

میں نے آپ کو رشدی صاحب کو جمعرات کے روز شب کو بلایا تھا لیکن آج مہاراجہ بہادر نے کہلا بھیجا ہے کہ جمعرات شب کو ڈاکٹر انصاری اور ان کے ساتھی اور میں ان کے ہاں کھانا کھائیں۔ میں نے معذرت کر کے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا مگر میرا عذر مقبول نہ ہوا۔ لہٰذا اگر آپ اور رشدی صاحب جمعہ کے روز تشریف لائیں تو ممنون ہوں گا۔

جمعہ کی شب کو میں اورنگ آباد چلا جاؤں گا۔ سکندر آباد سے گاڑی ۹ ½ بجے جاتی ہے۔ آپ سات ہی بجے آجائیں۔ ذرا سویرے کھانا کھالیں گے اور ساڑھے آٹھ بجے تک باتیں کرنے کا بھی موقع مل جائے گا۔ ساڑھے آٹھ بجے میں اسٹیشن چلا جاؤں گا۔

رشدی صاحب کی خدمت میں سلام۔ جواب عنایت فرمائیے۔

نیازمند عبدالحق

(۲)

بنام مولوی وقار احمد صاحب

مکرمی زادلطفہٗ تسلیم

"مقاطعہ جوعی" تو خیر چند روز کے لیے میں قبول بھی کر سکتا ہوں لیکن "مقاطعہ ہم کلامی" تو ایسا تشدد ہے جس کا برداشت کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ رشدی صاحب انتہا پسند واقع ہوئے ہیں اور میں اسے پسند کرتا ہوں۔ میں آج کاچی گوڑے سے جاؤں گا۔ امید کہ آپ اور رشدی صاحب ضرور تشریف لائیں گے اور اگر آپ سکندر آباد تک چلیں تو زہے قسمت۔

نیازمند عبدالحق

۱؎ سید وقار احمد مرحوم میرے عزیز دوست، ہم جماعت، مولانا مختار احمد مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا مختار احمد مولوی عبدالحق کے قدیم ملاقاتیوں میں تھے۔ نظام گزٹ میری اور وقار احمد مرحوم کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔

وقار احمد مرحوم سے مولوی صاحب کی کہیں ملاقات ہوئی تھی اور مولوی صاحب نے ہم دونوں کو شام کے کھانے پر بلایا تھا مگر اس روز دعوت ملتوی کرنی پڑی تو مولوی صاحب نے یہ خط لکھا۔

"مہاراجہ بہادر سے مطلب مہاراجا سرکشن پرشاد سے ہے جو اس زمانے میں ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم ایک وفد کے ساتھ "جامعہ ملیہ" کے لیے ریاست سے امداد حاصل کرنے حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔

۲؎ ایک روز مولوی صاحب نے ہمیں کھانے پر بلایا تھا۔ اس وقت تک مولوی صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی کی اُردو پروفیسری قبول نہیں کی تھی۔ ہم لوگ مولوی صاحب کی تائید میں نظام گزٹ میں مضامین شائع کر رہے تھے۔ اس زمانے میں کانگریسی لیڈروں کے "مقاطعہ جوعی" (بھوک ہڑتال) کا بہت چرچا تھا۔ میں نے مزاحاً وقار احمد صاحب سے یہ جواب لکھوایا کہ رشدی یہ کہتا ہے کہ جب تک آپ پروفیسری کو قبول کر لینے کا مژدہ نہیں سنائیں گے۔ اس وقت تک میں "مقاطعہ جوعی" کرتا ہوں، یعنی آپ کے ہاں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مولوی صاحب نے اس کے جواب میں وقار احمد مرحوم کو یہ خط لکھا تھا۔

(۳)

(بنام محمد حبیب اللہ صاحب رشدی)

بنجارہ روڈ حیدرآباد دکن

۱۳ راگست ۱۹۳۰ء

مکرمی[1]۔ اُس روز ایک گھنٹے تک انتظار کیا۔ معلوم ہوا کرنل ٹرینچ کے ہاں ہیں، وہاں کوئی میٹنگ ہے اور کھانا بھی وہیں کھائیں گے، ناچار چلا گیا۔ آج دوپہر کو عین کھانے کے وقت گیا کہ اُس وقت آئیں گے۔ معلوم ہوا حضوری میں ہیں اور لنچ وہیں کھائیں گے۔ پھر شام کو گیا۔ معلوم ہوا مہاراجہ بہادر کے ہاں کمانڈر انچیف کی دعوت ہے' وہاں ہیں۔ اب فرمائیے۔

ان کی بڑی بیٹی کراچی سے آئی ہوئی ہے۔ ایک ہفتہ ہوا۔ کہتی تھی کہ اب تک بابا جان سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ان سے کسی معاملے پر گفتگو کرنا لاحاصل ہے۔ بہت مصروف ہیں۔ ایک تو بجٹ اور دوسرا راونڈ ٹیبل کانفرنس کا معاملہ۔ موقع ملا بھی تو دو چار منٹ، اس میں کوئی کیا کہے اور کیا سنے۔ یہ ہے اصل حقیقت۔ اب انگلستان سے واپسی ہی پر کچھ ہو تو ہو۔

خیر طلب عبدالحق

(۴)

تمدن عرب اور تمدن ہند کے مشہور فرانسیسی مصنف موسیو لی بان نے پہلی جنگ عظیم کے بعد، جنگ اور عالمی صورت حال کے متعلق ایک نہایت پرمغز کتاب "غیر متوازن دنیا" (THE WORLD UNBALANCED) لکھی تھی۔ اس میں ترکوں کے متعلق اور عالم اسلام کی بیداری کے متعلق بڑے عمدہ خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ پہلی جنگ کے بعد متحدین (امریکہ، انگلستان اور فرانس) نے جرمنی پر جو ظالمانہ دباؤ ڈالا تھا اس سے استدلال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا تھا کہ جرمنی چالیس سال تک تاوان جنگ ہرگز ادا نہیں کر سکتا۔ دوسری عالمی جنگ کا ہونا لازمی امر ہے۔ اس وقت تک ہٹلر عمل میدان میں نہیں اترا تھا۔ ہٹلر کا نام سیاسی لیڈر کی حیثیت سے، جرمنی کے باہر تو کیا خود جرمنی میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے ہونے کے متعلق لی بان کی پیشین گوئی کتنی سچ نکلی۔

میں نے مولوی صاحب سے اس کتاب کا ذکر کیا اور انجمن کی طرف سے اس کا ترجمہ شائع کرنے کی رائے دی۔ اس کے علاوہ مارک ٹوئین کے عالمی سفر نامے کے ترجمے کے متعلق بھی تجویز پیش کی تھی۔ مارک ٹوئین نے ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا تھا۔ ہندو معاشرے کے

---

[1] اس خط کے تخص معہود ذہنی سر اکبر حیدری وزیر فنانس ہیں۔ میں نے مولوی صاحب کے سامنے ایک بہت اچھی تجویز پیش کی تھی جو سر اکبر تک پہنچانی تھی۔ مولوی صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا تھا۔ وہ اسی روز سر اکبر سے ملنے جانے والے تھے اس لیے وعدہ لیا کہ آج ہی اس کے متعلق سر اکبر سے گفتگو کروں گا مگر اُس زمانے میں جیسا کہ اس خط سے واضح ہوتا ہے سر اکبر حیدری بہت مصروف تھے۔ راونڈ ٹیبل کانفرنس میں ریاست حیدرآباد کا وفد لے کر لندن جانے والے تھے اس لیے مولوی صاحب کو ان سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا۔

متعلق اس نے بڑے بصیرت افروز خیالات پیش کیے ہیں۔ مولوی صاحب نے اس کتاب سے بھی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ لی باں کی کتاب چند سال کے بعد مصر میں عربی میں ترجمہ کی گئی اور "اختلال التوازن العالمی" یا شاید اختلال العالم کے نام سے شائع ہوئی۔

دوسرے تیسرے دن، یہ دو کتابیں اور اپنی مرتب کردہ ایک چھوٹی سی قواعد اُردو جو محکمہ تعلیم کی مڈل کی جماعتوں کے لیے لکھی تھی۔ یہ تینوں کتابیں لے کر میں مولوی صاحب کے ہاں گیا۔ مولوی صاحب موجود نہیں تھے اس لیے میں نے ایک پرچی لکھ کر کتابیں مولوی صاحب کے ملازم کو دے دیں۔ چند روز کے بعد مولوی صاحب سے راستے میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے ان انگریزی کتابوں کا ترجمہ شائع کرنے سے معذوری کا اظہار فرمایا اور پھر یہ تینوں کتابیں اپنے ایک مکتوب کے ساتھ واپس کردیں۔ میں نے جو پرچی لکھی تھی وہ میری کتاب ہی میں رہ گئی تھی۔ میری پرچی کا مضمون یہ ہے :۔

محترمی!

آپ کے ملاحظے کے لیے چند کتابیں لایا تھا۔ اس میں ایک ابتدائی قواعد اُردو میری مرتب کی ہوئی ہے۔ اس کا ذکر میں آپ سے کرچکا ہوں۔ ٹیکسٹ بک کمیٹی کی رائے کا مراسلہ اس کے ساتھ موجود ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کتاب کو مڈل کے نصاب میں شریک کیا جائے تاکہ مجھے کچھ مالی فائدہ ہو۔ اب میں پھر اس کو بعد ترمیم ٹیکسٹ بک کمیٹی میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے متعلق آپ کے مشورے کی ضرورت ہے کہ ترمیم کہاں کہاں کی جائے۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت معروف ہیں لیکن پھر بھی اس مصروفیت سے کچھ وقت کا چندا مجھے بھی دیجیے۔ کتاب دیکھ لینے کے بعد آپ کوئی وقت مقرر فرماکر مجھے خط سے مطلع کردیں، تو پھر حاضر خدمت ہوں گا۔

لی باں کی کتاب جس کا میں ترجمہ کرنا چاہتا ہوں وہ بھی موجود ہے اور مارک ٹوئین کی بھی ایک کتاب جس کا میں نے ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ہے۔

کتابوں کو دیکھنے کے بعد جو خط لکھیں تو دفتر نظام گزٹ کے پتے پر لکھیے۔

محمد حبیب اللہ رشدی

اس کے جواب میں مولوی صاحب کا یہ مکتوب ملا :۔

بنجارہ روڈ

مکرمی تسلیم

آپ کی کتابیں واپس کررہا ہوں۔ دونوں انگریزی کتابوں کے متعلق زبانی عرض کرچکا ہوں۔ اب رہی آپ کی "قواعد اردو" اس کا قصہ سن لیجیے :۔

آپ جب کتابیں دے گئے تھے اس کے تیسرے چوتھے روز سررشتہ تعلیمات سے اطلاع آئی کہ مڈل کی جماعتوں کے لیے قواعد کی ضرورت ہے وہ لکھ دیجیے۔ میں نے انجمن کی طرف سے اسے منظور کرلیا۔ یہ اطلاع وہ غالباً عام طور پر شائع کرنے والے ہیں

کہ بہت سے لکھنے والے مل جائیں - اور جو کتاب اچھی ہو انتخاب کرلی جائے - میں نے اُس وقت تک آپ کی کتاب نہیں دیکھی تھی اس کے بعد میں نے اس کا دیکھنا دیانت کے خلاف سمجھا وہ اسی طرح لبطور امانت رکھی رہی - اگر قواعد اُردو میں اپنے لیے لکھتا تو آپ کی کتاب بعد فوراً ارادہ ترک کردیتا - لیکن میں نے کوئی کتاب اپنے ذاتی نفع کے لیے اب تک نہیں لکھی ، البتہ انجمن کا مزدور ہوں اور اسے میں اپنی ذات ، نیز دوسروں پر ترجیح دیتا ہوں - یہ کہانی میں سڑک پر آپ سے زبانی عرض نہ کرسکا - کل آپ کا انتظار کیا آپ تشریف نہ لائے - اس لیے اس عریضے کے ذریعے سے اطلاع دیتا ہوں -

نیازمند عبدالحق

محمود قریشی دھلوی

زباں کو بخش دی ہے زندگی

زباں کو بخش دی ہے زندگی بابائے اردو نے
ادب میں روح تازہ پھونک دی بابائے اردو نے

نظر آئیں جہاں بھی ظلمتیں اردو کی راہوں میں
عطا کی اپنے دل کی روشنی بابائے اردو نے

زباں کی ارتقائی منزلوں سے یہ صدا آئی
زباں کو سربلندی بخش دی بابائے اردو نے

کسی محفل میں اب اردو زباں دب کر نہیں رہتی
ہمہ گیری کی عظمت بخش دی بابائے اردو نے

بچایا ہی نہیں صرف اس کو مقراضِ مخالف سے
زباں کی ہر قبائے چاک سی بابائے اردو نے

خلوصِ خدمتِ اردو زباں توبہ ارے توبہ
تصدق کردی اپنی جان بھی بابائے اردو نے